عرشؔ صہبائی کی شاعری: روایت اور انحراف

مقالہ برائے پی ایچ ڈی

مقالہ نگار

راکیش کمار

نگراں

پروفیسر مظہر مہدی حسین

ج. ने. वि.
JNU

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-۱۱۰۰۶۷

۲۰۲۲ء

Dated: 10 /02 /2022

Declaration

I hereby declare that the Ph.D. thesis entitled **"Arsh Sehbai Ki Shayeri : Riwayat aur Inheraf" [The Poetry of Arsh Sehbai : Tradition and Deviation]** submitted by me is the original research work. It has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/ Institution to the best of my knowledge.

I further declare that no plagiarism has been committed in my work. If anything is found plagiarised in my Thesis, I will be solely responsible for the act.

RAKESH KUMAR
Research Scholar

जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
भारतीय भाषा केन्द्र
Centre of Indian Languages
भाषा, साहित्य एवं संस्कृति अध्ययन संस्थान
School of Language, Literature & Culture Studies
नई दिल्ली–110067, भारत NEW DELHI-110067, INDIA

Dated: 10 /02 /2022

Certificate

This is to certify that the Mr. RAKESH KUMAR, a bona-fide Research Scholar of Centre of Indian Languages, SLL&CS has fulfilled all the requirements as per the University Ordinance for the submission of Ph.D. thesis entitled **"Arsh Sehbai Ki Shayeri : Riwayat aur Inheraf" [The Poetry of Arsh Sehbai : Tradition and Deviation]**

This may be placed before the examiners for evaluation for the award of the degree of Ph.D.

Prof. Mazhar Mehdi Hussain
(Supervisor)
CIL/SLL&CS/JNU
Dr. MAZHAR MEHDI HUSSAIN
Professor
Centre for Indian Languages
SLL&CS
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110067

Prof. Omprakash Singh
(Chairperson)
CIL/SLL&CS/JNU
अध्यक्ष / Chairperson
भारतीय भाषा केन्द्र / CIL
भा. सा. एवं सं. अ. सं. / SLL & CS
ज. ने. वि. / J.N.U
नई दिल्ली / New Delhi-110067

GRAM: JAYENU, Tel.: (91-011) 26741557, 26742676 Extn.: 4217, (D) 26704217; Telefax: (91-011) 26704217;
Email: chair_cil@mail.jnu.ac.in, jnucil@gmail.com

فہرست

پیش لفظ	5
باب اول:	
سوانحی کوائف، ادبی خدمات اور معاصرین	11
باب دوم:	
عرشؔ صہبائی کی نظم نگاری میں روایت پسندی	67
باب سوم:	
عرشؔ صہبائی کی نظم نگاری میں انحراف کی نوعیت	145
باب چہارم:	
عرشؔ صہبائی کی غزل گوئی میں روایت پسندی	219
باب پنجم:	
عرشؔ صہبائی کی غزل گوئی میں انحراف کی نوعیت	289
حاصل مطالعہ	357
کتابیات	363

پیش لفظ

ہندوستان کی تحریک آزادی کے بعد ملک بھر میں جن شاعروں نے اپنی شاعری سے ہر خاص وعام کو فیضیاب کیا ان میں ایک معتبر نام عرشؔ صہبائی (2020-1930ء) کا بھی ہے۔عرشؔ صہبائی کا تعلق ریاست جموں وکشمیر سے ہے۔آپ کا اصلی نام ہنس راج ابرول ہے، قلمی نام عرشؔ صہبائی اور عرشؔ تخلص کرتے ہیں۔آپ کی ولادت 4 دسمبر 1930ء کو تحصیل اکھنور کے چھمب سیکٹر کے قصبہ سیری پلائی بٹل باختن میں ہوئی تھی۔عرشؔ اپنے خاندان کے پہلے شاعر ہیں۔ان سے سے پہلے ان کی خاندانی پشتوں میں کوئی شخص بھی شاعر نہیں گزرا ہے۔اس لئے انہوں نے اردو کی خدمت میں جو کچھ بھی قابلیت بہم پہنچائی ہے وہ ان کی شخصی کوشش اور انتساب کا نتیجہ ہے۔عرشؔ صہبائی نے جس زمانے میں لکھنا شروع کیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو کے شعری افق پر ایسے ایسے ستارے ضیافگن تھے جن کی روشنی آسمان ادب میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔اس کہکشاں میں شکیلؔ بدایونی، مجازؔ لکھنوی، طالبؔ ایمن آبادی، حفیظؔ جالندھری، علامہ انورؔ صابری، آبدؔ پشاوری، پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ، ڈاکٹر منوہر سہائے انورؔ، ڈاکٹر جاویدؔ وشششٹ اور ابوالفصاحت جوشؔ ملسیانی جیسے لوگ شامل تھے۔

عرشؔ صہبائی نے انیسویں صدی کی پانچویں دہائی سے لے کر بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک اپنی ساری زندگی اردو ادب خصوصاً اردو شاعری کی خدمت میں صرف کی ہے۔آج ان کا شمار دنیائے اردو ادب میں ایک صاحب کمال غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب خصوصاً اردو شاعری کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ان کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔عرشؔ صہبائی نے کل 22/ادبی وشعری خدمات یادگار چھوڑی ہیں جن میں 18/مجموعے غزلیات، 1/مجموعہ دوہے اور 1/نظموں وقطعات پر مشتمل ہے۔عرشؔ نے دو تذکرے بھی تخلیق کئے ہیں۔علاوہ ازیں ان کے ادبی سرمائے میں ایک تنقیدی تخلیق بھی شامل ہے جو ان کی تنقیدی وتحقیقی صلاحیت کی جواز ہے۔عرشؔ کو ان کی شعری صلاحیتوں کے اعتراف میں ''نورنگ ادبی ادارہ'' (لدھیانہ) نے ''آبروئے سخن'' کے خطاب سے سرفراز کیا ہے۔انہیں ''علامہ آرزو لکھنوی'' اور ''شہنشاہ تغزل'' جیسے خطابات سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

عرشؔ صہبائی کے بارے میں بے شمار مضامین ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔عرشؔ صہبائی کی تمام ادبی خدمات پر کچھ اداروں سے تحقیقی کام انجام دیئے گئے ہیں لیکن ان میں صرف ان کی شخصیت اور کچھ ایک ادبی خدمات کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے البتہ کوئی جامع تحقیقی کام ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ان کی شخصیت اور شاعری پر تبصرے کی صورت میں چند کتابیں موجود میں جوان کے عزیز شاگردوں کی طرف سے تخلیق کی گئی ہیں۔جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے عرشؔ صہبائی کے کئی شعری مجموعوں کا مطالعہ محض ذوق شاعری کے طور پر تو اپنے بی۔اے اور ایم۔اے کے دوران سے ہی کر لیا تھا۔چونکہ میرا مطالعہ ذوق کی حد تک ہی تھا اس لئے ان کی شاعری شعریت اور اسلوب کے اعتبار سے مجھے دیگر شعرا سے زیادہ پسند تھی۔یہ میرا ذاتی ماننا ہے کہ ذوق شعر،تفہیم شعر ہی کا دوسرا نام ہے کہ اس کے بغیر نہ کسی شعری فن سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تعبیر کا گوہر حقیقی ہاتھ لگتا ہے۔اردو ادب کے ایک عام طالب علم کی حیثیت سے شعر و سخن کو میرے مطالعات میں خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔مجھے یہ دعویٰ تو نہیں کہ مجھے کوئی اعلیٰ درجے کی تفہیم حاصل ہوئی ہے لیکن یہ بات میرے لئے باعث فخر ضرور ہے کہ ایسے اساتذہ سے شرف تلمذ ہوا جن کے خطبات و مقالات شعری ادب کی تنقید میں ایک معتبر حوالہ ہیں۔ان اساتذہ میں میرے شفیق و مخلص استاد اور گائیڈ پروفیسر مظہر مہدی صاحب کا نام خصوصیت کا حامل ہے کہ میرے ذوق سخن فہمی اور اور تنقیدی شعور کی تربیت میں ان کی رہنمائی ہمیشہ میرے کارفرما رہی۔ان کے زیر سایہ ایم فل کا مقالہ مکمل کرنے کے بعد جب پی ایچ ڈی کا موضوع منتخب کرنے کا وقت آیا تو میری نظر عرشؔ صہبائی کی تخلیقات پر پڑی کہ کیوں نہ اس پر ایک جامع تحقیقی کام کیا جائے۔اس بارے میں جب میں اپنے استاد محترم سے بات کی تو ان کی رہنمائی سے مقالے کا موضوع ''عرشؔ صہبائی کی شاعری:روایت اور انحراف'' منتخب ہوا اور انہیں کی مشورے سے میں نے اس موضوع کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

باب م اول ''سوانحی کوائف،ادبی خدمات اور معاصرین'' پر مشتمل ہے جس میں،میں نے عرشؔ صہبائی کے سوانحی کوائف کو ذیلی عنوانات وطن،والدین،پیدائش،مقام پیدائش،بچپن،تعلیم و تربیت،شادی،اولادیں، ملازمت،سفر آخرت،شخصیت،شکل وصورت،لباس و پوشاک،لب ولہجہ،عادات و اطوار،اخلاق،علم وفن، مذہب،شاعری اور ادبی ماحول و معاصرین میں تقسیم کر کے کے ان کے حالات زندگی،خاندانی پس منظر اور علمی اور عملی مصروفیات کا جائزہ لیا ہے۔اس باب میں ان کی زندگی کے ہر ممکن گوشے کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔اس

باب میں اس بات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ عرشؔ اپنے دور کے ادبی وسیاسی ماحول سے کس طرح متاثر ہوئے ہیں اور یہ تاثرات کس طرح ان کے شعری ذہن کی توسیع اور تشکیل میں حصہ لے چکے ہیں۔ان کا شعری سفر بہت طویل زمانے پر محیط ہے اس لئے ان کے معاصرین کی بھی ایک طویل فہرست بن جاتی ہے جس کا مکمل جائزہ یہاں پر پیش کر پانا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔اس لئے میں اس باب میں، میں نے ان کے صرف انہیں معاصرین کو شامل کیا ہے جو ان کے اپنے ادبی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔

باب دوم ''عرشؔ صہبائی کی نظم نگاری میں روایت پسندی'' پر منحصر ہے جس میں عرشؔ صہبائی کی تخلیق کردہ نظموں، دوہوں اور قطعات میں روایتی موضوعات، ہیت، اسلوب و انداز کو زیر بحث لایا گیا ہے۔عرشؔ صہبائی نے اگر چہ روایتی موضوعات کو تبدیلی جذبات کے ساتھ اپنی یہاں استعمال میں لایا ہے لیکن اس کے باوجود وہ موضوعات شعری روایت کا حصہ ہیں۔ان کی اکثر و بیشتر نظمیں پہلے سے چلی آرہی روایتی ہیئت میں ہیں۔اس باب میں عرشؔ صہبائی کی روایتی موضوعات پر کہی ہوئی ان تمام نظموں کا تذکرہ کیا ہے جن موضوعات پر ان سے پہلے کئی شعرا کے یہاں نظمیں کہی جا چکی ہیں۔اسی باب میں مزید عرشؔ کے روایتی موضوعات پر کہے گئے دوہوں اور قطعات پر بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔علاوہ ازیں اردو کے کئی شعراء کے روایتی دوہوں، قطعات اور نظموں کے اشعار باحوالہ پیش کر کے ان کی نظم نگاری میں روایت پسندی کے حوالے سے تقابلی بحث کی گئی ہے۔

باب سوم ''عرشؔ صہبائی کی نظم نگاری میں انحراف کی نوعیت'' ہے۔اس باب میں عرشؔ صہبائی کی نظموں، دوہوں اور قطعات میں انفرادیت کو واضع کیا گیا ہے۔ان کی انفرادیت کو واضع کرتے ہوئے ان کے استعمال کردہ نئے موضوعات پر کہی گئی نظموں، دوہوں اور قطعات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ روایتی اور مروجہ موضوعات مثلاً عشق، رومانیت، جنس، احساسات، سماجی تصادم، اخلاقیات، حب الوطنی، تحریک آزادی اور عالمی سیاست وغیرہ کے برتاؤ میں ان کا انفرادی رویہ کہاں تک کام کرتا ہے اور انہوں نے زبان، ترکیب سازی، ہیئت اور اسلوب کے برتاؤ کس حد تک انفردی رویہ برقرار رکھا ہے۔معریٰ اور آزاد نظم کی ہیئتوں کو انہوں نے مستقل طور پر اپنے داخلی کرب وانتشار کے اظہار کا ذریعہ بنایا بلکہ انہیں متنوع آہنگ، فن اور تکنیک کے ایسے اچھوتے تجربے سے آشنا کیا جس کی مثال ان کے معاصرین میں دیکھنے کو ملتی ہے۔غرض اس باب میں ان کی انفرادی نگارشات کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم ''عرشؔ صہبائی کی غزل گوئی میں روایت پسندی'' ہے جس میں عرشؔ صہبائی کی کلاسیکی شعراء

سے ذہنی مناسبت کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی غزل گوئی کی روایت سے وابستگی اور اس کے اثرات کی کارفرمائی پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔عرشؔ کی غزل گوئی میں روایتی موضوعات، اعلامات اور رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی غزلیہ شاعری میں روایتی پسندی کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔عرشؔ نے اپنی غزل گوئی میں حسن، عشق، محبت، احساس وفا، مکر، فریب، وصل، ہجر، خمریات، سیاست، اخلاق، اخلاص، انسانیت، وطنیت اور دیگر مانوس روایتی موضوعات کو کس انداز سے برتا ہے ساتھ ہی ساتھ ان کے سر کردہ معاصرین اور روایتی غزل گو شعراء کے اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی غزل گوئی روایتی پسندی پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب پنجم ''عرشؔ صہبائی کی غزل گوئی میں انحراف کی نوعیت'' ہے جس میں ان کی غزلوں گوئی میں انفرادیت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔اردو شعری روایت سے ہٹ کر عرشؔ نے اپنی غزل میں جن نئے گوشوں کو شامل کیا ہے اس پر بھی خصوصی روشنی ڈالی گئی ہے۔حیات اور کردار حیات عرشؔ کی غزل گوئی کا ایک ایسا انوکھا موضوع ہے جو ان غزل گوئی میں روایت اور انفرادیت دونوں کا جواز ہے۔اردو میں ان سے پہلے شاید ہی کوئی ایسا شاعر گزرا ہو گا جس سے ان سے پہلے تصور زندگی کو اپنی شاعری میں اتنا زیادہ بیان کیا ہو۔عرشؔ صہبائی کی شاعری خصوصاً ان کی غزل، نئے تصورات کے ساتھ، نئے اسالیب اور بعض وقت نئی علامتوں کی ضرورت کا احساس بھی ظاہر کرتی ہے۔انہوں نے اردو غزل کو نئے رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔انہوں نے اردو غزل کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کر کے اردو شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔اس باب میں عرشؔ کے تخلیقی عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی غزل میں پائے جانے والے نئے شعری امکانات و رجحانات کا بھرپور مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔عرشؔ کی شاعری میں جدت پسندی پر مبنی مختلف نوعیت کا اشعار کا تفصیلی تجزیہ پیش بھی کیا گیا ہے۔اور یہ دیکھنے اور جانچنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی غزل کہاں تک جدید تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور اس میں موجود وہ کون سے عناصر ہیں جنہوں نے عرشؔ کی شاعری کو بقائے دوام بخشا ہے۔

ان پانچوں ابواب کے بعد مقالے کا حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔جس میں پورے مقالے کے مختصر خلاصے کے ساتھ ساتھ اس مقالے کے تعلق سے ضروری نتائج و حقایق کو بروئے کار لانے کی کوشش کی گئی ہے۔علاوہ ازیں مقالے کے آخر میں اُن کتب و رسائل کی فہرست درج ہے جن سے میں نے دوران تحقیق استفادہ کیا ہے۔

الحمد اللہ میرا تحقیقی مقالہ بغیر کسی اُلجھن و وقت کے صحت مند ذہن اور خوشگوار حالات کے ساتھ پایۂ تکمیل

کو پہنچا۔ میں اپنے شفیق نگراں استادِ محترم جناب پروفیسر مظہر مہدی حسین صاحب کا نہایت مشکور وممنون ہوں کہ انہوں نے بارہا میری حوصلہ افزائی کی اور وقتاً فوقتاً اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔ میں اپنے شعبے کے دیگر تمام اساتذہ اکرام کا بھی مشکور وممنون ہوں کہ ان کی حوصلہ افزائی بھی مجھے میری اہلیت کا احساس کراتی رہی اور میں اس کام کو انجام تک لے جانے میں کامیاب ہوا۔ میں نے جب اس موضوع کا انتخاب کیا تو عرشؔ صہبائی حیات تھے۔اس مقالے کی تیاری کے معاملے میں انہوں نے جو استحقاق اور اعتماد دیا وہ میرے لئے باعث فخر ہے کہ جب اور جس وقت میں نے چاہا انہوں نے مجھے وقت دیا اور مجھے نہ صرف بنیادی کتابیں فراہم کیں بلکہ جو ضروری مواد درکار رہا اسے فراہم کرنے میں میری ہمیشہ رہنمائی کی۔اس خصوصی شفقت کے لئے میں ان کا بہت شکر گزر ہوں اور خدائے رحمان کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ ان روح کو ابدی سکون عطا کرے۔عرشؔ صہبائی کے قریبی عزیزوں اور خاندان کے افراد کا تعاون بھی اس سلسلے میں بے حد لائق تحسین رہا جس لے لئے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

تحقیقی کام کے حوالے سے جواہر لال نہرو یونیورسٹی لائبریری، کلچرل اکیڈمی جموں وکشمیر، آزاد بک ویژن جموں اور لائبریری شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کا شکر گزار ہوں جہاں سے بنیادی وثانوی مواد حاصل کرنے میں مجھے بہت امداد حاصل ہوئی۔اس کے علاوہ جن اساتذہ نے مواد فراہم کرنے میں میری امداد کی ان میں صدر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی پروفیسر ریاض احمد صاحب، پروفیسر شہاب عنایت ملک صاحب، پروفیسر فرحت شمیم صاحبہ، پروفیسر اسداللہ وانی صاحب، پروفیسر چمن لال بھگت صاحب، پروفیسر رشید منہاس صاحب اور پروفیسر قدوس جاوید صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے کئی کتابیں اس کام کے لئے مجھے مفت عطا کیں۔ جناب خورشید کاظمی ،ڈاکٹر غلام جیلانی، ٹی آر رینا، ڈاکٹر کوشل کرن ٹھاکر، ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ اور پرتپال سنگھ بےتابؔ صاحب نے بھی مووادکی فراہمی میں میری مدد فرمائی ان کا بھی شکر گزار ہوں۔۔اس کے علاوہ اپنے دوستوں وعزیزوں میں محمد شاہ نواز قمر، زلفی حسیب، خدیجہ بانو، ڈاکٹر محمد رفیع، محمد عمر، رنجیت روشن، شوشیل کمار، ڈاکٹر امتیاز احمد، سونیل کمار، فولیل سنگھ، لیاقت علی، محمد مختار احمد، مشتاق صدیقی اور رمیش بھٹ کا شکر گزار ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً میری مدد فرمائی۔

میں اپنے والد محترم جناب سورج چند اور والدہ محترمہ سریتا دیوی کا بے حد مشکور ہوں جن کی دُعاوں کی بدولت میں اس کام کی اہلیت کو پہنچا ہوں۔اس کے علاوہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جو قدم

قدم پر میرے حوصلے کو بڑھاتے رہے ہیں۔ آخر میں اپنی اہلیہ محترمہ مینولوچن کا شکرادا کرنا واجب سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مقالہ لکھنے کے دوران مجھے ہر طرح کی سہولت فراہم کی۔ تمام اہل خانہ عزیز واقربا کی نیک تمناؤں اور دعاؤں اور سب سے اہم یہ اللہ رب العزت کے کرم سے میں اس مقالے کو مکمل کر پایا۔

راکیش کمار

جواہر لال نہرو یونیورسٹی

باب اول

تعارف: سوانحی کوائف، ادبی ماحول، معاصرین

وطن:

عرشؔ صہبائی کے آبا واجداد ریاست جموں وکشمیر کے قدیم باشندے تھے۔ان کا تعلق 'جب' نام کے ایک گاؤں سے تھا۔ یہ گاؤں جموں سے ادھمپور جاتے ہوئے رستے میں گاؤں 'گھڑی' سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔آپ کے خاندان کا شمار نہایت شریف اور زمیندار گھرانوں میں ہوتا تھا۔آپ کے پردادا کا نام ''جب'' گاؤں کی جانی مانی ہستیوں میں ہوتا تھا۔گاؤں کے لوگ اپنی روزمرہ کی مشکلوں، پریشانیوں اور فسادات کا ازالہ کروانے کے لیے آپ کو حق شناس جان کر آپ کے پاس آتے تھے۔عرشؔ صہبائی کے پردادا کی شان وشوکت کو ان کے دادا شری نراین داس ابرول نے بھی برقرار رکھا۔آپ کے دادا شری ناراین داس ابرول شریف النفس اور محنتی انسان تھے۔شری نارائن داس جب کہ تین بیٹے تھے۔سب سے بڑے بیٹے کا نام پربھ دیال ابرول تھا۔اس سے چھوٹے کا نام مادھورام ابرول اور سب سے چھوٹے کا نام موہن لال ابرول تھا۔عرشؔ صہبائی کے تاؤ پربھ دیال ابرول مالی طور پر آسودہ حال تھے۔ان کا ایک بیٹا تیج رام ابرول ہائی کورٹ جموں میں ملازم تھا۔عرشؔ صہبائی کے چچا موہن لال ابرول کمپاؤنڈر تھے۔ابھی غیر شادی شدہ ہی تھے کہ وہ اس دنیا سے چل بسے۔

والدین:

عرشؔ صہبائی کے والد ماجد جناب مادھورام ابرول بھی جب تک گاؤں 'جب' میں قیام پذیر رہے انھوں نے بھی اپنے باپ دادا کے طور طریقوں کو سرآنکھوں پر لیا۔ بعد ازاں وہ جموں منتقل ہوگئے اور کچی چھاؤنی میں ایک مکان خرید لیا، یہیں پر انھوں نے فوج میں بطور حولدار اسکول ماسٹر ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھیں چودہ روپئے ماہانہ پینشن ملتی تھی۔عرشؔ کے والد صاحب نہایت شریف، ایماندار، نیک دل، ملنسار اور محنتی انسان تھے۔ان کی تین اولادیں تھیں۔سب سے بڑی ایک لڑکی تھی جو ابھی دو برس کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ دنیائے فانی سے کوچ کر گئی۔اس کے بعد ایک لڑکا جس کا نام ودھیا پرکاش ابرول

رکھا گیا، پیدا ہوا۔اوراس کے پانچ سال بعد ایک اورلڑکا تولد ہوا جس کا نام ہنس راج ابرول رکھا گیا جو آج اردو دنیا میں عرشؔ صہبائی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔عرشؔ صہبائی کے بڑے ودھیا پرکاش ابرول سرکاری ملازم تھے،تقریباً پچاس برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔عرشؔ صہبائی اپنے برادر اکبر کے انتقال کے بعد 1974ء میں کچی چھاؤنی ریشم گھر کالونی جموں منتقل ہو گئے اور آج بھی وہی سکونت اختیار کیے ہوئے ہیں۔اب ان کے جدی رہائشی مکان کچی چھاؤنی میں ان کے بھائی صاحب کا کنبہ رہائش پذیر ہے۔

یوم ولادت:

عالمِ دنیا میں عروج انسانی کی اہم ترین صدی، بیسویں صدی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے جہاں ساری دنیا میں علمی ،تہذیبی، سائنسی ،صنعتی اور سیاسی اعتبار سے ایک سے بڑھ کر ایک ہستیاں پیدا کی ہیں وہیں اردو زبان و ادب کے گہواروں میں بھی گزشتہ تمام ادوار سے زیادہ لا فانی ،شاعروں، ادیبوں، ناقدوں اور دانشوروں کے چلے آرہے قبیلے میں ایک ایسی شخصیت کو بھی جنم دیا جو آج کی ترقی یافتہ دنیا مین اردو ادب کے حال اور غالباً مستقبل کا بھی ایسا فردِ فرید ہے جو لاکھوں کی بیڑ میں دور سے پہچانا جا سکتا ہے اور دنیا انہیں عرشؔ صہبائی کے نام سے جانتی ہے۔

عرشؔ صہبائی کا یوم ولادت ان کی جنم کنڈلی کے مطابق 4/دسمبر 1930ء ہے لیکن دستاویزاتی غلطی کی وجہ سے 3/دسمبر درج ہو گئی۔ جناب عرشؔ صہبائی کے مطابق ان کے دستاویزات پر درج 3/دسمبر 1930ء کو ہی حرف آخر سمجھنا چاہیے۔آپ کا اصلی نام ہنس راج ابرول ہے۔قلمی نام عرشؔ صہبائی اور عرشؔ تخلص کرتے ہیں۔ آپ کے والد صاحب کا جناب مادھورام ابرول کی شادی اکھنور کے ایک آسودہ حال گھرانے میں پاروتی جان کی بیٹی رام رکھی سے ہوئی۔ان ہی کے بطن سے عرشؔ صہبائی کا جنم ہوا۔اسے ان کی بدنصیبی کہیے یا قدرت کی ستم ظریفی کہ موصوف ابھی صرف بائیس دن کے ہی تھے کہ اپنی والدہ محترمہ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔انھیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہو سکا کہ والدہ کی محبت کیا چیز ہوتی ہے۔غزل کے اک شعر میں وہ یوں لکھتے ہیں۔

نہیں ہے اس کا کرم پھر بھی جی رہے ہیں ہم
بغیر چھت کے کیا لوگوں کے گھر نہیں ہوتے (۱)

اس کے بعد آپ کی پرورش کی ذمہ داری آپ کی نانی پاروتی جان نے سنبھالی جو کہ نہایت ہی نیک دل خاتون تھیں۔انھیں عرشؔ صہبائی سے بہت پیار تھا۔انھوں نے ہی ان کا نام ہنس راج ابرول رکھا ہے۔عرشؔ

صہبائی کہتے ہیں کہ گاؤں میں یہ پہلا نام تھا جو ڈھنگ کا رکھا گیا تھا۔ ورنہ وہی الٹے سیدھے نام جو آج سے کئی برس پہلے رکھے جاتے تھے۔

جائے ولادت:

تحصیل اکھنور سیری پلائی بٹل ''باختن''! یہ وہ گاؤں ہے جہاں عرش صہبائی کے ننھیال رہتے تھے اور یہیں آج سے تقریباً 91 / برس پہلے عرشؔ صہبائی کی ولادت ہوئی تھی۔ ''باختن'' سیری پلائی بٹل کا ایک چھوٹا سا محلّہ ہے جو چند مکانوں پر مشتمل ہے۔ یہ گاؤں چھمب سیکٹر کے شمال میں واقع ہے۔ 1971ء کی جنگ کے بعد چھمب سیکٹر پر پاکستان کا ناجائز قبضہ ہے جو آج بھی قائم ہے۔ چھمب کے شمال کی جانب توی بہتی ہے جو چھمب تک پہنچتے پہنچتے اپنا نام تبدیل کر کے ''مناوری'' توی کہلاتی ہے۔ اس توی کو کئی بار عبور کرنے کے بعد ایک پہاڑ کو سر کرنا پڑتا ہے۔ لگ بھگ آٹھ گھنٹے کا پیدل سفر طے کرنے کے بعد ہم سیری پلائی باختن پہنچ جاتے ہیں۔

باختن ہے میری جنم بھومی
اس کی مٹی بھی مجھ کو سونا ہے(۲)

یہ تمام علاقہ پتھریلا ہے۔ کہیں کہیں کوئی درخت دکھائی دیتا ہے۔ یہاں دور دور تک کچے مکانوں پر مشتمل چھوٹی چھوٹی کچھ بستیاں ہیں۔ عام طور پر لوگوں کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے۔ چھوٹے چھوٹے طبقے غربت کی وجہ سے بڑے بڑے گھروں میں کام کر کے اپنے بچوں کو روزی روٹی فراہم کرتے ہیں۔ دور دور تک غربت و افلاس کا جال بچھا ہوا ہے۔ بہت کم ایسے گھرانے ہیں جو خوشحال ہیں۔ ایسے گھرانوں میں عرش صہبائی کے ننھیال بھی شامل تھے۔

عرشؔ صہبائی کے ننھیال صرف ان کی نانی صاحبہ پاروتی جان کی وجہ سے قائم تھے۔ اب ان کے انتقال کے بعد وہاں مکان کی گری ہوئی دیواروں کے علاوہ محض پتھروں کا ڈھیر ہی باقی ہے۔ لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی عرش صہبائی باختن کی سرزمین پر فخر کرتے ہیں۔ ایک غزل کے شعر میں یوں لکھتے ہیں۔

باختن ہے پتھروں کی سرزمیں
پھر بھی مجھ کو اس پہ کتنا ناز ہے(۳)

یہ وادی دو بار فسادات کا شکار ہوئی، پہلے 1947ء میں ہندو پاک فسادات اور پھر 1965ء کی جنگ میں بھی اس کی تباہی و بربادی ہوئی۔ دو بار یہاں کے مقامی باشندوں کو جموں کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔

باختن کی اکثر زمین بنجر ہے یہ انھیں فسادات کا نتیجہ ہے۔

یہ باختن ہے جہاں عرشؔ کا جنم ہوا
زمین کا ٹکڑا جو بنجر دکھائی دیتا ہے(۴)

عرشؔ کے دل میں اپنی جائے پیدائش کی محبت آخری وقت تک رہی ہے۔۔ وہاں کے سادہ مزاج لوگوں کی محبت، وہاں کی مٹی کی خوشبو انھیں آج بھی معطر کرتی ہے۔انھیں اس بےنظیر وادی کے اجڑنے کا بے حد افسوس ہے۔عرش گاؤں کے لوگوں کا حال ایک دوہے میں یوں سمیٹتے ہیں۔

ان پر جو بھی ظلم ہو یہ سمجھیں سنجوگ
کہیں ملیں گے گاؤں کے یہ سیدھے سادے لوگ(۵)

بچپن:

عرشؔ صہبائی نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال اپنے نانیہال ''باختن'' میں ہی گزارے چونکہ وہ ابھی بہت کم سن تھے کہ ان کی والدہ محترمہ انتقال کر گئیں تھیں۔لہٰذا گھر میں کوئی عورت نہ ہونے کے سبب ان کی پرورش کی ذمہ داری ان کی نانی صاحبہ پاروتی جان کے سر آ گئی۔عرشؔ کے والد مادھو رام ابرول نے جموں آ کر فوج میں بطور حوالدار اسکول ماسٹر کی ملازمت اختیار کر لی۔عرشؔ کے بڑے بھائی جناب ودھیا پرکاش ابرول بھی اپنے والد صاحب کے ساتھ جموں آ کر وہیں زیر تعلیم ہو گئے۔باختن میں عرشؔ نے اپنے بچپن کے سات سال گزارے ہیں چونکہ اس زمانے میں سرکاری اسکولوں میں داخلے کے لیے کم سے کم سات سال کی عمر درکار تھی۔موصوف اپنے بچپن کے سات سال پورا ہونے کے بعد اپنے والد صاحب کے پاس جموں آ گئے کیونکہ ان کے نانیہال میں کوئی اسکول نہیں تھا۔وہاں زندگی کی ضرورتیں بڑی مشکل سے پوری ہوتی تھیں۔

جناب عرشؔ صہبائی کے گھر کا یہ حال تھا کہ جب کوئی مہمان ان سے ملاقات کو آتا تو گھر میں ٹوٹی ہوئی دو کرسیاں موجود تھیں جنہیں وہ پیش کر دیتے تھے حالانکہ وہ کہتے ہیں کہ میرے لیے یہ تشویشناک بات تھی لیکن اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔اگر ملنے کے لیے دو شخص آ جاتے تو آپ خود نیچے بیٹھ جایا کرتے حالانکہ کرسی پر بیٹھنے والوں کو یہ بات گوارا نہیں ہوتی۔ان سب باتوں کے متعلق ان کے کلام میں اشارے مل جاتے ہیں:

آدمی آفات ہستی سے اگر چاہے نجات
مشکلوں کا خیر مقدم ہر قدم کرتا رہے(۶)

ایک اور شعر دیکھئے:

اے عرشؔ راہ ہستی کانٹوں سے پر ہے لیکن
ہم پھر بھی بڑھ رہے ہیں ہر گام مسکرا کر(۷)

تعلیم وتربیت:

تعلیم کا آغاز دستورِ زمانہ کے مطابق اسکول ہی سے ہوا۔عرشؔ صہبائی کے والد صاحب نے 1937ء میں سات برس کی عمر میں عرشؔ کو اپنے گھر کے پاس کچی چھاؤنی پرائمری اسکول میں داخل کروایا۔1938ء میں یہ اسکول ان کے گھر سے تھوڑا دور دھونتھلی بازار میں منتقل ہوگیا اور اس کا نام دھونتھلی پرائمری اسکول رکھا گیا۔ 1942ء میں اسی اسکول سے عرشؔ نے پانچویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ جہاں سے فارغ ہونے کے بعد عرشؔ نے مزید تعلیم کے لیے رنبیر ہائی اسکول جو حال میں رنبیر ہائر سیکنڈری اسکول ہے، میں داخلہ لیا۔عرشؔ صہبائی ایک صحت منداور ذہین طالب علم تھے۔انھیں اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں میں مولوی عبداللہ جیسا استاد ملا۔طبیعت میں شعروشاعری سے مناسبت قدرتی طور پر موجود تھی۔اردو کی تعلیم مولوی عبداللہ صاحب سے حاصل کی، جو ان کی شاعرانہ طبیعت اور مزاج کے لیے سونے پر سہاگا ثابت ہوئی۔عرشؔ کو پنجابی زبان سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ان کی نانی صاحبہ کا میکہ لالہ موسیٰ (پاکستان) میں تھا۔وہ ان کے ساتھ اکثر وہاں جایا کرتے تھے اور وہیں سے انھوں نے پنجابی زبان سیکھی جسے وہ آج بھی بے حد پسند کرتے ہیں۔اگرچہ عرشؔ صہبائی کی مادری زبان ڈوگری زز ہے لیکن اردو زبان سے وہ بیحد محبت کرتے ہیں:

عرشؔ مجھ کو ڈوگری بولی بھی ہے بے شک عزیز
ہاں مگر اردو زبان کی اور ہی کچھ بات ہے(۸)

1948ء میں عرشؔ صہبائی نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد انھوں نے گاندھی میموریل کالج جموں، جس کا سابقہ نام پرنس آف ویلز کالج تھا، میں گیارھویں جماعت میں داخلہ لیا۔1948ء میں گیارھویں جماعت کا امتحان پاس کیا اور 1950ء میں ایف۔اے کا امتحان دینے سے قبل ہی کالج کو خیر آباد کہہ دیا۔ان کے تعلیمی سفر سے کنارہ کشی کا باعث ان کی شاعری بھی بنی چونکہ شاعری کی طرف ان کا رجحان اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ان کی پوری توجہ شاعری پر ہی مرکوز ہوگئی تھی۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

یوں سر منزل لٹا ہے کاروان زندگی
دیکھتا ہی رہ گیا منزل کو میں منزل مجھے(۹)

عرشؔ صہبائی کو شاعری سے فائدہ کم ،نقصان زیادہ ہوا۔جب انھوں نے تعلیم ترک کی تو یہ بات ان کے

والد صاحب اور بڑے بھائی کو بھی بہت نا گوار گزری۔اس کا ایک سبب غربت بھی ہوسکتا ہے اور پھر گھر میں عورت نہ ہونے کی وجہ سے ایک عرصہ تک کھانا بنانے کی ذمہ داری بھی ان کے سر تھی۔ جب ان کے بڑے بھائی نے سرکاری ملازمت اختیار کی اور ان کی شادی ریاسی میں ہوئی تو گھر میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔عرشؔ صہبائی خود بھی اعتراف کرتے ہیں کہ وہ جو کپڑے پہنتے تھے ان میں پیوند لگے ہوتے تھے۔ چونکہ ان کے والد صاحب نے ان کی والدہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہیں کی اس لیے کئی قسم کی پریشانیاں لاحق رہیں۔

ہم راحت کے لمحوں کو کرتے کہاں تلاش
اس دل پر چھایا رہا اکثر غم معاش (۱۰)

یہ حقیقت ہے کہ مفلسی کے باوجود بھی ان کے والد صاحب نے ایک باوقار زندگی گزاری۔ان کا اثر ان کی اولاد پر بھی پڑا۔عرشؔ صہبائی کی ابتدائی زندگی کا اثر ان کے کلام میں جابجا نظر آتا ہے۔اس کے باوجود وہ زندگی سے قطعاً مایوس نہیں ہوئے۔ بقول عرشؔ:

جو زندگی ہے تو غم بھی ہیں ساتھ ساتھ اس کے
کوئی ندی نہیں جس میں بھنور نہیں ہوتے (۱۱)

عرشؔ صہبائی خود بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ شاعری ان کے تعلیمی سفر کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ آج ادبی دنیا میں عرشؔ صہبائی کو جو شہرت حاصل ہے اس کا سبب صرف اور صرف ان کی شاعری ہے۔ یہ بچپن سے ہی کافی ذہین اور طبّاع تھے۔خداداد ذہانت کی بدولت چھوٹی عمر میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔عرشؔ صہبائی کو اردو دنیا میں شاعری نے جو پہچان دی ہے وہ اعلیٰ تعلیم نہیں دلاسکتی تھی۔ تعلیم کے بعد عرشؔ نے شاعری پر ہی اپنی ساری توجہ مرکوز کی۔انھیں معلوم تھا کہ وہ ایک ایسے رستے پر چل پڑے ہیں جہاں منزل کی صرف امید ہی کی جاسکتی ہے۔مگر انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔

شادی:

13رفروری1955ء کو جب عرشؔ صہبائی کی عمر24 سال4 ماہ10 دن کی ہوئی تو آپ ازدواجی زندگی میں بندھ گئے۔ان کی اہلیہ محترمہ کا نام کملا ابرول تھا جو ایک سخی دل اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔عرشؔ صہبائی کی شادی سے پہلے ان کے والد صاحب ان کو داغ مفارقت دے چکے تھے۔اس لیے ان کی شادی کی تمام ذمہ داریاں ان کے بڑے بھائی کے سر تھیں جو انھوں نے نہایت ذمہ داری سے انجام دیں۔عرشؔ صہبائی کی شریق

حیات محترمہ کملا ابرول نے اپنی زندگی کے 23 سال بڑی خوشگواری سے گزارے۔اس کے بعد سن 1978ء کے قریب وہ ایک مرض میں مبتلا ہوگئیں۔یہ مرض 1978ء سے 2008ء تک مسلسل جاری رہااوراسی کے چلتے آخرکار 20رفروری 2008ء کوعرشؔ کی اہلیہ محترمہ اس دنیائے فانی کوخیرآباد کہہ گئیں۔بقول عرشؔ:

اُن کے اک ہونے سے اس گھر میں تھیں کتنی رونقیں
وہ نہیں تو اک سکوتِ بیکراں ہے زندگی (۱۲)

اولادیں:

عرشؔ صہبائی کی اہلیہ کملا ابرول کے بطن سے چاراولادیں ہوئیں جن میں تین بیٹیاں اورایک بیٹا ہے۔ ان میں سب سے بڑی بیٹی گیتا ساہنی جوایم۔اے(انگریزی) ہیں۔گھریلو کاموں میں انھیں دلچسپی تھی لہٰذا شادی کے بعد اپنے خاوند کی رضامندی سے خوداپنی ملازمت ترک کر کے گھریلو کاموں میں مصروف ہوگئیں۔ ان کے خاوند جناب جی جی ساہنی جموں اینڈ کشمیر کے بینک جموں میں ڈی۔جی۔ایم تھے۔دوسری بیٹی ریکھا گندوترہ ہیں ان کی شادی راجوری میں ہوئی ہے۔انھوں نے ایم۔اے سنسکرت سے کیا لیکن اپنی بڑی بہن گیتا ساہنی کی طرح شادی کے بعد اس نے بھی اپنی ملازمت کوخیرآباد کہہ دیا اوراپنی ازدواجی زندگی میں مصروف ہوگئیں۔اس کے خاوند جناب دیپک گندوترہ بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی ہیں اورایک اچھے سرکاری کرمچاری ہیں۔اس سے چھوٹے بھائی ارون کمار ابرول بی۔اے اور بی۔کام کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مرکزی حکومت کے محکمہ سی۔ڈی۔اے میں سرکاری ملازم ہوگئے۔ملازمت کی وجہ سے وہ مزید تعلیم حاصل نہیں کرپائے۔ان کی اہلیہ مادھوی ابرول بھی ایم۔اے ہیں۔عرشؔ صہبائی کی سب سے چھوٹی بیٹی اپیتا سوری نے بھی بی۔اے تک کی تعلیم حاصل کی تھی کہ شادی ہوگئی، پھرشادی کے بعد کسی مجبوری کی وجہ سے تعلیم جاری نہیں رکھ سکیں۔اس کے خاوند بھارت سوری کئی برسوں تک پہلگام (کشمیر) میں ایک ہوٹل چلاتے رہے لیکن آج کل جموں میں ہی رہائش پذیر ہیں۔

یہاں عرشؔ صہبائی کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے کیونکہ انھوں نے ایک طرف اپنے محدود ذرائع کے باوجود تعلیم کے زیور سے اپنی اولاد کوآراستہ کروایا تو وہیں دوسری طرف اپنے گھر کے وقار کوبھی قایم رکھا۔ایک عرصہ تک ان کی زندگی تکلیفوں کے جنجال میں الجھی رہی کیونکہ شادی کے بعد ایک طرف خود بھی جگر کی بیماری میں مبتلا ہوگئے تھے۔دوسری طرف ان کی اہلیہ کملا ابرول لگ بھگ چودہ سال تک گنٹھیا کی مریض رہیں۔ایک

طویل مدت کی تاب نہ لا کر اس جہان فانی کو خیر آباد کہہ گئیں۔اتنی مشکلوں کے باوجود عرشؔ لکھتے ہیں:

عرشؔ ہم تھے حوصلے والے مگر
وہ غم ٹوٹے خدا یاد آ گیا(۱۳)

عرشؔ صہبائی نے اپنی زندگی کی 91 ر بہاریں نہایت خوشگوار طبیعت کے ساتھ گزاری ہیں۔ان کے چہرے پر زندگی کے آخری لمحات تک ایک دائمی مسکراہٹ دیکھنے کو ملتی رہی۔اس کا سبب یہ کہ ان کے پوتے پوتیاں،دوتے دوتیاں بھی ان ہی طرح تھے جو انھیں بے انتہا محبت کرتے تھے۔

ملازمت:

اس میں کوئی شک نہیں کہ عرشؔ صہبائی بچپن سے ہی مالی مشکلات کا شکار رہے تھے۔ایک عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن 1951ء میں جب انھوں نے کالج کی تعلیم کو ترک کیا تو اپنی مشکلات کے سبب انھیں ریجنل ریسرچ لیبارٹری جموں میں بطور کلرک کی ملازمت کرنی پڑی۔یہ ملازمت عرشؔ صہبائی کو پسند نہیں آئی کیو ں کی یہ ایک سائنسی تجربہ گاہ تھی جہاں جانوروں اور پرندوں پر طرح طرح کے تجربے(Operations) کیے جاتے تھے ظاہر ہے جانوروں اور پرندوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔اس لیے عرشؔ صہبائی جو نرم دل، نیک مزاج حساس طبعیت کے حامل تھے اکثر اس ملازمت سے پریشان رہنے لگے۔یہ ملازمت ان کی طبیعت کے بالکل خلاف تھی۔بلا آخر تین سال بعد 1954ء میں انھوں نے تنگ آ کر اس ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔اس کے متعلق وہ خود رقم طراز ہیں کہ ریجنل ریسرچ لیبارٹری چونکہ جو ایک سائنسی تجربہ گاہ تھی جہاں ہر وقت جانوروں وغیرہ پر تجربات ہوتے تھے ان معصوم جانوروں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا یہ منظر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا اس لیے میں کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھا کہ ملازمت سے استعفیٰ دے سکوں۔‘‘(۱۴)

یہ ملازمت ترک کرنے کے بعد مقامی مشاعروں کے علاوہ غیر ریاستی مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے۔اس وقت جموں میں کل ہند مشاعرے کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔یہاں ایک طرف لسان الاعجاز پنڈت میلا رام وفاؔ جیسی عظیم ہستیوں کو مدعو کیا جاتا تھا وہیں دوسری طرف عرشؔ صہبائی بھی اپنے فن کا لوہا منوا چکے تھے۔ان کے مطابق انھوں نے بیرون ریاست میں سب سے پہلا معاشرہ پٹھان کوٹ میں پڑھا تھا۔جس میں انہیں پانچ روپئے بطور معاوضہ حاصل ہوئے۔موصوف ریڈیو کشمیر جموں کے مشاعروں میں بھی شریک کرتے تھے۔آل انڈیا ریڈیو جموں کے ایک مشاعرے میں پنڈت میلا رام وفاؔ جیسی عظیم ہستی کو بھی دعوت دی گئی تھی۔عرشؔ صہبائی

کودوسرے بڑے شاعروں سے کافی داد حاصل ہوئی۔اس وقت ریڈیو کشمیر جموں کے اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر جناب این۔اقبال سنگھ تھے۔وہ بھی ان کا کلام سن کر کافی متاثر ہوئے تھے۔انہوں نے جناب عرشؔ صہبائی کو ریڈیو کی ملازمت کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اگر وہ ریڈیو میں ملازمت کرنا چاہیں تو ان کی ہر ممکن مدد کی جائے گی۔عرشؔ صہبائی ان کی اس پیش کش کو قبول کر کے ریڈیو میں بطور اسٹاف آرٹسٹ بھرتی ہوگئے۔اس کے لیے تین ماہ کا کنٹریکٹ ہوتا تھا۔تین ماہ کے بعد پھر اس کی میعاد تین ماہ کے لیے بڑھا دی جاتی تھی۔یہ ملازمت صرف غیر یقینی ہی نہیں بلکہ ازحد مشکل تھی۔لیکن عرشؔ صہبائی بڑی ذمہ داری اور ایمانداری سے اپنا فرض نبھاتے رہے جو انھیں اپنے خاندان سے وراثت میں ملی تھی۔

یہ سلسلہ ایک سال تک چلتا رہا۔وہ اس ملازمت سے بالکل بھی مطمئن نہیں تھے چونکہ اس میں کسی قسم کی ضمانت نہیں تھی۔بعد میں انھیں اکاؤنٹس سیکشن میں بحال کر دیا گیا۔اکاؤنٹس سیکشن میں خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ وہ ریڈیو م کے پروگرامز میں بھی شرکت کرتے رہے۔ریڈیو پروگرامز میں شرکت کرنے والے وہ ملازم جن کا تعلق پروگرام سیکشن سے نہیں ہوتا تھا انہیں ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اجازت سے معاوضہ دیا جاتا تھا۔انھیں دنوں یعنی اپریل 1955ء کو ریڈیو اسٹیشن میں کچھ آسامیاں نکل آئیں۔لہٰذا 14/اپریل 1955ء کو عرشؔ صہبائی کو بطور کلرک ملازمت مل گئی۔پھر بعد میں اسے ان کی مجبوری کہئے کہ وہ ریڈیو کی ملازمت سے دور نہ ہو سکے ورنہ وہ یہ ملازمت ترک کرنا چاہتے تھے۔اپنی عمر کے آخری ایام میں آ کر وہ اس کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ ''میرا خیال سراسر غلط ثابت ہوا کہ ریڈیو ایک ادبی ادارہ ہے۔33/سال ملازمت کر کے میں نے وہاں اپنی زندگی ضائع کی۔ملازمت کے دوران میں مختلف سازشوں کا شکار رہا۔''(۱۵)

عرشؔ صہبائی ایک عرصہ تک ریڈیو کشمیر جموں سے وابستہ رہے۔لیکن اس بیچ 1965ء میں ان کا تبادلہ دہلی میں کر دیا گیا۔دہلی سے جودھپور بھیج دیئے گئے۔پھر جودھپور سے گوالیار(پنجاب)میں تعینات رہے۔گوالیار سے پھر جموں آگئے۔اس طرح 1984ء میں انھیں ایڈمنسٹریٹو آفیسر کے طور پر سلی گڑھی(مغربی بنگال)بھیج دیا گیا۔سلی گڑھی ادب کے لحاظ سے ایک خشک خطہ ہے۔وہاں اردو پڑھنے والے تو کم بولنے والے بھی کم ہی ملتے ہیں۔سلی گڑھی کے متعلق بڑے مزاحیہ انداز میں عرشؔ صہبائی یوں فرماتے ہیں کہ ''وہاں کسی شاعر یا ادیب کا مقام تو تھا نہیں البتہ مچھروں کا صدر مقام تھا اور ٹی بی کی بیماری کا مکان تھا۔''(۱۶)

سلی گڑھی میں ایک سال گزارنے کے بعد انھیں آل انڈیا ریڈیو روہتک سے وابستہ کر دیا گیا۔انھیں

ان دونوں مقامات پر ادبی ماحول نصیب نہیں ہوا۔ روہتک میں انھوں نے کم وبیش دو، ڈھائی سال تک کام کیا۔ ان کے مطابق ان کی زندگی کا بدترین وقت روہتک میں گزرا ہے۔ بقول ان کے، ''ان کی زندگی کا یہ بدترین وقت تھا۔ روہتک ویسے بھی ایک غیرادبی مقام تھا اور مجموعی طور پر لوگ بھی کم تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی بول چال میں عام طور پر ایک اکھڑپن ہوتا تھا اور محسوس ہوتا تھا کہ آپ کسی غیر تعلیم یافتہ سے بات کر رہے ہیں۔'' (۱۷)

روہتک سے انھیں ایک بار جموں آنا پڑا۔ ان کی جگہ روہتک میں کسی اور ملازم نے اپنی تبدیلی کروالی۔ لیکن کچھ عرصے بعد ہی انھیں پھر سے روہتک تعینات کر دیا گیا۔ اب کی بار روہتک سے انھیں ریڈیو کشمیر سرینگر سے وابستہ کر دیا گیا اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس کے بعد انھیں آل انڈیا ریڈیو شملہ جانا ہے۔ 1987ء میں ان کا تبادلہ ریڈیو کشمیر سرینگر میں کیا گیا۔ سری نگر میں انہیں بہت اچھا ماحول ملا جس کی انہیں تمنا تھی۔ اس سے پہلے انہیں کہیں بھی ادبی ماحول نہیں میسر ہو سکا۔ ان میں دوسروں کی خدمت کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔ وہ ہر لحاظ سے ہر دل عزیز تھے۔ اپنی زندگی کے متعلق وہ یوں کہتے ہیں:

تمام عمر الجھتی رہی تلاطم سے
بھنور کی ضد میں رہی کشتی حیات میری (۱۸)

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا لیکن ان کے ڈائریکٹر اس حق میں نہیں تھے۔ لہٰذا ان کی ملازمت کی توسیع کے لیے انھوں نے ہیڈ آفس (ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو) میں سفارش کی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اگر کوئی سیاسی رہنمائی ہوتی تو مسئلہ حل ہو جاتا کیونکہ ایسے معاملات میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جنہیں سیاسی سرپرستی حاصل ہو جبکہ وہ دیانتداری اور حقیقت پسندی کے حامل تھے۔ خود کہتے ہیں:

آواز گمشدہ کے سوا کچھ بھی نہیں
اس دور میں جو حقیقت پسند ہے (۱۹)

آخر 31 دسمبر 1988ء میں 58 سال کی عمر میں ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر وہ اردو ادب کی خدمت میں کوشاں ہو گئے۔ تقریباً 8 / برس تک وہ جموں کے مختلف روزناموں میں کام کرتے رہے۔ وہ خود کما کر خرچ کرنے والوں میں سے تھے۔ ان روزناموں اور اخبارات میں کام کرنا ان کی مجبوری تھی کیونکہ ان کی اہلیہ محترمہ مسلسل تیس برس تک صاحب فراش رہیں۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ:

زندگی ہے یا کوئی زنجیر ہے
یا کسی مجرم کی یہ تعبیر ہے

فکر ماضی فکر فردا فکر حال
سو طرح کا رنج دامن گیر ہے(۲۰)

سفر آخرت:

میرا جشن وفات کب ہوگا
مجھے اس میں شریک ہونا ہے(۲۱)

آہ! عرشؔ صہبائی کو بھی گزری ہوئی داستاں کی مانند تحریر کرنا پڑے گا ایسا تصور میرے بہم وگماں میں بھی کبھی نہیں آیا لیکن نظام کائنات کے کا یہی سلسلہ ہے کہ ہر آنے والے کو ایک روز اس گزرگاہ کو خیر آباد کہہ کر اپنے خالق کی جانب ایک انجانے سفر کا آغاز کرنا ہے۔ میں عرشؔ صہبائی سے ذاتی طور پر بہت قریب سے آشنا ہوں اور اس بات پر مجھے بے حد فخر ہے لیکن ان کے اس قدر اچانک سفر مرگ سے رنجیدہ بھی بہت ہوں۔ جب بھی ان سے ملاقات کے دوران ان کے دنیا سے جانے کے بعد کے متعلق کبھی میں نے سوال دست دراز کیا تو ان کی زبان سے بے ساختہ یہی شعر نکلتا تھا اور آخر وہ دن ہی گیا انہیں اپنے جشن مرگ میں شریق ہونے کا شرف حاصل ہوگیا۔

آج زندہ ہیں کل مرحوم ہو جائیں گے اے عرشؔ
اک حقیقت رفتہ رفتہ داستاں بن جائے گی (۲۲)

عرشؔ صہبائی کے یوم وفات سے چند روز پہلے ہی میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بے حد چشت، چال چلن وہی پرانی فرتی اور تیز رفتاری کہ جیسے انہیں کوئی مرض لاحق نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود جب میں نے ان کا حال دریافت کیا تو کہنے لگے کہ گلے سے تھوڑا نیچے داہنے بازو کی ایک چھوٹی سی ہڈیا ٹوٹ گئی ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کا جڑنا اب مشکل ہے البتہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ان سے بات کرتے وقت ایک پل کے لئے بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ چند روز بعد اس شخص کی جدائی ہمارا مقدر بن جائے گی۔

یہاں توانسان کا کوئی ،چلتا نہیں ہے زور
کب ٹوٹے کچھ پتہ نہیں، سانسوں کی یہ ڈور (۲۳)

بہر حال انسان جو بھی سمجھے حقیقت یہی ہے کہ موت زندگی کا سب سے بڑا سچ ہے جسے انسان جھٹلاتا ضرور ہے لیکن اس سے بچ نہیں سکتا۔ عرشؔ صہبائی ہمیشہ تنہا اپنے الگ کمرے میں رہنے کے عادی تھے۔ ان کے انتقال کے دن بھی وہ جموں ریشم گھر کالونی میں واقع اپنے گھر میں موجود تھے۔ عرشؔ صہبائی کے گھر والوں کے مطابق ۲۵ دسمبر 2020ء شام کے 8:10 کا وقت تھا کے واش رام سے لوٹے اور اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے

، ٹیلی ویژن لگا ہوا تھا اور پڑوس کے کمرے میں ان کی بہو پوجا آردھنا میں مگن تھی۔ تقریباً 8:20 کا وقت ہوا ہوگا کہ ان کا فون مسلسل رنگ کرنے لگا۔ ان کی بہو یہ سوچ کر ان کے کمرے میں داخل ہوئی کہ وہ شاید خبروں دیکھنے میں مصروف ہیں اس لیے فون کی رنگ سنائی نہ دے رہی ہو اور میں انہیں آگاہ کروں۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی زور زور سے ڈیڈی جی ڈیڈی جی آواز لگانے لگی، یہ سن کر ان بیٹا بھی فوراً آ حاضر ہوا۔ ان کے بیٹے کے مطابق یہ بات معلوم ہوئی کہ ان کے پہنچنے سے تقریباً 10/ بجے سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ آخری وقت میں اکثر لوگ کچھ وصیت و نصیحت کرتے ہیں لیکن وہ ایسی موت پا گئے کہ جیسے انہیں کسی سے کوئی شکایت ہی نہ ہو، نہ کسی سے ہم کلامی نہ آواز، تنہا ہی سفر آخرت اختیار کر لیا۔ ان کے کلام میں شامل ایک دوہا موت کے متعلق ان کی رائے کی صداقت بیان کرتا ہے۔

کتنا بڑا زلزلہ اور کوئی نہیں آواز
انسان کے جسم سے جب روح کرے پرواز (۲۴)

عرشؔ صہبائی کی رحلت کی خبر سنی تو ایک گہرے رنج اور زیاں کا احساس ہوا کہ مرحوم نے ساری زندگی فکر معاش اور فکر شعر میں گزاری بلکہ حصول شہرت سے بھی خود کو دور رکھا۔ یوں تو ہر قلمکار کی موت کم و بیش اسی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو انگیز کرتی ہے، تاہم مرحوم کے بارے میں یہ کیفیت دیر تک میرے دل و دماغ پر حاوی رہی۔ مرحوم سے میری اپنی ملاقاتیں ہوئیں ہیں اور پھر ان سے دلی رشتہ بھی ایسا تھا کہ ان کی رحلت کی خبر کا صدمہ میرے لئے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ میرا ان کے گھر میں اکثر آنا جانا رہتا تھا کیوں کہ میں ان کی سیدھی سادھی درویشانہ وضع قطع، ان کے انفرادی لب و لہجے سے بہت متاثر تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انہوں اردو ادب کے لئے جتنا کام کیا ہے اتنا ریاست کے کسی مسلمان شاعر نے کیا ہوتا تو اس کا نام ادب کے بڑے ستاروں کے ساتھ تحریر کیا جاتا لیکن وہ ہمیشہ ریاستی سطح پر نظر انداز کئے جاتے رہے ہیں۔ انہیں وہ مقام ہر گز حاصل نہیں جس کے وہ مستحق تھے۔ اسی لئے وہ اپنے ایک قطعہ میں اس کا گلہ پیش کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں۔

جور پیہم کے داغ برسوں تک
اپنے دامن سے دھوئے گی دنیا
آج طنزاً یہ مسکراتی ہے
کل مگر ہم کو روئے گی دنیا (۲۵)

یہ سال 2020ء جاتے جاتے بے شمار علمی وادبی شخصیات سے ہمیں محروم کر گیا۔ جن میں عرشؔ صہبائی کے علاوہ گنگا جمنی تہذیب کا آخری چراغ جناب گلزارؔ دہلوی، مشاعروں کی جان منفرد لب و لہجے کے ملک راحتؔ اندوری، جدید مرثیہ کے ستاد و نقاد ڈاکٹر عظیمؔ امروہوی، طنز و مزاح کے بے تاج بادشاہ اسرارؔ جامعی، اردو نظم کے اچھے شاعر رہبرؔ جونپوری اور جذباتی شاعری کے علمبردار ڈاکٹر حنیفؔ ترین وغیرہ جیسے عظیم فنکار و ادیب شامل ہیں۔ 25/دسمبر کو عرشؔ صہبائی نے اس دنیا کو خیر آباد کہا۔ اس طرح جموں و کشمیر میں اردو شعر و ادب کا ایک ستون گر گیا۔

شخصیت:

شخصیت عربی لفظ ہے اور مونث استعمال ہوتا ہے۔ شخصیت کے معنی کسی شخص کی خصوصیت، ذات، درجہ ذات، شیخی و غرور یا کسی شخص کے کردار یا اس کے ظاہری پہلوؤں کی انفرادیت کو کو ظاہر کرنا جو کہ نہایت ہی مشکل کام ہے۔ یہ ایک ایسا سانچہ ہے جس سے ہر شخص کی خوبیوں اور خامیوں کو جانچا یا پرکھا جا سکتا ہے۔ ہم کسی کی شخصیت کو جانچتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی شخصیت مکمل یا ادھوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کی شخصیت مرتب کرنا نہایت ہی دشوار ہے۔ کسی کی شخصیت اور سوانح مرتب کرنے کے لئے سب سے بہترین مواد اس کی خودنوشت تحریریں اور واقیات ہوتے ہیں لیکن ان پر بھی بھروسا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ تحقیق کا اصول بتاتا ہے کہ ہر شخص اپنے خاندان کے متعلق زیادہ سے زیادہ جھوٹ بولتا ہے۔ جہاں تک عرشؔ صہبائی کی شخصیت کا تعلق ہے، اس سلسلے میں کوشل کرنؔ ٹھاکر جو کہ عرشؔ صہبائی کی ایک شاگرد ہیں ان کی رائے سے ان کی شخصیت کا کچھ حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ''ہر انسان کی پہچان اس کی شخصیت کے ان عناصر سے ہوتی ہے جو اسے دوسروں سے منفرد اور ممیّز کرتے ہیں۔ چھریرا جسم، متوسط قد، حسین خد و خال، اخلاص و شرافت اور سراپا محبت کو دوسرے الفاظ میں عرشؔ صہبائی کہتے ہیں۔ وہ ایک سحر آفریں شخصیت کے مالک ہیں جو چند ہی لمحوں میں دوسروں کو متاثر کر لیتی ہے اور یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اس شخص سے ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔'' (۲۶)

کسی بھی ادیب یا شاعر کی شخصیت کو پروان چڑھانے میں قدرت کے ساتھ ساتھ اس ماحول کا بھی کافی حصہ ہوتا ہے۔ ان حقایق کے پیش نظر جب ہم عرشؔ صہبائی کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں یہاں ایک طرف قدرتی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے وہیں دوسری طرف اس ماحول کا بھی خاصہ دخل نظر آتا ہے جس نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگر شاعری کا انہیں عطا ہونا ہم قدرت کا تحفہ قرار

دیں تو جن حالات کے نے انہیں اس مقام تک پہنچانے میں تحریک کا کام کیا انہیں ہم ماحول کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

عرشؔ صہبائی نے اپنا بچپن تنگ دستی و غربت میں گزارا اور جوانی کا بیشتر حصہ زندگی کی شمع جلائے رکھنے کی خاطر تکلیف اور جد و جہد میں بسر کیا۔ حضرت عادمؑ سے لیکر روز اجل تک خاوند اور بیوی کا رشتہ واحد ایسا ہے جو انسان کے لئے باعث سکون سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جناب عرشؔ نے اس رشتے میں بھی بہت مشکلات کا سامنا کیا، شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی ان کی اہلیہ جونڈس کے مرض میں مبتلا ہوگئیں اور تقریباً 30/ برس بستر مرگ پر گزار کر اس جہان فانی کو خیر آباد کہہ پر رخصت ہوئیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کا کتنی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے زندگی کے ہر منظر کا بڑی عاجزی و انکساری سے استقبال کیا۔ بقول عرشؔ:

زندگی حادثوں کی ہے تقریب
وقت نامہ نگار ہوتا ہے (۲۷)

اس کے ہر منظر پر مٹ جا اس کا پس منظر کا دیکھ
زندگی ایک خول ہے اس کے اندر نہ دیکھ (۲۸)

عرشؔ صہبائی ریاست جموں و کشمیر کے بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاف دل، محنت کش، وفادار، ہمدرد، بلند خیال اور حق سناش انسان بھی تھے۔ اردو شاعری میں آج بھی ان کا ایک مقام ہے۔ وہ اپنی ریاست کی حدیں پھلانگ کر ملک کی حدود کو پار کر کے، برصغیر ہند و پاک اور دوسرے کئی غیر مما لک میں شاعری کے حوالے سے ایک معتبر شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ میرے لیے یہ بات باعث فخر ہے کہ میں اپنے زمانے کے ایک ممتاز شاعر اور قد آور شخصیت سے ذاتی طور پر واقف ہوں:

جناب عرشؔ سے اپنا بھی گہرا رشتہ ہے
بہت ہی کم ہے یہ ہم اس پہ جتنا بھی ناز کریں (۲۹)

عرشؔ صہبائی ایک عملی دانشور اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ وہ صورت، حسن سیرت اور خوش گوئی کے جوہر سے مالا مال تھے۔ وہ شرافت، وضع داری، خوش اخلاقی اور انکساری کا مجسمہ ہیں۔ ان کی انسان دوستی، فراخ دلی، نیک اور سادہ طبیعت اور شریفانہ اطوار نے انہیں اردو

شاعری کی دنیا میں ایک محترم شخصیت کا مالک بنا دیا ہے۔ان کا کلام ان کی شخصیت کا عکس ہے:

مرے کلام میں ہے جذب زندگی مری
ہے مری زندگی کا آئینہ کلام مرا(۳۰)

عرشؔ صہبائی موجودہ دور کی بساطِ ادب میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے یگانہ وجداگانہ حیثیت کے حامل ایسی مخزنِ کمالات شخصیت تھے جنہیں تطبیق کے پیمانوں سے ناپ کر کسی سے چھوٹا یا بڑا اقرار دینا اس لئے ممکن نہیں کہ ان کی خصوصیات کے تناظر میں کوئی اور نظر ہی نہیں آتا کہ اس سے ان کا موازنہ کیا جا سکے۔

دور تک گونجتی رہی ہے جو
وہ صدا وقت کی رہے ہیں ہم(۳۱)

جناب عرشؔ صہبائی ہمیشہ وفا پرست رہے ہیں۔انھوں نے شاعری کو اپنی روزمرہ کی زندگی سے آراستہ کیا ہے۔اس لیے ان کی شخصیت کو ان کے اشعار کی کسوٹی پر پرکھنے کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ سچ بولنے کے عادی تھے۔یہ سچ بولنے کا ہتھیار جوان کے پاس ہے انھیں چوٹیں بھی دیتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی انھوں نے گاندھی جی کے فلسفے ''Truthfulness is the master key'' کو ساری زندگی اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔بقول ان کے:

میں کہ حق بات کو حق بات کہوں گا پھر بھی
گو زبان کٹتی ہے گردن بھی قلم ہوتی ہے(۳۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ عرشؔ صہبائی ایک حساس طبیعت کے مالک ہیں۔ ہر کسی کا درد ان کا اپنا درد معلوم ہوتا ہے۔خودداری بھی ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے۔تمام عمر وہ مصیبتوں اور پریشانیوں کا شکار رہے ہیں لیکن انھوں نے مدد کے لیے سوائے رب کے کسی اور کو نہیں پکارا۔انھوں نے تنگ دستی میں بھی کبھی خودداری کا دامن نہیں چھوڑا۔ایک شعر میں یوں کہتے ہیں:

ہم نے پھیلایا نہیں ہرگز دست سوال
ہم بزرگوں کی دعا سے پھولتے پھلتے رہے(۳۳)

پھر دوسری جگہ یوں کہتے ہیں:

سب کا ہوں مگر کوئی بھی اپنائے نہ مجھ کو
میں بھی کسی ٹوٹے ہوئے رشتے کی طرح ہوں(۳۴)

شکل وصورت:

عرشؔ صہبائی جموں کشمیر کے ایک دیہات (جو ضلع جموں تحصیل اکھنور سیری پلائی بٹل باختن) میں پیدا ہوئے۔اس گاؤں میں ان کے نانہال تھے۔عرشؔ صہبائی صاحب ظاہری شکل وصورت کے سے خوبصورت وخوش نماں انسان تھے۔ان کا قد درمیانہ،جسم چھریرا، چہرا گول،گندمی رنگ،ہلکی سی لمبی ناک،کشادہ پیشانی،بھویں الگ الگ، پتلے ہونٹ، داہنی گال پر تل نماں نشان، حیران آنکھیں،سفید وباترتیب بال،آنکھوں پر لگا ہوا گول شیشوں والا چشمہ جو عموماً پڑھنے لکھنے کے وقت استعمال کیا جاتا تھا۔بلا شبہ عرشؔ صہبائی ایک شریف النفس اور محنتی انسان تھے۔ان کی شرافت، واضع داری،خوش اخلاقی،نیک اور سادہ طبیعت اور شریفانہ اطوار نے انہیں اردو شعری دنیا میں ایک محترم شخصیت کا مالک بنا دیا ہے۔اگر چہ موجودہ دور میں انسان بھرسہ کرنے کے لایق نہیں رہا لیکن عرشؔ ہمیشہ دوسروں کو نفع پہنچانے کی فراق میں رہتے تھے،یہ ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو تھا۔بلا مذہب وملت ہر ایک کے لئے ان کے دل میں خلوص ومروت ہے۔ایسی پاکیز گی طبع،پُر وقار، بے تعصب اور سنجیدہ شخصیت اور نیک کردار نے ان کی شاعری پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔مختصراً عرشؔ جتنے اعلیٰ شاعر تھے اتنے ہی اعلیٰ انسان بھی تھے۔

لباس و پوشاک:

لباس انسان کی ظاہری شخصیت میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے،مگر لباس کو دیکھ کر کسی کی داخلی شخصیت کا اندازہ لگانا غلط ہوگا۔کسی کی ظاہری اور داخلی شرافت کا تعین لباس نہیں بلکہ قابلیت سے ہوتا ہے۔لباس کا سادہ اور صاف ہونا ضروری ہے۔عرشؔ صہبائی نے بچپن کا کچھ حصہ اگر چہ دیہات میں گزارا لیکن ان کے دادا چونکہ علاقے کے معتبر شخص تھے اس لئے ان کا لباس باقی دیہاتی بچوں سے کچھ حد تک بہتر ہو کرتا تھا۔اگر چہ صاف ستھری پتلون،قمیض اور پاؤں میں دیسی ساخت کا جوتا پہن کر اسکول جایا کرتے تھے لیکن وہ لباس اتنا بھی اچھا نہیں تھا کہ ہم اسے بہترین کہہ سکیں۔عرشؔ صاحب نے کئی مشاعروں میں اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ وہ جو کپڑے پہنتے تھے ان میں پیوند لگے ہوتے تھے۔چونکہ ان کے والد صاحب نے ان کی والدہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہیں کی اس لیے کئی قسم کی پریشانیاں لاحق رہیں۔یہ حقیقت ہے کہ مفلسی کے باوجود بھی ان کے والد صاحب نے ایک باوقار زندگی گزاری۔اس کا اثر ان کی اولاد پر بھی پڑا۔

اے عرشؔ راہ ہستی کانٹوں سے پر ہے لیکن
ہم پھر بھی بڑھ رہے ہیں ہر گام مسکرا کر (۳۵)

جناب عرشؔ صہبائی کے گھر کا یہ حال تھا کہ جب کوئی مہمان ان سے ملاقات کو آتا تو گھر میں ٹوٹی ہوئی دو کرسیاں موجود تھیں جنہیں وہ پیش کر دیتے تھے حالانکہ وہ کہتے ہیں کہ میرے لیے یہ تشویشناک بات تھی لیکن اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اگر ملنے کے لیے دو شخص آجاتے تو آپ خود نیچے بیٹھ جایا کرتے حالانکہ کرسی پر بیٹھنے والوں کو یہ بات گوارا نہیں ہوتی۔ ان سب باتوں کے متعلق ان کے کلام میں اشارے مل جاتے ہیں:

آدمی آفاتِ ہستی سے اگر چاہے نجات
مشکلوں کا خیر مقدم ہر قدم کرتا رہے(۳۶)

عرشؔ صہبائی کے بچپن، جوانی اور آخری وقت کے حالات میں بہت فرق ہے۔ بقول ان کے لباس موقعے کا گہنہ ہے۔ میں نے ادبی مجلسوں میں دیکھا ہے کہ ان کے کلام کی طرح ان کا لباس بھی عمدہ ہوتا ہے لیکن گھر پر وہ لباس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، جو جی میں آئے پہن لیتے ہیں۔ میں نے پہلی بار ملاقات میں انہیں اس طرح بیٹھے ہوئے دیکھا کہ وہ تصویر تمام جزئیات کے ساتھ اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ بقول عرشؔ:

جو زندگی ہے تو غم بھی ہیں ساتھ ساتھ اس کے
کوئی ندی نہیں جس میں بھنور نہیں ہوتے (۳۷)

لب ولہجہ:

عرشؔ صہبائی کی آواز دھیمی، لہجہ نرم اور مزاج سادہ تھا۔ ان کے بچپن کا کچھ حصہ دیہاتی ماحول میں گزرا ہے۔ اس لئے ان کے عادات وخصائل اور طرزِ ماندوبود میں کچھ حد تک دیہاتی ماحول کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بچپن کے چند سال دیہات میں ضرور گزارے لیکن بہت جلد وہ شہر کے ماحول کے عادی ہو گئے۔ عرشؔ صاحب ریڈیو کی ملازمت کے مسلسل تبادلوں کی بدولت ملک کے مختلف شہروں، دہلی، جودھپور، گوالیار (پنجاب)، سلی گڑھی (مغربی بنگال)، روہتک، شملہ (ہماچل پردیس)، سرینگر (کشمیر) وغیرہ میں قیام پزیر رہے۔ آخرکار ملازمت سے سبکدوش ہو کر ریشم گھر کالونی جموں میں مکمل سکونت اختیار کر لی۔ اکثر ادیبوں کا لب ولہجہ ان کے آبائی وطن کے لوگوں میل کھاتا ہے لیکن عرشؔ کا نہ لب ولہجہ جموں کے شہریوں سے ملتا ہے اور نہ خود کو جموں وکشمیر کا تصور کرتے ہیں۔ بقول عرشؔ:

عرشؔ طبیعت کو دونوں ہی راس نہیں آئے
جموں کی یہ مٹی بھی جموں کا یہ پانی بھی (۳۸)

زبان سے محبت کرنے والوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جن سے زبان بھی محبت کرتی ہو۔ اردو وہ زبان ہے جس نے میرؔ سے محبت کی، غالبؔ سے عشق کیا، اقبالؔ کو چاہا، فراقؔ پر فریفتہ ہوئی اور عرشؔ کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ جب کوئی زبان کسی کو اپنا محبوب بنالے تو سچی محبت کی تصویر ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ عرشؔ کا اردو زبان سے عشق کسی انتہائی پُر اسرار عشق کی داستان سے کم نہیں تھا۔ اردو نے عرشؔ صہبائی پر اپنا سب کچھ نچھاور کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری کہیے یا طاقت اردو تہذیب تھی جس کی بقا کے لئے وہ آخری دم تک سرگرمِ عمل رہے۔ ان کی زبان اور لفظیات کا ذخیرہ، لہجے کی خنک، ان کے رکھ رکھاؤ کا انداز اور برتاؤ کا سلیقہ انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا تھا۔ انہوں نے اردو کلچر کی روح کی گہرائیوں تک اُتر کے دیکھا ہے اس لئے وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ کتنی ہمہ گیر زبان ہے۔ ان کا لب ولہجہ اردو ہے لیکن انہیں انگریزی، ہندی، ڈوگری وغیرہ دوسری زبانوں سے بھی اچھی واقفیت تھی۔ وہ موقع ومحل کا خیال رکھتے تھے کہ ان کا مخاطب کون ہے، پھر اسی طرز کا لب ولہجہ استعمال کرتے تھے۔ میں نے انہیں اکثر اردو میں کلام کرتے دیکھا ہے لیکن اردو میں بات چیت کے دوران وہ اکثر ڈوگری کے الفاظ استعمال کر جاتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:

عرشؔ مجھ کو ڈوگری بولی بھی ہے بے شک عزیز

ہاں مگر اردو زبان کی اور ہی کچھ بات ہے (۳۹)

عادات واطوار:

گردش زمانہ بارہا تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ بعض لوگ زمانے کی تغیرات کے ساتھ ساتھ عادات و اطوار میں تبدیلی لاتے رہتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی قدیم روش میں تھوڑی بہت ترمیم بھی لانا پسند نہیں کرتے چاہے اس کے لئے انھیں کتنا ہی نقصان کیوں نہ برداشت کرنا پڑے، ایسے لوگوں کو زمانہ یا تو مٹا دیتا ہے یا وہ زمانے کی ڈگر سے پیچھے چھوٹ جاتے ہیں۔ عرشؔ صہبائی 90/برس سے گردشِ زمانہ کا مشاہدہ کیا لیکن زندگی میں انہوں کبھی بھی حالات وواقعات کے ساتھ سمجھوتا نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ زندگی میں انہیں وہ مقام نصیب نہیں ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ زمانہ سازان سے کہیں آ گئے نکل گئے۔

جبین وقت کے تیور میری نظر میں ہیں

میں نبض وقت کی دھڑکن سے ناشناس نہیں (۴۰)

عرشؔ صہبائی کا موجودہ ادبی سرمایا شاعری اور تذکرے ہیں مگر ان میں بھی انہوں نے اپنی قدیم ڈگر کو

نہیں چھوڑا اور مسلسل سختی پر کاربند رہے۔ وہ کبھی کسی سیاست داں کی چاپلوسی کرنے کے قائل نہیں ہوئے اور نہ کسی کی شان میں قصیدہ کہے بلکہ حق بات کو ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کے عادی رہے ہیں۔ یہ سچ بولنے کا ہتھیار جوان کے پاس ہے انھیں چوٹیں بھی دیتا ہے لیکن اسکے باوجود انھوں نے کبھی حق کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ بقول ان کے:

میں کہ حق بات کو حق بات کہوں گا پھر بھی

گو زبان کٹتی ہے گردن بھی قلم ہوتی ہے(۴۱)

عرشؔ کی شخصیت ایک آئینے کی طرح ہے۔ وہ ضمیر پرست، اصول پرور اور نیک سیرت انسان تھے۔ وہ ہر قسم کی لالچ سے بے نیاز اپنی بات کے دھنی اور اصول پرستی کا جذبہ دل میں لئے ہوئے ہر مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کو تیار رہتے تھے۔ جب کبھی کوئی بات ان کی طبیعت کے موافق نہیں ہوتی تو وہ ملازمت تک سے کنارہ کشی کرنے کو تیار رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی پہلی ملازمت اسی سبب سے ترک کی تھی کہ وہ کام ان کی طبیعت کے موافق نہیں تھا۔ موصوف سرتاپا وفا کا پیکر تھے۔ وہ زندگی میں ہمیشہ وفا پرستی کے قائل رہے شاید اسی سبب سے ان کے چہرے پر مسلسل ایک دائمی مسکراہٹ رقص کرتی رہتی تھی۔ بقول ان کے:

میری حیات ازل سے وفا کا پیکر ہے

وفا کے نام پر ہرگز نہ آزماؤ مجھے(۴۲)

عرشؔ صہبائی جوانی کے دنوں میں شاعری کے علاوہ کھیلوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انہیں ہاکی اور کبڈی کھیلنا پسند تھا لیکن ہاکی سے زیادہ وہ کبڈی میں مہارت رکھتے تھے۔ عرشؔ کبڈی کی جس ٹیم کے ساتھ شامل ہوتے تھے اس کی جیت طے شدہ ہوتی تھی۔ اسکول میں کبڈی ان کا پسندیدہ کھیل رہا ہے مگر کالج میں پہنچے تو ہاکی کھیل کو زیادہ اہمیت دی۔ عرشؔ صہبائی بہت تیز دوڑنے کے عادی تھے اس لئے کھیل کے دوران کسی کو پاس نہیں دیتے تھے۔ وہ ایک گول سے گیند لے کر دوسرے گول تک دوڑتے ہی جاتے تھے جو سراسر غلط رویہ ہے۔ ان کی اسی غلطی کی وجہ سے انہیں فسٹ الیون سے نکال دیا گیا تھا۔

عرشؔ صہبائی چائے اور تازہ میوے زیادہ پسند کرتے تھے۔ سادہ کھانا انھیں بہت پسند تھا اور ہمیشہ کم مقدار میں کھاتے تھے۔ تمبا کو نوشی بالکل نہیں کرتے تھے۔ شروع شروع میں انہوں نے مے نوشی کا شوق بھی پالا تھا لیکن اسے شوق کی طرح ہی ترک بھی کر دیا۔ وہ ہمیشہ صاف ستھرا رہنا پسند کرتے تھے۔ تمام عمر وہ مصیبتوں اور پریشانیوں کا شکار رہے لیکن انھوں نے مدد کے لیے سوائے رب کے کسی اور کو نہیں پکارا۔ انھوں نے تنگ دستی میں

بھی کبھی خودداری کا دامن نہیں چھوڑا۔ ایک شعر میں یوں کہتے ہیں:

ہم نے پھیلایا نہیں ہرگز دست سوال
ہم بزرگوں کی دعا سے پھولتے پھلتے رہے(۴۳)

پھر دوسری جگہ یوں کہتے ہیں:

سب کا ہوں مگر کوئی بھی اپنائے نہ مجھ کو
میں بھی کسی ٹوٹے ہوئے رشتے کی طرح ہوں(۴۴)

اخلاق:

عرشؔ صہبائی ایک حساس طبیعت کے مالک تھے۔ ہر کسی کا درد ان کا اپنا درد معلوم ہوتا تھا۔ ان کی شخصیت صرف سادگی کا ہی اعلا نمونہ نہیں بلکہ اخلاقی خوبیاں، شرافت اور خودداری ان کی طبیعت کے جزوِ اعظم تھے۔ وہ نیک طبیعت، ملنسار، خوش مجاز، خوش گفتار، مہماں نواز اور دوست دار انسان تھے۔ دوستوں اور ساتھیوں سے بلا تکلف بات چیت کرتے تھے، ہر مذہب و ملت کے لوگ انہیں احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کو سنوارنے میں جہاں ایک طرف ان کے ماحول کو دخل ہے وہیں دوسری طرف نرمی، انکساری، حق گوئی اور ان کی بلند اخلاقی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ان کی شخصیت، ان کا کردار، ان کی شاعری کی طرح علم وعمل کا نمونہ ہے۔ ان کے بقول:

ہزاروں سال دہراتی ہے دنیا جس کے افسانے
وہ خود انسان نہیں انسان کا کردار ہوتا ہے(۴۵)

عرشؔ صہبائی کنول کے اس پھول کی مانند ہیں جو کیچڑ میں پیدا ہوتا ہے مگر اس کی نجاستوں سے آلودہ نہیں ہونے پاتا۔ ان کی اس مرنجان مرنج طبیعت، درویشانہ سیرت خوائے قلندرانہ نے ان کو ہر حلقے میں محبوب ومحترم بنائے رکھا ہے۔ وہ جس گروہ میں بھی رہے میرِ کاروں اور سالارِ قافلہ بن کر رہے۔ عرشؔ صہبائی سے جب کسی سے ملتے ہیں تو اپنی بے نفسی، پاکبازی اور بے نیازی کی بدولت ایسے اخلاق وکردار کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ملنے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ ان سے ملنے کے بعد اس نظریے پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ عظیم انسان ہی عظیم فنکار ہوسکتا ہے۔ عرشؔ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ قابلِ قدر بات ہے کہ گفتار کے غازی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کردار کے غازی بھی تھے۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ اپنے ایک مضمون ’’عرشؔ صہبائی: شخصیت کے کئی رنگ‘‘ میں ان کے اخلاق اور کردار کو یوں بیان کرتے ہیں۔

میں جب بھی عرشؔ صہبائی صاحب کے ہاں گیا، تو انہیں اکثر لکھنے میں مصروف پایا۔ کاغذوں کا دفتر ان کے دائیں بائیں پھیلا ہوتا ہے۔ کچھ اخباروں اور رسائل اور شعری و نثری کتابیں بھی ان کے سامنے دیکھنے کو ملتی ہیں۔ موصوف اپنا کام چھوڑ کر ملنے والوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ خیر و آفیت پوچھنے کے بعد کئی لطیفے، شگوفے، شعری واقعات سنا کر دل خوش کر دیتے ہیں۔ اگر چہ ہمارا کچھ ادبی کام ہوگا، تو اپنی تمام مصروفیات کو چھوڑ کر پہلے ہمارا کام کریں گے۔ یہ ان کا دستور، میرے لیے ہی نہیں بلکہ ان کے پاس کوئی بھی ان کا ملنے والا حتیٰ کہ ان کا دشمن بھی آ جائے گا تب بھی ادبی کام کے لئے وہ کسی کو انکار نہیں کرتے۔ (۴۶)

عرشؔ صہبائی کا شمار ملک کے نامور شاعروں میں ہوتا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کے شعری منظر نامے میں تو وہ سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اردو کے دوسرے بڑے مراکز دہلی، لکھنو، عظیم آباد، لاہور، کراچی وغیرہ میں عرشؔ کے جو معاصر شعراء موجود ہیں وہ ان کی شاعرانہ خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ اخلاق اور کردار کے اعتبار سے ایک اعلیٰ انسان تھے۔ ان کے دامن ادب سے جو لوگ وابستہ ہیں ان میں ایک جناب خورشید کاظمی بھی ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''مغنی حیات عرشؔ صہبائی'' میں ان کے اخلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اس آبشار سے جس کی روانی میں چھ دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی کوئی کمی نہیں ہوئی کتنے فیضیاب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں خدا ہی جانتا ہے کیونکہ عرشؔ کو خود بھی یہ معلوم نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کتنے ہی منجھے اور بذات خود استاد شاعر ان سے اپنے کلام پر اصلاح یا رائے لینا پسند کرتے ہیں اور عرشؔ ہیں کہ باوجود اپنی انتہائی مصروفیت کے کسی کو نا امید نہیں کرتے'' (۴۷)

عرشؔ صہبائی نے ۶۵ برسوں تک اردو ادب کی خدمت کی ہے۔ پورے ملک میں ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو ان سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کی سادہ دلی دیکھئے کہ وہ کہتے ہیں۔

اگر میں خدمتِ شعر و سخن میں محو ہو عرشؔ
میرے لئے یہ عبادت ہے کاروبار نہیں (۴۸)
یہ آرزو ہے کہ میں خدمت ادب ہی کروں
یقین کیجیے مجھ کو نہیں ہے خواہشِ نام (۴۹)

بلاشبہ عرشؔ صہبائی بڑے حاضر جواب، بذلہ سنج اور نہایت ہنس مکھ انسان تھے۔ عرشؔ صہبائی حوصلہ مندی، جذبۂ حب الوطنی، فطرت شناسی اور توکل پسندی کا آئینہ ہیں۔ ان کی شخصیت کو سنوارنے میں جہاں ایک طرف ان کے ماحول کو دخل ہے وہیں دوسری طرف نرمی، انکساری، حق گوئی اور ان کی بلند اخلاقی کا بہت بڑا

ہاتھ ہے۔ان کی یہی خوبیاں اہل علم اور زمانہ شناس لوگوں کو بہت عزیز تھیں۔

علم وفن:

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اردو شاعری میں عرشؔ صہبائی ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف بڑے بڑے قدآور شعرائے کرام نے کیا ہے۔جن میں منشی تلوک چند محرومؔ، منورؔ لکھنوی، ڈاکٹر منوہر سہائے انورؔ، ابوالفصاحت جوشؔ ملسیانی، ڈاکٹر جاویدؔ وششٹ اور شکیلؔ بدایونی جیسی ہستیاں شامل ہیں۔جس علمی اور ادبی ماحول میں وہ رہتے تھے اس میں ان کے معاصرین ان کے علمی وفنی کمالات سے بخوبی واقف تھے۔ان کا شمار ہندو پاک کے نامور شاعروں میں ہوتا تھا۔آج ریاست جموں وکشمیر کے شعری منظر نامے میں تو وہ سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ان کے ڈیڑھ درجن شعری مجموعے اردو میں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں لیکن ابھی بھی ان کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ ہے۔ملک کے مقتدر اخبارات، رسائل، ادبی و صحافتی تواریخیں جو آزادیِ ہند سے تا حال کا احاطہ کیے ہوئے ہے، میں کسی نہ کسی صورت میں ان کا ذکر ملتا ہے۔آج بھی مختلف اخبارات اور رسائل میں ان سے متعلق مضامین چھپتے رہتے ہیں۔شعر گوئی میں انہوں نے کم عمری میں ہی مہارت حاصل کر لی تھی۔وہ تب آٹھویں جماعت میں تھے جب شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ان کے اردو کے معلم شیخ عبداللہ جماعت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور پھر بیت بازی شروع کروا دیتے تھے۔جو کوئی اچھا شعر کہتا اس کی حوصلہ افزائی فرماتے بلکہ اکثر کچھ انعام بھی دے دیا کرتے تھے۔ان کی اسی حوصلہ افزائی نے عرشؔ کے اندر شاعری کے جراثیم کو اور اُبھارہ اور وہ مسلسل شعر کہنے لگے۔یہ ان کی شاعری کا ابتدائی دور کہا جا سکتا ہے جس میں وہ صرف اردو زبان تک ہی رسائی رکھتے تھے۔عالمِ شباب تک آتے آتے انہوں نے مختلف زبانوں مثلاً اردو، انگریزی، ہندی، پنجابی وغیرہ میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔

عرشؔ صہبائی نے اردو نثر میں بھی قابلِ قدر کام کیا ہے لیکن ان کی پہچان شاعر کے طور پر ہے۔ان کا کلام پڑھنے کے بعد کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ انہیں اس پر دسترس حاصل تھی۔ان کے کلام میں الفاظ کی نشست برخاست اس بات کی گواہ ہے کہ وہ شاعری کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ان کی یہی خاصیت ہے کہ وہ فن کو زیادہ اہمیت دیتے تھے بقول ان کے فن سے شعر میں شعریت آتی ہے۔ان کی شاعری میں جگہ جگہ اس کا ثبوت ملتا ہے۔عرشؔ صہبائی کی تخلیقات کی ایک لمبی فہرست اردو کے ادبی سرمائے کا حصہ ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے شاعری میں مختلف اصناف کو اپنایا ہے لیکن ان کی شہرت کا سہرا غزل

گوئی کے سر ہے۔مثال کے طور پر ان کی ایک غزل کا یہ شعر دیکھئے۔

دل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اترے ہوتے

تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح (۵۰)

عرشؔ کی یہ غزل گزشتہ 38 سالوں سے بشارت علی کی آواز میں ریڈیو لاہور سے گائی جا رہی ہے۔سن 1971ء میں جب ہندو پاک کے آپسی معاملات کی بدولت حالات نازک ہو گئے تھے تو اس وقت سرحد پر ہندو پاک دونوں جانب سے لوگ دستوں کی صورت میں آئے تھے۔ہر آنے والے کے ہاتھ میں جھنڈا تھا جس پر اشتہار کی صورت کچھ کلمات لکھے ہوئے تھے۔پاکستان کی جانب سے آنے والوں میں ایک شخص کے ہاتھ میں جھنڈے پر عرشؔ کا یہی شعر رقم تھا۔اگر آپ کو سرینگر جانے کا اتفاق ہو تو بارڈر سیکورٹی فورس (B.S.F) سرینگر کے کیمپ میں ایک بورڈ پر عرشؔ صہبائی کا یہ شعر آج بھی موجود ہے۔عرشؔ چونکہ ریڈیو کی ملازمت میں رہے ہیں اس لئے انہیں سینکڑوں دفعہ اپنے کلام کو ریڈیو نشریات کے وسیلے سے عوام تک پہنچانے کا موقعہ ملا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج ان کا بیشتر کلام زبان زد خاص و عام ہے۔

عرشؔ صہبائی کا شمار اردو ادب کے باحیات بزرگ شعراء میں ہوتا ہے۔وہ ایک مشاق شاعر تھے۔ان کے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست موجود ہے جو نہ صرف ریاست جموں و کشمیر کے بلکہ برصغیرِ ہندو پاک سے اپنے کلام پر ان سے اصلاح ومشورہ لیتے ہیں۔ان کے لب و لہجے کے عنوان کے تحت ان کے معاصرین کے بہت سے علمی اور فنی لطیفے درج کئے جا چکے ہیں۔ان کے علمی اور فنی لطیفوں کو ان کے ایک شاگرد ڈاکٹر غلام جیلانی نے کتابی صورت میں بھی شایع کیا ہے۔

مذہب:

عرشؔ صہبائی کی کنیت ابرول ہے۔ابرول ہندو دھرم کے کھشتری قبیلے کی ایک شاخ ہے۔اس کنیت کے لوگ مغربی پنجاب اور جموں کشمیر کے آس پاس کے علاقوں میں موجود ہیں۔عرشؔ صہبائی کے آبا و اجداد ریاست جموں و کشمیر کے مقامی سنار خاندانوں میں سے جن کی جاگیر ریاست کے مختلف علاقوں میں آج بھی موجود ہے۔اگر چہ عرشؔ کا تعلق ہندو مذہب سے ہے لیکن ان سے جو کوئی ایک مرتبہ بھی ملا ہے وہ انہیں کسی ایک مذہب کا نمائندہ نہیں مانے گا۔میں نے خود کئی مرتبہ ان سے جب کبھی باتوں باتوں میں مذہب کا ذکر کیا تو ان کی زبان سے ایک ہی فقرہ نکلتا تھا کہ آج کے انسان کا جب انسانیت سے رشتہ نہیں تو مذہب سے کیا ہوگا۔وہ کہتے

تھے کہ انسان بس انسانیت سے قریب ہوجائے اور انسانیت سے بڑھ کر اسے کسی مذہب کی ضرورت نہیں ۔بقول عرشؔ:

مہر، وفا، اخلاص تھے، انسان کی پہچان

لیکن آج کے دور میں، ان سب کا فقدان (۵۱)

عرشؔ صہبائی اردو ادب خصوصاً اردو شاعری میں سیماب اکبرآبادی کے بعد دوسرا بڑا نام ہے جس کے دامن ادب سے وابستہ ہزاروں شاگردوں کا ہجوم ہے جو ان سے اپنے کلام پر اصلاح و مشورہ طلب کرتے ہیں۔عرشؔ صہبائی اپنے ہم عصر ادباء و شعرا میں ہر کسی سے محبت کرتے تھے۔ بلا امتیاز مذہب و ملت ہر ایک کے لیے ان کے دل میں خلوص و مروت ہے۔کوئی ہرگز ان کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ فلاں مذہب کے روح رواں تھے۔ان کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا مذہب انسانیت ہے۔

عرشؔ صہبائی کی شخصیت کا سب سے بڑا حسن یہ تھا کہ وہ مذہبی طور پر ہندو ہونے کے باوجود اپنے عادات و اطوار اور بود و باش سے مسلمان نظر آتے تھے۔ سید فتح حسین شاہ ظفر کاظمی ان کے متعلق یوں رقمطراز ہیں کہ''میری نظر میں آپ 75 فیصد مسلمان ہیں اور 25 فیصد ہندو کیونکہ آپ نے ہندو خاندان میں جنم لیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ نہ مسلمان ہیں اور نہ ہی ہندو۔ آپ ایک انسان ہیں۔''(۵۲)

عرشؔ حوصلہ مندی، جذبۂ حب الوطنی، فطرت شناسی اور توکل پسندی کا آئینہ تھے۔ان کی یہی خوبیاں اہل علم اور زمانہ شناس لوگوں کو بہت عزیز تھیں۔آپ کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا ریاست جموں وکشمیر میں ہی نہیں بیرون ریاست میں بھی ان کے بے شمار دوست تھے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر انسان کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ان سے ایک بار ملتا تو وہ دوبارہ ان سے ملنے کے لئے بے تاب رہتا تھا۔سچائی، دیانتداری اور حق گوئی ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو تھا۔کسی کو اچھا لگے یا برا اس بات کی پرواہ کئے بغیر وہ حق بات کو ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کے عادی تھے۔ جہاں حق گوئی کی بات آتی وہاں عرشؔ صہبائی ایک ننگی تلوار کی طرح سامنے آتے تھے۔اس معاملے میں کبھی کبھی ان کے اپنے بھی بیگانے ہوگئے اور کبھی کبھی ان دوست واحباب بھی ناراض ہوجاتے تھے۔اپنی سچائی اور حق گوئی پر انہیں بے حد ناز تھا۔وہ ہر ایک مذہب کا احترام کرتے تھے اور اپنی ذات کو کسی مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے تھے۔ان کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا مذہب انسانیت تھا۔

شاعری:

عرشؔ صہبائی نے شروع میں افسانے بھی تحریر کیے تھے جو صرف ان تک ہی محدود رہے۔ بعد میں یہ مسودہ بھی غائب ہوگیا۔اس کی کھوج اس لیے ضروری نہیں سمجھی گئی کیونکہ موصوف کا رجحان شاعری کی طرف زیادہ تھا۔اسکول کی تعلیم کے دوران وہ مختلف قسم کی ادبی اور نیم ادبی تقریبات میں حصہ لیتے تھے۔اس سے بھی انھیں مقامی طور پر بہت شہرت نصیب ہوئی۔ یہ سلسلہ کالج میں بھی جاری رہا۔خیر اس وقت تک وہ باقاعدہ شاعر بن چکے تھے اور مقامی طور پر ہونے والے مشاعروں میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔

عرشؔ صہبائی کے خاندان میں ان سے قبل نہ ہی تو کوئی شاعر تھا اور نہ ہی کسی کو شعر و شاعری میں دلچسپی تھی۔آپ کے باپ دادا سلیقہ شعار، محنتی، دانا اور خواندہ ضرور تھے لیکن شعر و شاعری کی دنیا سے وہ کوسوں دور تھے۔ان کو شعر و شاعری ورثہ میں نہیں ملی لیکن ان کی محنت، دلچسپی اور خداداد صلاحیت نے انھیں شاعر بنا دیا۔ان کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرشؔ صہبائی کو عہد طفلی سے ہی علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا،شاعری کے جراثیم موجود تھے جو دوران تعلیم ابھر کر سامنے آ گئے۔

تقسیم وطن سے پہلے جموں میں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں غیر ریاستی شعرا بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ایک سامع کی حیثیت سے ان میں وہ برابر شریک ہوتے تھے۔ظاہر ہے کہ اس سے بھی ان کے شوق شعر گوئی کو تقویت ملی۔لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم ان کے محرک ان کے اردو مدرس مولوی عبداللہ تھے جن کی صحبت ان کی شاعرانہ طبیعت اور مزاج پر سونے پر سہاگا ثابت ہوئی۔ چونکہ وہ مہینے میں ایک آدھ بار طالب علموں کو دو گروپوں میں تقسیم کر کے بیت بازی کا مقابلہ کرواتے تھے۔تمام طلبہ بھی اس میں کافی دلچسپی دکھاتے تھے۔عرشؔ نے شعر کہنا اسی زمانے میں شروع کر دیا تھا لیکن ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز کالج کے زمانے میں ہوا۔وہ شاعری محفوظ بھی رہی جسے انھوں نے اپنے مجموعہ کلام ''شکست جام'' میں شامل کیا۔۱۹۵۰ء میں بھی ان کے اشعار خوب ہی نہیں بلکہ بہت خوب تھے۔مثلاً یہ شعر دیکھئے:

بادِ خزاں رہے سہے تنکے بھی لے اڑی
دے کر دل حزیں کو تسلی بہار کی (۵۳)

جناب ٹھاکر پونچھی نے جموں میں ایک ملاقات کے دوران عرشؔ صہبائی کو مشورہ دیا کہ وہ ماہنامہ ''بیسویں صدی'' کو اپنا کلام بغرض اشاعت ارسال کریں۔ٹھاکر پونچھی آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ تھے لیکن اکثر جموں آتے رہتے تھے۔اس سے پہلے بھی عرشؔ کا کلام دوسرے کئی ریاستی و ملکی رسائل و جرائد میں شائع

ہوتا تھا۔''بیسویں صدی'' اس وقت کثیر الاشاعت اور بے حد مقبول تھا۔ پہلی بار عرشؔ صہبائی کی غزل اس میں تیسرے صفحے پر حضرت عرشؔ صہبائی کے نام سے شائع ہوئی۔ حضرت لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ مدیر کا اندازہ تھا کہ عرشؔ صہبائی عمر رسیدہ ہوں گے۔ زیر تذکرہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہمارے ضبط کی آخر فغاں تک بات آ پہنچی
ذرا سی بات سے بڑھ کر کہاں تک بات آ پہنچی

انھوں نے مسکرا کر بات کا موضوع بدل ڈالا
کبھی جب ان کے حسن دلستاں تک بات آ پہنچی

کہیں باتوں ہی باتوں میں نہ پھر تکرار ہوجائے
وہیں تک بات رہنے دو جہاں تک بات آ پہنچی (۵۴)

عرشؔ صہبائی کا کلام مسلسل 18 برس تک ''بیسویں صدی'' میں شائع ہوتا رہا۔ ماہنامہ ''بیسویں صدی'' ایک ایسا رسالہ تھا جس میں بڑے بڑے اچھے ادیب وشاعر اپنی تخلیقات شائع کروانے کے لیے ترستے تھے۔

عرشؔ صہبائی تھوڑے عرصے کے لیے داغؔ دہلوی کے شاگر رشید جوشؔ ملسیانی کے دامن ادب سے وابستہ رہے۔ لیکن استاد نے یہ کہہ کر انھیں اچھے شاعر کی سند عطا کر دی کہ انھیں اب اصلاح کی ضرورت نہیں غالباً انھیں یہ سند اس لیے ملی کیونکہ وہ پیدائشی بلکہ قدرتی شاعر تھی۔ ان کی شاعری میں آورد نہیں بلکہ آمد ہے۔ ان کو شعر کہنے کے لیے ذہن پر زور دینے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ شعر خود اپنے آپ کو ان کی زبان سے کہلوا لیتے تھے۔

عرشؔ صہبائی نے متعدد اصناف سخن غزل، نظم، قطعہ، دوہا وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے اردو شعر وادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی تخلیقات نو آموز شاعروں کے لیے ایک تحریک کا کام کرتی ہیں۔ اگرچہ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کے شعری مجموعوں میں زیادہ تعداد غزل پر مشتمل ہے۔ ابھی تک عرشؔ صہبائی کی جو تخلیقات منظر عام پر آ کر داد تحسین حاصل کر چکی ہیں، ان کی فہرست یوں ہے:

1۔ شکست جام	1958ء	غزل
2۔ شگفت گل	1961ء	غزل
3۔ انجم کدہ	1963ء	تذکرہ

4۔ یہ جانے پہچانے لوگ	1966ء	تذکرہ
5۔ صلیب	1971ء	غزل
6۔ یہ جھونپڑے یہ لوگ	1976ء	نظم اور قطعات
7۔ اسلوب	1991ء	غزل
8۔ ریزہ ریزہ وجود	1995ء	غزل
9۔ اساس	2001ء	غزل
10۔ نایاب	2002ء	غزل
11۔ توازن	2005ء	غزل
12۔ دسترس	2007ء	غزل
13۔ عکس جمال	2007ء	غزل
14۔ خدوخال	2008ء	غزل
15۔ تجھ بن چین کہاں	2009ء	دوہا
16۔ خوشبو ترے بدن کی	2009ء	غزل (ہندی)
17۔ سائے تیری یادوں کے	2010ء	غزل
18۔ جواز	2011ء	غزل
19۔ شبنم تیری یادوں کی	2013ء	غزل
20۔ آگہی	2016ء	غزل
21۔ تیراز یرلب تبسم	2019ء	غزل
22۔ تیری پرفسوں نگاہیں	2019ء	غزل

عرشؔ کی ان تخلیقات کے علاوہ ابھی بھی ان کے چند شاگردوں کے پاس ان کا بے شمار غیر مطبوعہ کلام موجود ہے جو ابھی اشاعت کے کے قریب ہے۔اتنی تخلیقات ہونے کے باوجود بھی ان کے ساتھ وہ انصاف نہیں ہوا جو ایک ادیب وشاعر کے ساتھ ہونا چاہیے شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو جموں کشمیر کا باشندہ تسلیم کرنے پر راضی نہیں تھے۔انہوں نے اردو کے ایک ایسے شاعر کے طور پر اپنی شناخت قایم کی ہے کہ قلی قطب شاہؔ و امیر خسروؔ کے

زمانے سے لیکر زمانہ حال تک اس نوعیت کا کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ جی ہاں یہ محض کوئی تعریفی جملہ نہیں ہے بلکہ اس میں صداقت ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے نئی اردو غزل میں 153 اور 351 اشعار کی طویل غزلیں لکھ کر نئی اردوغزل کی تاریخ میں طویل غزل لکھنے والے پہلا جدید شاعر ہونے کی حیثیت سے اپنا نام سرفہرست میں درج کیا ہے۔ وہ نہ صرف ریاست جموں وکشمیر کے بلکہ برصغیر ہندوپاک کے اہم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کے متعلق مشہور شاعر شکیلؔ بدایونی یوں رقمطراز ہیں کہ ''جناب عرشؔ صہبائی بہترین غزل گو اور بڑے ہونہار اور باشعور نوجوان ہیں۔ ان کا تغزل کافی نکھرا ہوا اور سلجھا ہوا ہے۔ شگفتگی اور رعنائی کے ساتھ گداختگی اور افتادگی کی بھی کمی نہیں۔ زندگی کی نقاشی اور کائنات کی عکاسی بھی جلوہ ہے۔'' (۵۵)

جناب عرشؔ صہبائی کے سوچنے کا طریقہ قدرے مختلف ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے لیے راستہ خود نکالا اور اس پر ثابت قدم رہے۔ وہ کسی کی تقلید کے قائل نہیں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

کسی صورت بھی ہم تقلید پر قائل نہیں ہوتے
نشان قدموں کے ہوں جس پر وہ راستہ چھوڑ دیتے ہیں (۵۶)

جس طرح سورج کی کرنیں پانی میں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح عرشؔ صہبائی کا انداز سخن دوسروں سے بالکل الگ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عرشؔ صہبائی کا اپنا ایک مخصوص انداز و اسلوب ہے۔ ان کی طبیعت میں محبت کا دریا موجزن نظر آتا ہے اور الفاظ کے مترنم لہجے میں محبت کا دلچسپ سفر بیان ہوگیا ہے۔ یہی ان کی انفرادیت کا اہم پہلو ہے۔ جو انھیں دوسرے شعراء سے ممتاز و ممیّز کرتا ہے۔ مشکل پسندی دور دور تک ان کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ سادہ اور آسان الفاظ ایک دوسرے سے محو گفتگو نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے مکالمہ و مراسلہ ہو رہا ہو۔ بقول عرشؔ

ہر کسی کو کب میسر ہے یہ طرز گفتگو
آپ کا لہجہ الگ ہے آپ کا انداز اور (۵۷)

میرا انداز سخن ہی میری پہچان ہے عرشؔ
اس قدر بھیڑ میں بھی ہے مری آواز الگ (۵۸)

ریاست جموں وکشمیر میں جب شعر و ادب خصوصاً اردو شاعری کے حوالے سے بات کی جائے تو عرشؔ

صہبائی کا ذکر ناگزیر ہوجاتا ہے۔لیکن اسے ریاست جموں وکشمیر کی بدنصیبی کہیے یا اہل اقتدار کی سازش کہ ریاست میں عرشؔ صہبائی کو سرکاری سطح پر فراموش کردینے کی حدتک نظر انداز کیا گیا ہے:

کس لیے سب اس کے دشمن کس لیے اس کے حریف
عرشؔ کے بارے میں ابھرے گا یقیناً یہ سوال(۵۹)

عرشؔ صہبائی سرکاری سطح پر تعصب کا شکار رہے اور جتنی شہرت ومقبولیت کے وہ اہل تھے انھیں اس سے محروم رکھا گیا۔انہیں خود بھی اس کا احساس ہے:

کٹی ہے زندگی جمہوریت کے سائے ہیں
تمام عمر تعصب کا ہم شکار رہے(۶۰)

ریاست جموں وکشمیر کی سب سے بڑی کمزوری یہ رہی ہے کہ یہاں مختلف مذاہب کے لوگ مختلف شاخوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر کوئی اپنی ہی شاخ کے لوگوں کی رہنمائی وترقی کے لیے سوچتا ہے۔سرکاری سطح پر مذہب کی جس شاخ کے لوگوں کا اقتدار ہو وہ دوسروں کو ترجیح دینے سے گریز کرتے ہیں۔یہی سبب ریاست کو بے ادبی کا گہوارہ بنا رہا ہے۔عرشؔ صہبائی بھی اسی سبب سے تعصب کے شکار ہوئے کیوں کہ ان کا اصل نام ہنس راج ابرول ہے۔انھوں نے کئی بار اس کا اعتراف بھی کیا ہے ریاستی ادب میں اتنا کام اگر کسی مسلم شخص نے کیا ہوتا تو وہ کسی مقام پر ہوتا۔ایک شعر میں لکھتے ہیں:

ہر ایک شخص تعصب کا ہے شکار اے عرشؔ
ہر ایک شخص کو درکار ہے اصل نام میرا(۶۱)

جموں سے عرشؔ کو جو شکوہ ہے اس کا اظہار اپنے ایک دوہے میں یوں کرتے ہیں:

عرشؔ ہوا محسوس یہ، کاٹا ہے بن باس
جموں کی آب وہوا، آئی نہ مجھ کو راس(۶۲)

عرشؔ صہبائی کو کسی سے کوئی گلہ نہیں کیوں کہ اکثر اچھے شاعروں کے ساتھ ان کے وقت میں ایسا ہی سانحہ پیش آیا ہے۔جو قدر وقیمت ان کی زندگی میں ہونی چاہیے وہ ان کے جانے کے بعد ہوتی ہے۔اگرچہ ریاستی سطح پر عرشؔ تعصب کا شکار رہے لیکن جب ہم ریاست کی حدیں پھلانگ کر نظر دوڑاتے ہیں تو یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ عرشؔ صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پاکستان میں بھی ایک معتبر شاعر کے طور پر جانے جاتے

ہیں۔مختصراً یہ کہ عرشؔ صہبائی ریاست جموں وکشمیر ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر میں اپنی شاعری کے حوالے سے ایک معتبر حیثیت رکھتے تھے۔اردو ادب کا کوئی رسالہ ایسا ہوگا جس میں ان کی کوئی تحریر یا خط شائع نہ ہوا ہو۔اس سے اردو شاعری میں ان کے مقام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ادبی ماحول اور معاصرین:

ہر ذی شعور و ذی ہوش انسان اپنے گرد و پیش کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے پھر ایک شاعر یا ادیب زیادہ حساس دل ہوتا ہے۔اس لیے اس کا ماحول سے زیادہ متاثر ہونا قدرتی بات ہے۔ وہ ماحول کے علاوہ سیاسی و سماجی حالات اور نظریات سے جڑا رہتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ سماج کا ایک رکن ہوتا ہے۔وہ اپنی تحریروں اور تخلیقات کے ذریعے ماحول کو بڑے پر اثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ حالاں کہ عام آدمی بھی اسی ماحول سے گزرتا ہے لیکن وہ اپنے گرد و پیش کی عکاسی اس انداز سے نہیں کر پاتا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا انداز بیان صرف کسی فنکار کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ وہ رنگ و آہنگ، زبان کی چاشنی، انداز بیان عام آدمی کو حاصل نہیں ہوتا۔کسی ماحول، کسی سماج کا جائزہ لینے کے لیے ایک فنکار کی تحریریں بے حد کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔اس طرح عرشؔ صہبائی نے بھی جس ماحول میں آنکھ کھولی اور جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی اس کا اثر ان کی شاعری میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

ملک میں جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو ریاست کی ادبی فضا نے بھی اس کے اثرات قبول کیے اور اس کے زیر اثر یہاں بھی جگہ جگہ ادبی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ان میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین جموں''، ''بزم ادب جموں'' اہم ہیں۔اس سے پہلے بھی جموں کے اہل ذوق اصحاب کی کوششوں سے 15-1914ء میں ایک بزم ''بزم مشاعرہ'' کے نام سے بنی تھی جس کے آغاز اور تنظیم میں صاحب زادہ محمد عمر، شیخ غلام نقشبند قابل ذکر ہیں۔لیکن اس وقت چونکہ شعرا اردو زبان سے زیادہ فارسی زبان کا ذوق رکھتے تھے اس لیے اردو کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی تھی جو اس کے بعد کے دور میں دی گئی۔ ریاست میں 1947ء کے بعد جو ادبی دور شروع ہوا اس کا آغاز بالخصوص عرشؔ صہبائی کی ادبی زندگی سے ہوتا ہے۔اس وقت ریاست میں ''بزم اردو ادب'' پہلی بزم تھی جس کا آغاز ہوا۔جس کے روح رواں جناب عرشؔ صہبائی تھے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ یہ بزم ترقی پسند مصنفین کی نعرہ بازی سے بہت دور تھی۔عرشؔ صہبائی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جب انھوں نے اردو شاعری کی ابتدا کی اس وقت جموں کا ادبی ماحول نہایت ہی خوشگوار تھا۔مختصراً جموں شعر و ادب کا گہوارہ تھا۔ یہاں

جب بھی مشاعرے ہوتے دیر رات تک جاری رہتے۔ ان میں جو شعرائے کرام مدعو کیے جاتے وہ قد آور شعرا ہوتے تھے۔ ان کا کلام کلام سن کر نو آموز شعراء کی ذہنی تربیت ہوتی تھی۔ انہیں ان کی قابلیت اور اہلیت کی بنا پر بلایا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ یہاں کے مشاعروں میں قبلہ جوش ملسیانی، پنڈت تلوک چند محروم، فراق گورکھپوری، قیس جالندھری، نریش کمار شاد، بسمل سعیدی، معین احسن جذبی، مخمور سعیدی، شفا گوالیاری، ڈاکٹر منوہر سہائے انور جیسی شخصیات تشریف لاتی تھیں۔ جن کا کلام سامعین کو متاثر کرتا تھا اور ان کی ذہنی نشو ونما کا باعث بنتا تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ سلسلہ ختم ہوتا گیا۔ ادب کے فروغ کے لیے سرکاری سطح پر ادارے قائم ہو گئے جن سے ادب کو فائدہ کم نقصان زیادہ پہنچا بلکہ اب اور زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ بقول عرش:

مٹتے مٹتے مٹ گئیں وہ محفلیں وہ رونقیں

دیکھتے ہی دیکھتے دل کا نگر صحرا ہوا (۶۳)

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ مشاعرے ادب کے فروغ کا باعث بنتے تھے۔ دور دور سے آ کر سامعین حضرات دیر رات تک مشاعرے میں شعراء کرام کے کلام سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مشاعرے میں جن شعرا کرام کو مدعو کیا جاتا تھا وہ اپنے کلام کے ذریعے سے ایک فضا قائم کر دیتے تھے۔

وہ چاہے میر ہو غالب ہوں چاہے عرش صہبائی

کوئی بھی ہو اپنے دور کا غماز ہوتا ہے (۶۴)

لیکن آج وہ چاہے مقامی مشاعرے ہوں یا بیرونی، صرف ان ہی کی شرکت ممکن ہوتی ہے جنہیں سیاسی رہنمائی حاصل ہو۔ ان میں اور بھی بہت سی باتیں اثر انداز ہوتی ہیں جن کا ذکر کرنا مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ وبا روز بروز پھیلتی جا رہی ہے۔ قائم کردہ اداروں نے ادب کی صورت ہی بگاڑ دی ہے۔ اس طرح جموں ادب کے بجائے بے ادبی کا گہوارہ بن چکا ہے۔ ادب کاروباری حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کا اثر سامعین پر بھی پڑا ہے، جس قسم کا پست اور کاروباری کلام سننے کے وہ عادی ہو چکے ہیں اسی قسم کا ان کا شاعری کے تئیں مذاق بن چکا ہے۔

یہاں جو بھی ادبی تقاریب منعقد ہوتی ہیں ان میں وہ ادیب و شاعر کم نظر آتے ہیں جو حقیقت میں ادب سے وابستہ ہوں، بلکہ زیادہ تعداد ان کی ہوتی ہے جو ادب سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے

کہ ہم کس ماحول میں سانس لے رہے ہیں اور وہ خواب کہ جموں کا ادبی ماحول اور نکھرے گا گرد رہ گزر بن کر رہ جاتا ہے۔ایک اچھا ادیب وشاعر صرف محسوس کر سکتا ہے لیکن عملی طور پر وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ یہاں کے ادبی ماحول کی کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔شاید یہ ایسی باتوں کا ہی ردعمل ہو جو عرشؔ صہبائی خود کو جموں وکشمیر کا شاعر تسلیم نہیں کرتے۔بقول عرشؔ صہبائی۔

دور تک ہے بے بسی کی اک فصیل

عرشؔ جموں پتھروں کا شہر ہے(۶۵)

اردو شاعری کا یہ دور نثری شاعری کا دور ہے۔اس میں میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن اس کا ردعمل یہ ہے کہ شاعری صرف خیال تک محدود ہوتی جا رہی ہے۔جموں میں ادبی ماحول اسی نوعیت کا ہے۔کئی ایسے بھی شاعر ہیں جو سرمایہ کاری کے ذریعے شہرت حاصل کر رہے ہیں اور کسی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ ریاست میں وہ سرکاری ادارے جو ادب کے فروغ کے لیے بنائے گئے ہیں ایسے اداروں پر یہ لوگ چھائے ہوئے ہیں۔اس کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ ریاست میں اچھے شاعر ہیں لیکن وہ ابھر نہیں سکے۔ جو نئے شاعر مشہور شاعر کہلاتے ہیں ان کے ایسے اداروں سے اچھے تعلقات ہیں۔اس طرح غزل ہو یا نظم سرکس کا کھیل بن کر رہ گیا ہے۔اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عرش صہبائی کس ادبی ماحول سے وابستہ ہیں۔

یہاں ہم عرشؔ صہبائی کے ہم عصر شعرائے کرام کا ذکر کرنا چاہتے ہیں چاہے ان کے کلام کا معیار کیسا بھی ہو۔اگرچہ عرشؔ صہبائی انھیں تخلص کا گناہگار گردانتے ہیں کیونکہ وہ تخلص رکھتے ہیں۔عرشؔ صہبائی کا عہد 1950ء سے لے کر 2020ء کے وسیع عرصے پر محیط ہے۔اس بیچ میں صرف ریاستی سطح پر ان کے سینکڑوں ہم عصر شعرا ہیں جو اردو شاعری میں اپنے فن کا لوہا منوا چکے ہیں۔ایسے میں کس شاعر کا یہاں ذکر کیا جائے اور کسے نظر انداز کیا جائے بے حد مشکل کام ہے۔ایسے میں ہم ان ہی شاعروں تک محدود رہیں گے جو جناب عرشؔ صہبائی کے حلقۂ احباب، ان کے ادبی وسماجی ماحول سے کسی نہ کسی وسیلے سے وابستہ رہے ہیں۔ان میں سے چند اسمائے گرامی یہ ہیں: رساؔ جاودانی، نشاطؔ کشتواڑی، منوہر لال دلؔ، عابدؔ مناروی، ودیا رتن عاصیؔ، میکش کاشمیری، نرسنگھ سہائے شوقؔ، اندر جیت لطفؔ، طالبؔ ایمن آبادی۔غلام رسول نازکیؔ، شوریدہؔ کاشمیری، پریت پال سنگھ بیتابؔ، ڈاکٹر نصرتؔ چودھری، مرزا محمد یاسین بیگ، حکیم منظور وغیرہ اہم ہیں۔

صرف ریاستی سطح پر ہی عرشؔ صہبائی کے ہم عصر شعرا کا جائزہ لیا جائے تو ایک مکمل کتاب تحریر کی جا سکتی

ہے۔ بہرحال یہاں چند شعرا کا اجمالی جائزہ پیش ہے۔ عرشؔ صہبائی کے ہم عصر شعرا میں رساؔ جاودانی ایک اہم نام ہے جن کا شمار ریاست کے ممتاز اردو شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کا اصلی نام عبدالقدوس ہے لیکن علمی حلقوں میں رساؔ جاودانی کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ آپ کے والد خواجہ منور جو دیو جو پیشے سے تاجر تھے اور فارسی علم و ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ 1901ء میں رسا جاودانی بھدروا میں پیدا ہوئے جو کشتواڑ کی طرح ریاست کی ایک خوبصورت وادی ہے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ گھر میں علمی ماحول کی وجہ سے رسا کے اندر شعروسخن کا ذوق بچپن میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔ کلام کے دو مجموعے ہیں، پہلا مجموعہ ''لالہ صحرا'' (1946ء) کے نام سے شائع ہوا اور دوسرا ''نظم ثریا'' ہے۔ اس پر مشہور محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا مقدمہ بھی شامل ہے جو اس وقت کشمیر یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو تھے۔

رساؔ نہایت سادہ طبیعت کے انسان تھے اور یہ سادگی ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ رساؔ نے غزل اور نظم دونوں اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلیں سادہ ہیں جو خواجہ میر دردؔ اور مصحفیؔ کی غزلوں کی یاد دلاتی ہیں۔ ان کا کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں رموزِ فن پر دسترس حاصل تھی۔ پروفیسر عبدالقادر سروریؔ لکھتے ہیں کہ ''غزل سے رسا کو طبعی مناسبت ہے اور اسی صنف میں ان کی طبیعت کے جوہر نمایاں ہوئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بحرین انھیں مرغوب ہیں، اور اپنے سادہ انداز اظہار میں وہ میر تقی میر کے جیسا اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی غزل کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ ان میں رومانیت کم، لیکن غور و فکر کی پرچھائیں زیادہ نمایاں ہیں...ان کی بعض غزلوں میں نظم کا سا تسلسل پایا جاتا ہے۔'' (٦٦)

رساؔ کی شاعری میں ان تمام باتوں کا ثبوت مل جاتا ہے۔ چند اشعار:

بے یقینی ہے ہستیِ ایماں — ضعف اوہام کا سہارا ہے
تیری فرقت میں تجھ سے ملنے تک — تیرے پیغام کا سہارا ہے
میکشوں کو فلک کی گردش میں — گردشِ جام کا سہارا ہے(٦٧)

ایک اور غزل کے چند شعر دیکھیے:

جو اثر آگ پر ہے پانی کا — وہی دشمن پہ مہربانی کا
ایک جھونکا ہوا کا آ گزرا — کیا یہی عہد تھا جوانی کا؟
ہے غنیمت اگر میسر ہو — ایک لمحہ بھی شادمانی کا(٦٨)

رسؔا کی غزلیں اور نظمیں دونوں معنی آفرینی، نغمگی اور پورے فنی رچاؤ کی حامل ہیں۔ان کی زیادہ تر نظمیں مناظر قدرت سے متعلق ہیں۔ان میں ’’بیتے دنوں کی یاد‘‘، ’’برف باری‘‘، ’’ساون‘‘ اور ’’خزاں‘‘ پاکیزہ نمونے ہیں۔نظم ساون کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تسکین دل نے پالی
ساون کی رت ہے آئی
کیا رنگ ہیں گلوں کے
نغمے ہیں بلبلوں کے
قمری کی کوک ہے تو
ہر سو ہے خوشنوائی
ساون کی رت آئی (۶۹)

غلام رسول نشاؔط کشتواڑی بھی ریاست جموں و کشمیر کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔1909ء میں کشتواڑ میں پیدا ہوئے۔گھر کے حالات سازگار نہیں تھے اس لیے جو تعلیم میسر ہوئی اس سے مستفید ہوئے۔ان کے آباو اجداد آج سے تقریباً دو سو سال پہلے اسلام آباد (کشمیر) سے ہجرت کر کے کشتواڑ آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔شعر و ادب سے لگاؤ بچپن سے ہی تھا لیکن کسی باکمال استاد سے استفادہ کرنے کے لیے کشتواڑ سے باہر جانے کا موقع نہیں مل سکا۔آخر میں سیماؔب اکبرآبادی سے رجوع کرنے کا انہیں خیال پیدا ہوا جو نزدیک اور دور کے شعرا کی تربیت کے لیے ایک ادارہ بن چکے تھے۔جموں و کشمیر کے کئی نوجوان شعرا ہدایت اور اصلاح کے لیے ان سے رجوع کرتے تھے۔اسی سلسلے میں نوجوانوں کی سعی سے ایک انجمن ’’سیمابیہ‘‘ سری نگر میں قایم ہوئی تھی۔

نشاؔط 43-1940ء تک سیماؔب کو اپنا کلام بھیجتے رہے۔غزل ان کی شعری تربیت کی زمین تھی اور اس میں انھیں اچھی مہارت بھی حاصل ہو گئی تھی۔لیکن عہد کا اقتضا انھیں نظم گوئی پر بھی ابھارتا رہا۔1942ء میں ان کی پہلی تصنیف ’’مظلوم کربلا‘‘ کے نام سے شائع ہوئی۔’’مناقب الاولیا‘‘ نشاؔط کی نعتوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ ہے۔اس میں کشمیری اور اردو دونوں قسم کی نعتیں موجود ہیں۔پھر 1974ء میں ان کا ایک اور مجموعہ ’’نعت سرکار دو عالم‘‘ منظر عام پر آیا۔ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ’’بادہ وطن‘‘ ہے۔اس میں زیادہ تر نظمیں قومی یکجہتی سے متعلق ہیں۔وہ اپنی نظموں میں فطرت کے نظاروں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔نظم ہی نہیں بلکہ وہ غزل بھی اچھی

اور روایتی انداز میں کہتے ہیں۔ایک غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہے:

جلوؤں کی تاب نہ لاسکے ان کے سامنے
آنکھیں ملانے آئے تھے شمس و قمر سے ہم
اک مختصر سا لمحہ وقفہ جو ٹھہری یہ زندگی
پھر کیوں نہ شام غم کو بدل دیں سحر سے ہم
شرم و حیا سے ان کی جبیں عرق ریز ہے
دامن کو اپنے بھرتے ہیں لال و گہر سے ہم (۷۰)

نشاؔط صاحب کا تمام اردو کلام ماسوائے نعت و منقبت ''تصویر خیال'' کے عنوان سے 1988ء میں شائع ہوا۔468 رصفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں غزل،نظم،طنز ومزاح سب کچھ موجود ہے۔اس میں شامل ان کی 50 رکے قریب غزلیں ہیں۔رساؔ جاودانی کی طرح ان کے اشعار بھی رومانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اپنی شاعری میں انھوں نے طنز ومزاح کے بھی خوب گل کھلائے ہیں۔ان کی طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں ''ممبری''، ''الیکشن''،''چاول نہیں ملتے''،''پے کمیشن''،''سرسوں کا تیل''اور''ماڈرن غزل'' کافی مشہور ومقبول ہیں۔

لالہ منوہر لال دلؔ جموں کے صاحب ذوق اصحاب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔دلؔ کی ولادت 1913ء میں جموں میں ہوئی۔ان کے والد لالہ شری جو آنند امل بنک کا کاروبار کرتے تھے لیکن ان کے بے وقت انتقال کی وجہ سے دل کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔شعر وسخن میں ان کی دلچسپی کا محرک ان کے زمانے میں جموں کی خوشگوار ادبی فضا تھی۔انھیں اپنے زمانے کے بعض سر برآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کے مواقع نصیب رہے۔اثرؔ صہبائی اس زمانے میں جموں میں تھے۔پنڈت کیفی اور نواب جعفر علی خاں اثرؔ کی موجودگی نے ان کے ادبی ذوق اور لب ولہجے میں ایک شستگی پیدا کردی۔پنڈت میلا رام وفاؔ بھی ان کی نوعمری کے زمانے میں جموں آیا کرتے تھے۔ان کا قیام دلؔ کے مکان میں ہی ہوا کرتا تھا۔اس لیے ان کی صحبت نے بھی ان کے شوق کو جلا بخشی اور وہ بھی شعر کہنے لگے اور جلد ہی اپنی نظمیں اخبارات میں اشاعت کے لیے بھیجنے لگے۔ان کی سب سے پہلی نظم کا عنوان ''میں دیوانۂ الفت ہوں'' رسالہ ''ویر بھارت'' لاہور سے شائع ہوئی۔اس کے بعد شہباز،''زمیندار''،''ریاست''وغیرہ ان کی اہم نظمیں ہیں۔دلؔ کو غزل گوئی سے بھی اچھی دلچسپی ہے۔بقول عبدالقادر سروریؔ:''غزل سے دلؔ کو زیادہ لگاؤ رہا ہے،اور ان کا قدیم اساتذۂ غزل کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔

اس لیے ان کی غزل میں اساتذہ کی پختگی اور شستگی پیدا ہوگئی ہے۔لیکن ان کے اسالیب اور فکر پر جدید عہد کا بھی پرتو ہے۔اس خوشگوار آمیزش سے دلؔ کی غزل قابل مطالعہ بن گئی ہے۔'' (۷۱)

دلؔ کا مجموعۂ کلام ''نقد دل'' کے عنوان سے شائع ہوا۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

باز ہوں ترے انداز نہ جینے دیں گے
یہ کسی کو بت طناز نہ جینے دیں گے
چاہ ہے اہل جفا کی تو یہ کیا ہے اے دلؔ
کھل گیا ان پہ اگر راز نہ جینے دیں گے(۷۲)

ان کے مجموعہ کلام ''شمیم گل'' کی ایک غزل کے یہ اشعار دیکھئے:

اے غم عشق !تیری عمر دراز — توہی نکلا ہے ایک غریب نواز
ہم بھی کہہ دیں گے اپنے دل کا راز — بات کا کچھ تو کیجئے آغاز
در ساقی پہ روز و شب سجدے — یہی طاعت میری یہی ہے نماز(۷۳)

عابدؔ مناوری جموں کی فکر جواں کے نمائندہ شاعروں میں سے تھے۔اپنی شاعری اور خاص طور پر اپنی غزل کی وجہ سے نمائندہ مقام رکھتے ہیں۔ان کا اصلی نام گوری نندن سنگھ بالی ہے لیکن ادبی دنیا میں ان کے اس نام سے کوئی آشنا نہیں ہے۔ان کا آبائی وطن مناور ہے اور عابدؔ تخلص کرتے تھے۔ان کی ولادت 1938ء میں جموں میں ہوئی۔عابدؔ کو اور ہونہار شاعروں کی طرح بچپن سے ہی شعروشاعری کا بے حد شوق تھا۔عابدؔ شروع میں عرشؔ صہبائی کی صحبت میں رہے لیکن بعد میں جوشؔ ملسیانی کے دامن ادب سے وابستہ ہوگئے۔جوشؔ کو غزل کے فن اور اسالیب پر جو استادانہ قدرت حاصل تھی عابدؔ نے اس سے بھرپور استفادہ کیا۔چنانچہ وہ غزل بڑی منجھی ہوئی کہتے تھے۔میری تقی میرؔ کی طرح چھوٹی بحریں استعمال کرنے میں انھیں مہارت حاصل تھی۔اپنے استاد کے فیض کو ایک شعر میں باندھ کر خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

دھوم ہے جو کلام عابد کی
جوشؔ صاحب کا فیض پیہم ہے(۷۴)

1961ء میں ان کا پہلا مجموعہ ''بہارِ غزل'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔(اس کا انتساب عرشؔ صہبائی صاحب کے نام ہے)بعد میں ان کے دو مجموعے ''شمیم گل'' اور ''برجستہ'' کے نام سے شایع ہوئے۔عابد کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت ایک بات سامنے آتی ہے کہ وہ عرشؔ صہبائی سے کافی متاثر تھے۔عرشؔ صاحب کا یہ

شعر دیکھئے:

دل کے زخم ہرے ہوتے ہیں ساون میں
اس موسم میں غم کا میلا لگتا ہے(۷۵)

عاؔبد نے اس مضمون کو ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔ یہ شعر دیکھیں:

کیسے سوئیں برکھا رت میں عاؔبد چین کی نیند
اس موسم میں ہوجاتے ہیں دل کے زخم ہرے(۷۶)

اگرچہ عاؔبد کو گزرے ہوئے ایک عرصہ ہوچکا ہے لیکن عرؔش صہبائی کے دل میں ان کی یاد آج بھی تازہ ہے۔

یاد آتا رہے گا عاؔبد، عرؔش
ہر قدم پائیں گے کمی اس کی(۷۷)

ودیارتن عاصؔی کا شمار بھی اس عہد کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عاؔبد کی طرح عرؔش صہبائی سے بہت متاثر ہیں۔ عاصی 1939ء کو جموں میں پیدا ہوئے تھے۔ میٹرک کا امتحان پاس کیا اور زندگی کی مشغولیات میں مصروف ہوگئے۔ ان کا کلام ریاست ہی نہیں بلکہ برصغیر ہندو پاک کے کئی رسالوں میں شائع ہوا ہے۔ وہ غزل کہتے تھے اور غزل میں اپنے عہد کے فکر و فن کو سمونے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی مختلف غزلوں کے اشعار درج ذیل ہیں:

ایسا نہیں کہ یکسر دنیا سے اٹھ گئی ہو
مہر و وفا ہے اب بھی لیکن کسی کسی میں(۷۸)

اسی مضمون کو دوسرے ایک شعر میں یوں کہا ہے:

ان سے عاؔبد کو ہے امید وفا
جن کو نفرت ہے وفا کے نام پر(۷۹)

یہ انداز بھی دیکھیں:

موت اور زندگی میں ہے یہ فرق
اک حقیقت ہے اک کہانی ہے(۸۰)

موت بھی اک حیات ہے عاؔبد
موت کا کیا خوف کرے کوئی(۸۱)

عرشؔ صہبائی نے بھی اسی مضمون کو ایک شعر میں باندھا ہے:

زندگی ہے ابھرتا سورج عرشؔ

اس کو آخر غروب ہونا ہے(۸۲)

عاصیؔ کی غزل کے دو مزید اشعار دیکھئے:

ہم کو کیا کیا نظر نہیں آتا　　تنکا تنکا نظر نہیں آتا

آب و دانہ نظر نہیں آتا(۸۳)　　کون جانے کہا پہ لے جائے

جناب میکشؔ کاشمیری اور عرشؔ صہبائی کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ آپس میں دونوں کی خوب بنتی تھی کیونکہ دونوں ریڈیو سے وابستہ تھے۔ میکشؔ کا پورا نام کیلاش ناتھ کول تھا۔ 1926ء میں سری نگر میں پیدا ہوئے اور تعلیم بھی وہیں پائی۔ کلاسیکی انداز کی غزل کہتے ہیں۔ غزل کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں جن میں سے ایک غالبؔ پر کہتے ہوئے ''غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور'' کے عنوان سے روزنامہ ''خدمت'' میں شائع ہوئی۔ دوسری نظم ڈاکٹر انتظار حسین کے انتقال پر کہی جو اسی روزنامے میں شائع ہوئی۔ میکشؔ چونکہ اقبال کی تقلید میں شعر کہتے تھے اس لیے دو شعری مجموعے شائع ہونے کے باوجود اس میدان میں آگے نہ نکل سکے۔ عرشؔ نے کئی جگہ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ میکشؔ بے حد ذہین تھے۔ زبان پر گرفت حاصل تھی۔ دوسروں کی رہنمائی بھی کر سکتے تھے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ نمونہ کلام دیکھیں:

کفر و اسلام گلے ملتے ہیں باہم میکشؔ

باہم آغوش سحر و شام ہو جاتی ہے(۸۴)

''بال عنقا'' اور ''شہپر طاؤس'' ان کے دو شعری مجموعے ہیں۔ ''بال عنقا'' سے ماخوذ یہ اشعار بطور خاص ملاحظہ کیجئے:

میں آدم زاد ہوں ہندو نہ مسلم　　یہی ہے مختصر میری کہانی

مجھے جبرئیل نے اڑنا سکھایا　　عنادل نے سکھائی نغمہ خوانی(۸۵)

جناب نرسنگھ سہائے شوقؔ بھی اردو شاعروں کے اسی عہد سے وابستہ تھے۔ پورے آداب و سلیقے سے شعر کہتے تھے۔ 1900ء میں جموں میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق جموں کے راجپوت چوہان فرقے سے ہے۔ ان کے بزرگ دہلی سے جموں آکر آباد ہو گئے تھے۔ شعر و سخن کا ذوق بچپن سے ہی رہا ہے۔ ان کا کلام اکثر لاہور

کے اخباروں جیسے ''پرتاب''، ''ملاپ''، ''سدرشن'' وغیرہ میں شائع ہوتا رہا۔ان کا مجموعۂ کلام ''گلدستے'' کے نام سے شائع ہوا،لیکن اب نایاب ہے۔ پرانی شاعری کے دلدادہ تھے،شاید اسی سبب سے ان کی شاعری میں روایت کا رنگ چڑھا ہوا نظر آتا ہے۔مثلاً یہ اشعار دیکھیں:

دل کی یہ آرزو کہ کرے سجدہ بار بار
کعبے سے کم نہیں ہے تیرا آستاں مجھے
کس وقت آ کے بیٹھے ہو سننے کو حال دل
جب بھول ہی گئی ہے میری داستاں مجھے(۸۶)

شوؔق نے قومی نظمیں بھی کہی ہیں جن میں نوجوانوں کے حوصلوں کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ایک نظم کے شعر:

سلف کے کارناموں کی ایک نئی داستاں تم ہو
شجاعت کر رہی ہے ناز جس پر وہ جواں تم ہو
تمہاری جانثاری کا کرے گی تذکرہ دنیا
بہت میٹھی بہت دلکش وطن کی داستاں تم ہو(۸۷)

اندر جیت لطفؔ بھی عہد عرشؔ صہبائی کے ایک اچھے شاعر گزرے ہیں۔لطفؔ کی ولادت 1942ء میں گوندالاں والا (پاکستان) میں ہوئی۔لیکن تقسیم وطن کے بعد وہ مستقل طور پر جموں میں منتقل ہوگئے۔ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔زمانۂ کالج میں شعر گوئی میں بھی دلچسپی لینے لگے۔کالج چھوڑنے کے بعد فلم کے لیے لکھنے کی بھی کوشش کرتے رہے لیکن کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔جب لاہور میں تھے تو مجازؔ اور ساحرؔ لدھیانوی کے ساتھ صحبتیں رہیں۔

لطفؔ غزل گو شاعر ہیں بلکہ اس عہد کے اچھے غزل گو شعرا میں انھیں بھی شمار کرنا چاہیے۔وہ بڑی پختہ اور استادانہ غزل کہتے تھے۔ان کے چچا دیس راج یکتا بھی اردو کے اچھے شاعر تھے۔ان کی غزلوں کا مجموعہ ''بربط دل'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دوستوں کی نوازشیں ہیں کہ اب   دردِ دل اپنا کم نہیں ہوتا
کس قدر بدنصیب ہوتے ہیں   جن پہ ترا ستم نہیں ہوتا(۸۸)

غزل کے چند اشعار دیکھئے:

دل تجھے ڈھونڈتا ہے ایسے پریشان ہو کر
رکھ کے کچھ چیز کہیں بھول گیا ہو جیسے
بزم طرب میں لطف کے آنے کی دیر تھی
دیکھا اسے تو رقص میں پیمانے آگئے(۸۹)

جناب طالبؔ ایمن آبادی صاحب کا شمار بھی ریاست کے ممتاز شعرا میں کیا جاتا ہے۔ آپ 1922ء میں گوجراں والا کے قصبہ ایمن آباد (جو ابھی پاکستان کا حصہ ہے) میں پیدا ہوئے۔ تقسیم وطن کے بعد جموں میں مقیم ہوگئے۔ طالبؔ کا اصلی نام چندن پرکاش نندہ ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی شعر کہنا شروع کردیئے تھے۔ غزل کہتے ہیں لیکن بہت چند نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی غزلوں میں موجودہ دور کا درد و کرب صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ غزل کہنے کا ان کا اپنا مخصوص انداز ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یوں آئے جھٹکے پت جھڑ کے — اہل گلستاں کے دل دھڑکے
چین نہ پایا جن سے بچھڑ کے — ہائے وہ کیسے لوگ تھے طالبؔ(۹۰)

عرشؔ صہبائی طالبؔ صاحب سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ عرشؔ صہبائی کے کلام میں کئی جگہ ایسے اشعار ملتے ہیں۔ غزل کا ایک مقطع دیکھئے:

عرشؔ جب اس میں ہوں طالبؔ سے سخنور شامل
کیوں نہ ہو حلقۂ احباب پر پھر ناز مجھے(۹۱)

غلام محمد ملک شوریدہؔ کاشمیری جناب عرشؔ صہبائی کے ہم زمانہ شاعروں میں ایک اہم شاعر ہیں۔ غلام محمد ملک نام اور شوریدہؔ تخلص تھا۔ 1924ء میں شوپیاں (کشمیر) کے ایک زراعت پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔ اے اور علی گڑھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ محکمۂ تعلیم میں استاد کے عہدے پر فائز ہوئے اور بعد میں ریاست کے مختلف کالجوں میں اردو پڑھاتے رہے۔ 1991ء میں ان کا انتقال ہوا۔

شوریدہؔ شعر میں بڑا انہاک رکھتے تھے اور سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں انداز کا کلام کہنے پر دسترس رکھتے تھے۔ ان کی شاعری یہاں ایک طرف روایت اور کلاسیکی رجحان کی پیروی کرتی ہے تو دوسری طرف وہ اپنے

گرد و پیش کے واقعات و حالات سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔قدامت پسندی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں جدت پسندی بھی پائی جاتی ہے۔شوریدہ کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''جوش جنوں'' 1981ء میں شائع ہوا۔ ٹھیک پانچ سال بعد ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''جذب دوراں'' منظر عام پر آیا۔شوریدہ کو اپنے وطن کشمیر سے بیحد محبت تھی۔انھوں نے اس کے حسین مناظر اور اس کے حسن کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔''ڈل کا منظر''، ''باغ نشاط'' اور ''ڈاوچاند'' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔

حجابات تعصب کاش ہٹ جائیں نگاہوں سے
ہنر میں عیب ظاہر، عیب میں ہوگا ہنر پیدا
تگ و تاز جنوں، اے دل نہیں، محدود صحرا تک
مکان و لامکاں میں بھی کر اپنی رہ گزر پیدا
شہود و غیب کے جلوے نظر آئیں گے شوریدہ
جو ہو داغ جگر، سودائے سر، ذوق نظر پیدا (۹۲)

مزاح اور شوخی بھی شوریدہ کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔یہ اشعار دیکھئے:

سوز پنہاں سے دل کباب ہوا آشیانہ ترا خراب ہوا
حسن نظارۂ سوز نے مارا بے حجابی میں بھی حجاب ہوا
ہائے وہ اولیں نگاہ کہ جب دل میں برپا اک انقلاب ہوا (۹۳)

پرتپال سنگھ بیتاب صوبہ جموں میں اردو نظم گو شعرا کے حوالے سے ایک اہم نام ہے۔پرتپال سنگھ کا آبائی گاؤں کھڑی دھرم سال پونچھ (جموں) ہے۔یہ گاؤں ہندو پاک کی سرحد کے قریب ہے۔تقسیم وطن کے بعد ان کا خاندان سے یہاں سے ہریانہ کے شہر انبالہ منتقل ہوگیا۔یہیں مورخہ 22 جولائی 1949ء کو بیتاب کی پیدائش ہوئی۔ان کی دسویں تک تعلیم پنجاب کے ضلع فیروز پور چھاؤنی میں ہوئی۔1965ء میں ان کا خاندان وہاں سے پھر جموں میں منتقل ہوا اور پھر ہمیشہ جموں میں ہی رہائش پذیر ہوگیا۔لیکن ایک بیوروکریٹ کی حیثیت سے مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے بعد وہ ان دنوں ممبئی جیسے مہانگر میں رہ رہے ہیں۔اردو شعر و ادب سے سے جنون کی حد تک لگاؤ رکھنے والے پرتپال سنگھ بیتاب عہد حاضر کے اہم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں اور آج جموں شہر کے علاقہ تریکوٹا نگر میں رہائش پزیر ہیں۔

بیتابؔ کی نظموں بالخصوص آزاد نظموں میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا خوب رنگ و آہنگ ملتا ہے۔ ان کے سات شعری مجموعے ہیں۔ جن کے نام ''پیش خیمہ''(1980)، ''سراب در سراب''،(1984)، ''خود رنگ''(1995)، ''کیکٹس اور گلاب''(1997)، ''دی تھرڈ اسٹنڈرڈ'' (انگریزی 1999)، ''موج رنگ'' (2003)اور''فلک آثار''(2013)منظر عام پر آ چکے ہیں۔ بیتابؔ کی آزاد نظموں کا اختصاصی پہلو یہ ہے کہ وہ محدود فکری دائروں میں سفر نہیں کرتیں بلکہ زندگی اور مسائل زندگی کی مختلف جہات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں ان کی ایک نظم ''شناخت ایک المیہ'' پیش خدمت ہے جو توجہ طلب ہے۔

غلاموں کے نگر میں
کس لیے پیدا ہوا میں
میرے اندر
لوازم وہ سبھی موجود ہیں
آزاد ہونے کے لیے جو ہیں ضروری
کبھی میں سوچتا ہوں
چھلانگ ایسی لگاؤں
کہ اس بستی سے اس بستی میں پہنچوں
مگر ایسا کہاں ہوتا ہے مجھ سے
اپنے کالے رنگ کو
ان گوری بستی والوں میں
کیسے کروں شامل
کہ جو کہتے ہیں
کالے گورے سب ہیں ایک برابر
وہ مجھ کو
میرے کالے رنگ سے پہچانتے ہیں(۹۴)

بیتابؔ کی غزل گوئی کو بھی کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی غزلوں کے یہ اشعار بطور خاص:

سبھی ہیں اپنی ہی خوش فہمیوں میں بیتابؔ
یہاں کسی سے کوئی بدگماں نہیں ہوتا(۹۵)

حادثوں کے شہر میں ایک حادثہ یہ بھی ہوا

اک شیشہ آ گیا ہے پتھروں کے سامنے(۹۶)

غلام رسول ناز کیؔ بھی عہد عرش صہبائی کے ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔ ناز کیؔ کا اسم نسبت کشمیر کے ایک بزرگ سادات، میر نازک قادری کے واسطے سے ہے جو حضرت شیخ حمزہؒ کے زمانے کے کچھ بعد کشمیر آئے تھے۔ ناز کیؔ کے والد بزرگوار انہیں کی اولاد میں سے تھے۔ ناز کیؔ صاحب ضلع بانڈی پورہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ماڈر میں 1910ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب عربی و فارسی کے مشہور عالم تھے۔ انھیں کی تربیت سے نازکی کی طبیعت کو علم و ادب سے لگاؤ پیدا ہوا۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے ہی تھا اور ابتدا میں اپنا کلام اخبار''ہمدرد'' اور کئی دوسرے اخباروں میں ''غنی کاشمیری'' کے قلمی نام سے شائع کرتے تھے۔ 1948ء تک اتنا کلام اکٹھا ہو گیا تھا کہ ایک مجموعے کی صورت میں جو''دیدہ تر'' سے موسوم ہے مرتب کیا گیا اور 1949ء میں نازکی صاحب کے ایک عزیز دوست محمد میر طاؤس کے تعارف کے ساتھ شائع کیا گیا۔

ناز کیؔ نے اردو شاعری کی مختلف اصناف سخن غزل، نظم، رباعی، مرثیہ، قطعہ اور نعت میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں معیاری شاعری تخلیق کی ہے۔ ناز کیؔ صاحب کو اصناف شاعری میں جس صنف سے زیادہ دلچسپی تھی وہ قطعہ تھی۔ انھوں نے اس صنف میں اچھا اور معیاری کلام کہا ہے جو اردو شاعری میں ان کی مقبولیت کا ایک اہم جز ہے۔ قطعہ ہی نہیں نازکی صاحب کو غزل کے فن پر عبور حاصل تھا۔ بقول عبدالقادر سروری:

> غلام رسول ناز کیؔ وادیٔ کشمیر کے کہنہ مشق شاعروں میں سے ہیں اور اردو زبان میں اظہاری نزاکتوں کے شعور بیان کے انداز پر قدرت نے انھیں اساتذہ کے مرتبہ پر پہنچا دیا ہے۔ اساتذۂ اردو کی روایات سے وہ وفا شعار پابند ہیں۔ اسی لیے غزل کی صنف زیادہ تر ان کی فکر کا محور رہی ہے۔ لیکن ان کی غزل نئے عہد کی غزل ہے۔ جس میں ہمارے اپنے عہد کی فکر کا شعور موجود ہے۔ میر کی سادہ بیانی کا پرتو اگر کشمیر کے کسی سخن سنج کے کلام میں نظر آتا ہے تو وہ نازکی ہیں۔(۹۷)

ناز کیؔ صاحب کی شاعری ایک غم انگیز پکار ہے بلکہ یوں کہئے کہ ایک دکھی دل کی پکار ہے۔ اس میں غم کا خوشگوار تصور موجود ہے۔ ناز کیؔ کے یہاں غم کا تصور اس قدر کارفرما ہے کہ ان کے نزدیک غم ہی بندہ، غم ہی مولا ہے۔ حقیقت میں ان کی غم سے مراد عبادت ہے۔ غم کا ایک انوکھا تصور ان کی شاعری میں موجود ہے جو نہ انسان کو فرار پر مجبور کرتا ہے اور نہ اسے بے عملی کی طرف مائل ہونے دیتا ہے۔ ناز کیؔ کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

محبت زندگی، اور زندگی غم ہوجاتی ہے

خوشی تحلیل ہو کر غم میں مدغم ہوجاتی ہے(۹۸)

''دیدہ تر'' نازکی صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو قطعات، غزلیات اور نظموں پر مشتمل ہے۔ قطعات چومصرعہ ہیں اور ان میں نازکی کو ایک امتیاز حاصل ہو گیا ہے۔ نازکی کا ایک قطعہ ہے جس میں انھوں نے جوانی کی حقیقت واضح کی ہے۔ کہتے ہیں:

کون کہتا ہے فانی ہے جوانی　　　کون کہتا ہے اس کو جاودانی

بڑی الجھی ہوئی ہے یہ کہانی　　　نہ آگا اس کا ملتا ہے نہ پیچھا(۹۹)

''دیدہ تر'' کے علاوہ نازکی صاحب کے دو اور مجموعے ''متاع فقر'' اور ''چراغ راہ'' کے عنوان سے منظر عام پر آئے ہوئے ہیں۔ ''چراغ راہ'' میں صرف ان کا نعتیہ کلام شامل ہے۔ نازکی صاحب اردو اور فارسی دونوں شعری روایات میں اچھا عرفان رکھتے ہیں۔ ان کی غزل کی سرحد کہیں کہیں نظم سے جاملتی ہے۔ لیکن غزل میں بعض جگہ گہرے طنز سے نازکی کی شاعری میں ایک انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے۔ غزل کا یہ شعر دیکھئے:

اب کس کو یقین آئے جو چیز ہے فانی ہے

پیغام محبت ہے اور ان کی جوانی ہے(۱۰۰)

غلام رسول نازکی کی شاعری پچاس سے ساٹھ سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ گزشتہ تیس برسوں میں جو شاعری ہوئی ہے اس میں ان کی پرچھائیاں صاف نظر آتی ہیں۔ نازکی کلاسیکی شاعری کے پاسدار ہیں، ساتھ ہی ان کی شاعری میں مختلف مسائل و معاملات بھی در آئے ہیں۔ ان کے کچھ اور اشعار پیش ہیں:

خواب عدم سے جاگنے والوں کی بے بسی

آنکھیں ہی مل رہے تھے کہ پھر رات ہوگئی(۱۰۱)

آسماں برسر پیکار ہے نظریں نہ چرا

یہ زمیں خوں کی پیاسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ(۱۰۲)

مرزا محمد یسیںؔ بیگ کا شمار بھی ریاست جموں وکشمیر کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کا وطن جموں ہے اور 1943ء میں جموں شہر کے محلّہ امفلہ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ جموں میں تعلیم حاصل کی۔ بی۔اے کرنے کے بعد کشمیر میں کلچرل اکادمی کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ اکادمی کے کتب خانے کا انتظام ان ہی کے سپرد تھا۔ ان کے ادبی ذوق کا ایک سبب یہ کتب خانہ بھی ہے۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ آپ نے

افسانے بھی کہے ہیں لیکن شعر و شاعری میں آپ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''شاخ صنوبر کے تلے'' 1967ء میں منظر عام پر آیا تھا جس میں 23 رنظمیں مختلف عنوانات پر لکھی ہوئی شامل ہیں۔ان میں آزاد نظمیں بھی شامل ہیں۔جن میں کئی نظموں کا موضوع کشمیر سے متعلق ہے۔''شگوفے''،''زرد پتے''، ''شاخ صنوبر کے تلے'' اسی نوع کی نظمیں ہیں۔بعض نظموں میں انھوں نے اپنے عہد کے شعری موضوعات کو بھی برتنے کی کوشش کی ہے اور بعض نظموں میں نئے رجحانات کو بڑی خوبی کے ساتھ برتا ہے۔

مرزا محمد یسیٰن بیگ کے دو اور شعری مجموعے ''دہر آشوب'' 1991ء میں اور ''للولکیر'' 1994 بھی شائع ہو کر قارئین سے داد حاصل کر چکے ہیں۔ان کے مجموعوں میں دیگر اصناف کے مقابلے میں غزلوں اور نظموں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔ان کے غزلوں کے چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

مجھ کو ہر شخص یہاں آئینہ گر لگتا ہے　　شہر بے رنگ میں رہنے کا اثر لگتا ہے

اپنے اندر جو اترتا ہوں تو ڈر لگتا ہے　　زخم ہی زخم ہیں ویرانی ہی ویرانی ہے

کبھی رزم گاہ حیات میں ذرا دل بچایا تو سر گیا

جو کمال ضبط کی فکر کی تو مال ذوق نظر گیا(۱۰۳)

مرزا محمد یسیٰن بیگ نے اپنی ساری توجہ غزل اور نظم پر رکھ کر ریاستی سطح پر جدید شعرا میں انفرادی مقام حاصل کیا ہے۔ان کی ایک نظم ''انقلاب'' کے عنوان سے ہے۔یہ مختصر سی سڈول نظم ہے جس میں دبا دبا طنز ہے۔یہاں نظم کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

یہ کل کی بات ہے جب دوستوں کی محفل میں
وہ انقلاب و تغیر کی بات کرتا تھا
سکڑتی کانپتی سڑکوں کے تنگ دامن میں
ٹھٹھر ٹھٹھر کے بسر ساری رات کرتا تھا
پر آج جب اسے دولت کی سرخروئی ملی
وہ انقلاب تغیر کی بات بھول گیا(۱۰۴)

حکیم منظور بھی ریاست جموں و کشمیر کے سر برآوردہ شاعر ہیں۔اصل نام محمد منظور تھا لیکن حکیم منظور کے نام سے شہرت رکھتے تھے۔14 راکتوبر 1937ء کو ان کی ولادت کشمیر (سری نگر) کے ایک محلّہ آخون صاحب

گوجوارہ کے ایک آسودہ حال گھرانے میں ہوئی۔ حکیم منظورؔ کا نام اس وقت اچھے غزل گوشاعروں میں شمار ہوتا ہے اور اس صنف سے انھیں طبعی لگاؤ بھی ہے کیونکہ ان کے گھر کا ماحول بھی ادبی تھا اور اس پر ان کے ادبی ذوق کی اور بھی پذیرائی ہوئی جب قابل اعتماد اور شفیق اساتذۂ کرام کی رہنمائی انھیں حاصل ہوئی۔ ان کی طبیعت میں آمد کے بجائے آورد زیادہ جلوہ گر ہے۔ شاید اسی لیے ان کی غزل میں فنی جھول نہیں پائے جاتے۔ ریاست جموں وکشمیر کی ادبی وشعری سرگرمیوں میں ان کا برابر حصہ ہے۔ وہ کسٹوڈین جنرل کے دفتر میں ملازم ہیں اور ملازمت کے تعلق سے انھیں چھ مہینے جموں اور چھ مہینے سری نگر میں گزارنے کا موقع ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ریاست کے دونوں حصوں جموں اور سری نگر کے ادبی نشستوں میں انھیں بارہا دعوت پیش کی جاتی ہے۔ جموں کی بزم فروغ اردو اور ایک آدھ اور بزم کے وہ صدر بھی رہ چکے ہیں۔

حکیم منظورؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''ناتمام'' 1977ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے گیارہ شعری مجموعے منظر عام پر آئے جن کے عنوان ''لہولمس'' (1982)، ''برف راتوں کی آگ'' (1990)، ''خوشبو کا نام نیا'' (1991)، ''پھول شفق آنگن کے'' (1993)، ''شعر آسمان'' (1997)، ''صبح شفق تلاوت'' (1998)، ''برف آفتاب'' (2000)، ''سخن برف داؤ'' (2003)، ''قلم زبان شگاف'' (2005) سب ان کے اردو شعری مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے دو کشمیری شاعری کے مجموعے بھی منظر عام پر آئے ہیں جن کے عنوان ''مے چھوورتن تے'' (1988)، ''پیومے بالہ رس'' (2000) ہیں۔ مذکورہ بالا اردو شعری مجموعوں میں ''پھول شفق آنگن کے'' اور ''برف آفتاب'' دونوں کے خالص نظموں کے مجموعے ہیں۔ ان کی دیگر شعری اصناف میں غزل، قطعہ، رباعی وغیرہ شامل ہیں لیکن غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ اگر چہ حکیم منظورؔ کی طبیعت میں بجائے آمد کے آورد کا عنصر زیادہ ہے پھر بھی ان کی غزلوں میں اسلوب اور موضوعات دونوں میں روایت پسندی بہت کم ہے، یہ نئے عہد کی غزل ہے جس کا رجحان حقایق اور اخلاقی قدروں کا آئینہ دار ہے۔ کچھ استعارے وہ اپنے انداز سے برتتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار پیش ہیں:

خدا کے نام یہ جو چھوڑتے ہیں اپنی ناؤ
یہ دیکھتے نہیں دریا کا کس طرف ہے بہاؤ

وفا و مہر و محبت، خلوص دل منظور
یہ کھو گئے ہیں کہاں آج کل کوئی تو بتاؤ

اب زمانے میں وفا کی کوئی بو باس نہیں
ہم کہاں جاتے ہیں اس کا کوئی احساس نہیں
اور کچھ ہوگا وہ، انسان نہیں ہوسکتا
جس کو انسان کی قدروں کا کوئی پاس نہیں (۱۰۵)

ڈاکٹر نصرتؔ چودھری ریاست جموں وکشمیر کی ایک اہم خوش مزاج اور نرم گفتار شاعرہ ہیں۔ نصرتؔ کا نام نصرتؔ آرا چودھری ہے۔ ادبی دنیا میں نصرت چودھری کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ لیکن گھر میں ماں انھیں ''نوشی'' کے نام سے بھی پکارا کرتی تھیں۔ نصرت کی پیدائش 18/مارچ 1953ئمیں مائسمہ بازار لال چوک (سری نگر) میں ہوئی۔ نصرتؔ چودھری نے 1981ئمیں ایم۔ اے اردو کا امتحان درجۂ اول میں کشمیر یونیورسٹی سے پاس کیا۔ اسی یونیورسٹی سے ایم۔ فل کی ڈگری 1982ء میں حاصل کی جس میں ان کا موضوع ''فیض احمد فیضؔ اور جدید شعری ذہن'' رہا۔ نصرتؔ کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا موضوع ''فیضؔ کی شاعری روایت اور انفرادیت'' رہا جس کی ڈگری نصرت کو 1986ئمیں تفویض کی گئی۔

نصرتؔ چودھری کی شادی شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی کے ایک قابل اور معزز استاد پروفیسر ضیاء الدین (پروفیسر ظہور الدین کے چھوٹے بھائی) 16/اکتوبر 1982ء میں ہوئی۔ نصرت آرا چودھری کی شاعری میں جمالیات، رومانیت اور نئی حسیت کے پرتو دکھائی دیتے ہیں۔ نصرت کے کلام کا مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' کتابی صورت میں دستیاب ہے جس میں زیادہ تر ان کی آزاد نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ایک عورت ہونے کی حیثیت سے ان کی غزلیں اور نظمیں زیادہ تر نسوانی جذبات واحساسات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک عورت ہر حال میں قیدی ہے جو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ نصرتؔ چودھری کی نظموں میں ایک تنوع اور پرکشش انداز میں موجود ہے۔ ''ہتھیلی کا چاند''، ''زندگی''، ''سفر آئینے کا''، ''خودفریبی''، ''وفا''، ''خالی کلائی''، ''سل''، ''آرزو''، ''قیدی لمحے''، ''یاد کا چاند''، ''چپ کے مکانوں کے قیدی'' ایسی نظمیں ہیں جو انسانی زندگی اور اس کی نفسیات کو آشکار کرتی ہے۔ ان نظموں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قاری سے ہم کلام ہوتی ہیں اور زندگی کے نگارخانے کی سیر کراتی ہیں۔ نصرتؔ نے اپنی بہت سی نظموں میں نسوانی کرداروں کی شکست وریخت کو نظمایا ہے۔ ان کی نظم ''خالی کلائی'' کا کچھ حصہ ملاحظہ فرمائیں:

اس رات بھی میں سوئی تھی
نہ جانے رات کے کس پہر

ایک کیڑا میرے بدن کے اندر سرسرانے لگا
وہ بدن سے نکل کر
سارے جسم پر رینگنے لگا
میں ڈر گئی
بدن کے مساموں سے ایک بے چین لہر اٹھی
پھیلتی ہوئی چکراتی ہوئی
اور میں خوف سے پگھل کر
ایک سمندر بن گئی
ایک بیکراں سمندر
مگر وقت کے اجنبی ساحل پر
جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا
میری کلائی خالی تھی
نہ جانے کس پل
میری چوڑیاں ٹوٹی تھیں
اور اب میں اپنی خالی کلائی کو دیکھ کر
سوچ رہی ہوں (۱۰۶)

نصرتؔ کی نظم ہی نہیں بلکہ اپنے تمام کلام میں اس نے اپنے نسائی لب و لہجے اور واردات قلبی کے اظہار سے ایک مظلوم اور بے بس عورت کی داستان پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نصرتؔ کی غزلوں کے چند اشعار بطور خاص ملاحظہ کیجئے:

ان سے مل پاؤں کبھی ایسا اشارہ مانگوں
میں سمندر میں کھڑی ہو کے کنارہ مانگوں
لمحہ لمحہ مجھے سولی پہ چڑھانے والو
تم سے کس منہ سے میں جینے کا سہارا مانگوں
احساس کی رگوں سے ٹپکتا رہا لہو
ہم کو کسی سے پیار دوبارہ نہ ہو سکا

میں شمع انتظار فروزاں کیے رہی
چاہت کا اس طرف سے اشارہ نہ ہو سکا(۱۰۷)

نصرتؔ خود اپنی شاعری کے متعلق یوں لکھتی ہیں ''میں عورت ہوں اسی لیے میری شاعری کے بیشتر حصے میں ایک عورت کا کرب ہے، اس کا دکھ ہے۔''(۱۰۸)

جناب عرشؔ صہبائی کے تمام ہم عصر شعرا کا تفصیلی جائزہ پیش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ یہ ایک طویل موضوع ہے جو توجہ طلب بھی ہے اور اپنے ابعاد کے لحاظ سے تقریباً پینسٹھ سالہ شعری منظر نامے کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے چونکہ جناب عرشؔ کا زمانہ آزادیٔ ہند سے قبل سے لے کر تا حال کے عرص پر محیط ہے۔ اس لیے ان کے باقی ہم عصر شعرا کے تفصیلی جائزے کو یہاں مضمون کی طوالت کے سبب یہاں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس طویل عرصے میں ریاست جموں و کشمیر اردو شاعری میں اپنا نام پیدا کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ظاہر ہے اتنے طویل سفر کی شعریات و شاعروں کی خدمات کو مکمل احاطۂ تحریر میں لانا ہو تو پوری ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہاں اختصار سے کام لیتے ہوئے میں نے عرشؔ صہبائی کے ہم عصر شعرا میں سے کچھ کا انتخاب کر کے ان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عرشؔ صہبائی کے ہم عصر دیگر شعرا کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جن میں گردھاری لال آنند تمناؔ، غلام شیخ علی بلبلؔ، سیف الدین سیفیؔ سوپوری، غلام احمد فاصلؔ کاشمیری، غلام محمد طاؤسؔ، تنہاؔ انصاری، شہزورؔ کاشمیری، خموشؔ سرحدی، فاروق نازکیؔ، شیولال رینہ آزادؔ، اکبرؔ جے پوری، ڈاکٹر کاشیؔ ناتھ پنڈت، لیشؔ شرما، حامدیؔ کاشمیری، پرتھوی راج خمارؔ، منظورؔ ہاشمی، قیصرؔ قلندر، سید اکبرؔ ہاشمی، محمد امین کاملؔ، عبدالرحمٰن خمارؔ، مرغوبؔ بانہالی، فرحتؔ گیلانی، راجیشؔ گوہرؔ، بال کرشن ساگرؔ، ہمدمؔ کاشمیری، محمود حسن محمودؔ، رہبرؔ جدید، راج کمار ابرولؔ، مسعود حسنؔ مسعود، قاضی غلام محمدؔ، وجے سمنؔ سوسن، نشاطؔ انصاری، ایرجؔ کاشمیری، یوسفؔ رشی، مہندرؔ رینہ، رفیق رازؔ، خالدؔ بشیر، خورشید بسملؔ، ایاز رسول نازکیؔ، عشاقؔ کشتواڑی، احمدؔ شناس، ساغرؔ سحرائی، بشیرؔ بدر، فریدؔ پربتی، خالد کرارؔ، رفیق انجمؔ، بلراجؔ بخشی، خوشویر سنگھ شادؔ، منیبؔ الرحمٰن، پرویزؔ مانوس، شاذ شرقی، فاروق منظر، شام طالبؔ، امینؔ بانہالی، آسؔ بھدرواہی، رحمتؔ بانہالی، اشرفؔ آثاری، غلام نبی ناظرؔ، تنویرؔ بھدرواہی، یاسینؔ بیگ، ظفرؔ اقبال، عادلؔ منصوری، پریمیؔ رومانی، ڈاکٹر کرنؔ سنگھ کرن، رخسانہؔ جبیں، ترنمؔ ریاض، شبنمؔ عشائی، شفیقہ پروینؔ، سلمٰیؔ فردوس، غلام جیلانیؔ، عبدالجبار زائرؔ بھدرواہی، تحسینؔ جعفری، لیاقتؔ جعفری، شوکتؔ فریدی، ضمیرؔ فریدی، کنول نین نکہتؔ، تبسمؔ مینائی، روبینہ میرؔ،

اکرامؔ سانبوی، عبدالرشید فداؔ راجوری، احسان الدین بیتابؔ، بالمؔ بھدرواہی، ڈاکٹر گل جبیں صباؔ، ع ع عارفؔ، فاروق انورؔ، محتشم احتشامؔ، شبیہ الحسن قیصر، تسلیم منظر، غلام نبی غافلؔ، راکیش طالبؔ، شام طالبؔ، امیر ناشادؔ، سہیلؔ صدیقی، نازؔ نظامی، شبیرؔ راتھر اور پیارے ہتاشؔ وغیرہ کے اسمائے قابل ذکر ہیں۔

حواشی

۱۔ عرشؔ صہبائیؔ، عکس جمال، جموں، عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۷ء، ص،۶۶
۲۔ عرشؔ صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص،۶۶
۳۔ عرشؔ صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص،۱۲۵
۴۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۴ء، ص،۶۲
۵۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۰۹ء، ص،۴۹
۶۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۸ء، ص،۱۰۸
۷۔ ایضاً ص،۵۰
۸۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص،۲۷
۹۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۸ء، ص،۱۲۳
۱۰۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۴ء، ص،۱۵۴
۱۱۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص،۴۷
۱۲۔ عرشؔ صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص،۷
۱۳۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵ء، ص،۳۵
۱۴۔ ایضاً ص:۳۶
۱۵۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص،۲۱
۱۶۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵ء، ص،۳۶
۱۷۔ ایضاً ص،۳۸
۱۸۔ عرشؔ صہبائی، اسلوب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۱ء، ص،۱۱۱
۱۹۔ عرشؔ صہبائی، خدوخال، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۸ء، ص،۷

۲۰۔ عرشؔ صہبائی،عکس جمال،جموں:عرشؔ صہبائی،۲۰۰۷ء،ص،۴۴

۲۱۔ عرشؔ صہبائی، سائے تیری یادوں کے،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۰ء،ص،٦٦

۲۲۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کرن،دل کے خواب ادھورے سے،کٹھوعہ (جموں کشمیر):مرکز تصنیف وتالیف،۲۰۱۴ء،ص،۹

۲۳۔ عرشؔ صہبائی،تجھ بن چین کہاں،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۰۹ء،ص،۴۱

۲۴۔ ایضاً ص،۱۰۴

۲۵۔ عرشؔ صہبائی،یہ جھونپڑے یہ لوگ،جموں: مکتبہ اردوادب،۱۹۷٦ء،ص،٦۱

۲٦۔ کرن کوشل ٹھاکر،اردوغزل کی عہد ساز شخصیت،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۳ء،ص،۱٦

۲۷۔ عرشؔ صہبائی،سائے تیری یادوں کے،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۰ء،ص،۵

۲۸۔ عرشؔ صہبائی،توازن،جموں:مانوی پبلکیشن،۲۰۰۵ء،ص،۵

۲۹۔ عرشؔ صہبائی،سائے تیری یادوں کے،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۰ء،ص،۱۰۴

۳۰۔ عرشؔ صہبائی،شبنم تیری یادوں کی،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۳ء،ص،۷۰

۳۱۔ غلامؔ جیلانی،عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی،جموں:آزاد بک ویزن،۲۰۱۵ء،ص،۵٦

۳۲۔ غلامؔ جیلانی،عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی،دلی:دیکشا پرنٹرز،۲۰۱۵ء،ص،۴۴

۳۳۔ عرشؔ صہبائی،دسترس،جموں:بزم اردوادب،۲۰۰۷ء،ص،۱۲٦

۳۴۔ عرشؔ صہبائی،ریزہ ریزہ وجود،جموں:ہندستانی آرٹ پریس،۱۹۹۵ء،ص،۴۹

۳۵۔ عرشؔ صہبائی،شکست جام،جموں: مکتبہ اردوادب،۱۹۵۸ء،ص،۵۰

۳٦۔ ایضاً ص،۱۰۸

۳۷۔ کرن کوشل ٹھاکر،اردوغزل کی عہد ساز شخصیت،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۳ء،ص،۴۷

۳۸۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال،جموں:عرشؔ صہبائی،۲۰۰۷ء،ص،٦۵

۳۹۔ کرن کوشل ٹھاکر،اردوغزل کی عہد ساز شخصیت،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۳ء،ص،۲۷

۴۰۔ عرشؔ صہبائی،سائے تیری یادوں کے،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۰ء،ص،۲۷

۴۱۔ عرشؔ صہبائی،جواز،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۱ء،ص،٦۱

۴۲۔ عرشؔ صہبائی،دسترس،جموں:بزم اردوادب،۲۰۰۷ء،ص،۱۰

۴۳۔ ایضاً ص،۱۲٦

۴۴۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵ء، ص، ۴۸

۴۵۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرش صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵ء، ص، ۱۳۲

۴۶۔ ماہنامہ شیرازہ، جلد ۵۶، شمارہ، ۳۔۴، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، ص، ۵۰

۴۷۔ سید خورشید کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر کشمیر: میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص: ۱۰

۴۸۔ عرشؔ صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۱۵

۴۹۔ سید خورشید کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر کشمیر: میزان پبلشرز، ۲۰۱۸، ص، ۱۰

۵۰۔ عرشؔ صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص، ۱۵۱

۵۱۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں،: مانوی پرکاشن، ۲۰۰۹ء، ص، ۱۱۱

۵۲۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵ء، ص، ۴۷

۵۳۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۵۶

۵۴۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۲۷

۵۵۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص، ۱۵

۵۶۔ ایضاً ص، ۸۳

۵۷۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵ء، ص ء، ۴۷

۵۸۔ عرشؔ صہبائی، چشم نیم باز، جموں: نمی ڈوگری سنستھا دی آرٹ فونڈیشن، ۲۰۰۷ء، ص، ۳۰

۵۹۔ عرشؔ صہبائی، خدوخال، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۰۹

۶۰۔ عرشؔ صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۴۷

۶۱۔ ایضاً ص: ۷۰

۶۲۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں،: مانوی پرکاشن، ۲۰۰۹ء، ص، ۱۱۱

۶۳۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں، چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص، ۵۷

۶۴۔ عرشؔ صہبائی، دسترس، جموں: بزم اردو ادب، ۲۰۰۷ء، ص، ۸۷

۶۵۔ عرشؔ صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص، ۹۱

۶۶۔ ڈاکٹر طارق سلیم خان، رساؔ جاودانی بحیثیت اردو شاعر، دہلی: انیس آفسیٹ پریس، ۲۰۰۸ء، ص، ۸۳

۶۷۔ عبدالقادر سروریؔ، کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ)، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ۱۹۸۲ء،

ص،۳۳۴

۶۸۔ ایضاً ص،۳۳۴

۶۹۔ معاصراردونظم نمبر، (ماہنامہ) شیرازہ، جلد 53، شمارہ ۸،۱۰، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ص،۸۷

۷۰۔ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ۱۹۸۴ء، ص،۱۵۱

۷۱۔ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ)، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ۱۹۸۲ء، ص،۳۵۵

۷۲۔ شیرازہ، جموں و کشمیر اردو شاعری نمبر، جلد۵۲، شمارہ ۶،۷، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ص،۱۱۴

۷۳۔ عابد مناوری، شمیم گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۷ء، ص،۱۸

۷۴۔ عابد مناوری، بہار غزل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص،۲۵

۷۵۔ عرش صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص،۵۰

۷۶۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳، ص،۱۸

۷۷۔ ایضاً ص،۳۹

۷۸۔ ایضاً ص،۴۱

۷۹۔ عابد مناوری، شمیم گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۷ء، ص،۳۲

۸۰۔ کرن کوشل ٹھاکر ، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص،۴۱

۸۱۔ عابد مناوری، بہار غزل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص،۵۷

۸۲۔ عرش صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص،۶۷

۸۳۔ شیرازہ، جموں و کشمیر اردو شاعری نمبر، جلد ۵۲، شمارہ ۶،۷، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ص،۱۹۵

۸۴۔ ایضاً ص،۱۸۸

۸۵۔ ایضاً ص،۱۸۸

۸۶۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۳۵

۸۷۔ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ)، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ۱۹۸۲ء، ص، ۳۸۳

۸۸۔ شیرازہ، جموں و کشمیر اردو شاعری نمبر، جلد ۵۲، شمارہ ۶، ۷، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ص، ۱۲۱

۸۹۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۳۶

۹۰۔ ایضاً ص، ۳۷

۹۱۔ عرش صہبائی، صلیب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۱، ص، ۶۷

۹۲۔ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ۱۹۸۴، ص: ۶۹

۹۳۔ ایضاً۔ص، ۷۰

۹۴۔ شیرازہ، معاصر اردو نظم نمبر، جلد ۵۳، شمارہ ۸۔۱۰، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ص ص: ۹۶، ۹۷

۹۵۔ شیرازہ، جموں و کشمیر اردو شاعری نمبر، جلد ۵۲، شمارہ ۶۔۷، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ص، ۱۸۲

۹۶۔ ایضاً ص، ۱۳

۹۷۔ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ۱۹۸۴ء، ص، ۳۸۵

۹۸۔ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ)، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ۱۹۸۲ء، ص، ۳۸۶

۹۹۔ ایضاً ص، ۳۸۷

۱۰۰۔ ایضاً ص، ۳۸۷

۱۰۱۔ شیرازہ، جموں و کشمیر اردو شاعری نمبر، جلد ۵۲، شمارہ ۶، ۷، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ص، ۱۷۰

۱۰۲۔ ایضاً ص،۱۷۰

۱۰۳۔ ایضاً ص،۱۲۷

۱۰۴۔ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ۱۹۸۴ء، ص،۱۴۶

۱۰۵۔ ایضاً ص،۱۴۰

۱۰۶۔ شیرازہ، معاصر اردو نظم نمبر، جلد ۵۳، شمارہ ۸، ۱۰، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ص،۱۱۰

۱۰۷۔ شیرازہ، جموں و کشمیر اردو شاعری نمبر، جلد ۵۲، شمارہ ۶، ۷، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ص،۲۰۲

۱۰۸۔ تسلسل (ششماہی)، جلد ۷، شمارہ ۱۴، جموں کشمیر: شعبہ اردو جموں یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء، ص،۱۱۲

☆☆☆

باب دوم

عرشؔ صہبائی کی نظم نگاری میں روایت پسندی

روایت اور انحراف کی کش مکش تقریباً ہر نئے ادبی رجحان وتخلیق میں نظر آتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ روایت اور انحراف دونوں اپنی جگہ اہم ہیں بلکہ یوں کہیں کہ یہ ایک حقیقت کے دو پہلو ہیں۔روایت کا لفظ جو کہ عربی زبان سے نکلا ہے اور فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔روایت انگریزی لفظ Tradition کا متبادل ہے۔یہ اصطلاح وسیع تر مفاہیم کی حامل ہے لیکن ایک بات جو مشترکہ طور پر ہر زبان میں روایت سے وابستہ رہی ہے،وہ کلچر و معاشرے کے اعلی قدروں کا مفہوم ہے۔روایت کا سرچشمہ تہذیب و تمدن ہے اور تہذیب وتمدن سماج سے وابستہ ہے۔اس لئے روایت پر سماج کی تحریکوں،رجحانوں،عمل اور ردعمل کا گہرا اثر ہوتا ہے۔روایت بھی سماج کے ارتقاء اور ابتدا سے وابستہ رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر دور کی مخصوص روایات ہوتی ہیں۔جن پر اس عہد کے مخصوص معاشی،معاشرتی،تہذیبی،تعلیمی اور سیاسی حالات کا اثر پڑتا ہے۔روایات ادب اور سماج کے درمیان ایک ربط پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں۔کیوں کہ ان کا وجود انسان کی افتادِ طبع اور ذہنی رجحانات سے ہوتا ہے۔روایات کی بدولت ہی انسان ادب کو اپنا قومی اور نسلی سرمایہ سمجھتا ہے۔ادب پر ان کے اثرات بھی مختلف زاویوں سے ہوتے ہیں۔جغرافیائی اعتبار سے جو اثرات میدانوں پر ایک عظیم الشاں پہاڑ کے ہوتے ہیں وہی اثرات روایات ادب پر مرتب کرتی ہیں۔چونکہ ہمارے اس باب کا موضوع ''عرشؔ صہبائی کی نظم نگاری میں روایت پسندی'' ہے اس لئے روایت کے مفہوم و معنی اور ادب میں روایت کی اہمیت کو اجاگر کرنا ضروری محسوس ہوا۔اس باب میں ہم عرشؔ کی خالص نظم نگاری ہی نہیں بلکہ ان کے دوہوں اور قطعات میں روایت پسندی کو واضع کرنے کی کوشش کریں گے۔جہاں ان کی نظمیں اردو کے ادبی سرمائے میں اہمت رکھتی ہیں،وہیں ان کے کہے ہوئے دوہے اور قطعات بھی اردو کی ادبی روایت میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

عرشؔ صہبائی ریاست جموں وکشمیر کے سب سے زیادہ مقبول ومنفرد شاعر تھے۔دور جدید میں ان کی

شاعری ایک روایت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے لیکن جس وقت عرشؔ اردو شاعری کے افق پر نمودار ہوئے وہ کم و بیش ایسا دور تھا، جب صدیوں سے چلی آ رہی روایت کو فراموش کر کے نئے تجربات کو اہمیت دی جا رہی تھی۔اس زمانے میں عرشؔ ایک پل بن کر سامنے آئے جو روایت کی سنگلاخ چٹانوں کو تجربات کی پر خار وادی سے ملاتا ہے۔انہوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں وافر کلام پیش کیا ہے جس میں کلاسیکیت سے جدیدیت تک کے انداز و اسلوب پائے جاتے ہیں۔یہی نہیں انہوں نے بھی اردو کے اکثر شعراء کی طرح زیادہ توجہ غزل پر ہی دی ہے اور اس میں اپنے فنی جوہر کی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ان کی نظموں کو دیکھئے کہ بہ یک وقت ان کے غزلوں سے کشید کی گئی عطر کا احساس ہو جاتا ہے۔عرشؔ کی نظموں میں موسیقیت ،تنوع ،تغزل ،خیال آفرینی ، جدید حسیت ،جموں وکشمیر کے مخصوص تہذیبی ورثے کا پس منظر کیا کچھ نہیں ملتا ہے۔عرشؔ نے تجربہ پسندی اور بعض صورتوں میں بغاوت کے حاوی اور مروجہ میلانات سے گزرنے کے باوجود خود ضبطی ،توازن اور اعتدال کو روا رکھ کر اپنی جداگانہ حیثیت اختیار کی ہے۔

عرشؔ صہبائی اُردو ادب کی ایک ایسی شخصیت تھے کہ جنہوں نے اپنی تحریروں اور تخلیقات کے ذریعہ جموں وکشمیر کا ہی نہیں بلکہ اردو کا نام روشن کیا ہے۔دنیائے ادب میں انہیں ایک عظیم غزل گو شاعر کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے لیکن انہوں نے اردو کو اچھی اچھی نظموں سے بھی روشناس کروایا ہے۔یہ نظمیں محض روایتی نظمیں نہیں ہیں ان میں مناظرات قدرت اور فطرت انسانی کے جذبات خوبصورتی سے پیش کئے گئے ہیں۔وہ الفاظ کے مناسب استعمال سے معنی کی نئی جہتیں اُبھار کر پورے منظر کو ایک مصور کی تصویر بناتے ہیں۔ایسے مناظر غیر محسوس طریقے سے محسوس ہوتے ہیں۔اردو ناقدین کے لئے یہ فیصلہ کرنا از حد مشکل ہو جاتا ہے کہ عرشؔ صہبائی کی غزل اور نظم میں سے کس کا پلڑا بھاری ہے۔عرشؔ کی نظموں میں روانی اور تسلسل ہے،سادگی اور حلاوت ہے، جذبے کا خلوص ہے اور واقعیت ہے۔آپ کی نظموں میں حالیؔ کے قائم کردہ دونوں اصول موجود ہیں،ایک اس کا نیچرل اور دوسرا اخلاقی ہونا۔انہوں نے بوجھل و صقیل الفاظ کے ذریعے اپنے فن میں حسن پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ روزمرہ کے سادہ الفاظ کو بڑی فنکاری سے استعمال میں لایا ہے۔ان کے کلام میں سوز و گداز بھی ہے اور کسک بھی ہے۔انہوں نے جس خیال کو بھی اپنے ہاں نظم کیا ہے وہ ان کے دل کی گہرائیوں سے تپ کر نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

عرشؔ صہبائی کی نظموں میں آزادؔ کی سی سجاوٹ اور تمثیل نگاری نہیں ہے بلکہ ان کی نظمیں شعریت اور جذبے سے لبریز ہیں۔شبلیؔ کی طرح خیال ان کی نظموں کا جزو اعظم ہے جو ان کی نظموں کو ترقی کی منزلوں کی اور

لے جاتا ہے۔عرشؔ کی نظموں کے خاص موضوعات سیاسی، سماجی، ملکی اور قومی زندگی کے مسائل ہیں مگر ان کی نظموں میں جذبے کی شدت ہر جگہ نمایاں نہیں ہے۔انہیں حالات سے سمجھوتہ کرنا آتا ہے، وہ بغاوت پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔عرشؔ نے دوسرے شعرا سے الگ ہٹ کر نظموں میں سنجیدگی کے بجائے کہیں کہیں مزاح کا رنگ اختیار بھی کیا ہے۔مغربی تہذیب پر انہوں نے کھل کر چوٹیں کیں لیکن یہ چوٹیں لفظی بازی گری کا نمونہ معلوم ہوتی ہیں۔ان کی نظموں میں بھی اصلاحی پہلو جلوہ گر ہے، انہیں حالات وواقعات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا آتا ہے۔عرشؔ صہبائی کی نظموں میں جو مزاحیہ رنگ ہے وہ جذبے کی شدت اور بغاوت کے ساتھ ملتا ہے۔انہوں نے نظم نگاری میں سنجیدگی، خیال انگیزی اور ترتیب وتسلسل کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

عرشؔ صہبائی کی نظمیں موضوع اور فکر کے اعتبار سے اہم ہیں ان میں بعض نیچرل، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور انسان کے نفسیاتی مسائل کے محور پر بھی گھومتی ہیں۔ان کی نظمیں موضوعات کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ تسلسلِ خیال، فنی ارتکاز اور انداز بیان کی وجہ سے بھی اردو کی اہم نظمیں کہلائی جاسکتی ہیں۔عرشؔ کی نظمیں متنی اعتبار سے چھوٹی ہیں لیکن اپنے اندر بے پناہ معنوی وسعت رکھتی ہیں۔ان کی کچھ نظمیں اصلاحی بھی ہیں جن میں سادگی اور موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ بھی انہوں نے متنوع موضوعات پر کامیاب نظمیں کہی ہیں۔انہیں ورڈز ورتھ کی طرح مظاہر فطرت سے بے پناہ لگاؤ تھا۔عرشؔ کی نظموں کے کئی خاص پہلو ہیں جن میں حقیقت نگاری، طنز، حُب الوطنی، قومی یکجہتی، حق گوئی وغیرہ پیش پیش ہیں۔

عرشؔ صہبائی نے نظمیں کم لکھی ہیں بہ نسبت غزلوں کے، لیکن جو لکھی ہیں وہ ادبی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں یہ تعداد میں تینتیس (33) ہیں اور ان میں سے زیادہ تر نظمیں ان کے مجموعے ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' میں شامل ہیں۔اس مجموعے میں ان کی نظموں کے علاوہ قطعات بھی شامل ہیں جن کی تعداد ایک سو اکتیس (131) ہے۔ ان کا یہ مجموعہ کلام 1976ء میں چاند پریس جموں سے چھپ کر منظر عام پر آیا تھا۔عرشؔ صہبائی نے اس مجموعے کے بارے میں خود یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ''میں پرم پوجیہ گوروسوامی سارشبدانند جی مہاراج کے قدموں میں سجدہ گزار ہوں جن کے آشیرواد سے میرا مجموعہ کلام منظر عام پر آسکا'' (۱)

عرشؔ صہبائی کے احباب واقارب میں بہت لوگ شامل تھے جو ان کی شعری کاوشوں کو منظر عام پر لانے میں قدم قدم پر ان کا ساتھ دیتے تھے۔ان کے ہر مجموعے کی طرح یہ بات ان کے مجموعے ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' کے شروع کے صفحات میں تحریر ہدیہ تشکر سے واضع ہو جاتی ہے جس میں ان کے احباب مہنت روی چندر

ایڈوکیٹ، جناب راجکمار پانڈو، جناب ایل آر چودھری، جناب ظفر کاظمی، جناب گردھاری لعل پنڈوئی، جناب سمر جیت سنگھ، جناب دیپ جالندھری اور جناب درشن کمار حسرت کے نام درج ہیں۔انہوں نے اپنے مجموعے ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' کا انتساب جناب بی ایل چودھری کے نام کیا ہے۔عرشؔ نے ان کی تعریف میں ایک شعر تحریر کیا جواس طرح ہے:

سوچتا ہوں کہ آپ کے احسان
ایک بارگراں نہ بن جائیں(۲)

مجموعے کا باقاعدہ آغاز ان کے اس شعر سے ہوتا ہے:

محلوں میں کیا ملے گا وفا کا سراغ عرشؔ
یہ چیز جھونپڑوں کی ہے ان میں تلاش کر(۳)

یہ شعران کی نظم ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' میں شامل ہے۔ویسے تو ان کا تمام کلام حقیقت پر مبنی ہے لیکن اس شعر میں حقیقت نگاری کا پرتو صاف واضع ہوتا ہے۔جیسا کہ ہم سب روزمرہ کی زندگی میں اکثر و بیشتر یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ محلوں میں رہنے والے زندگی کی ہر آسائش سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن ان کے عادات واطوار سے ناشکری وتکبر عیاں ہوتا ہیں۔عرشؔ اس شعر میں اسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ وفا کا سراغ لگانے والوں کو اسے محلوں میں نہیں بلکہ جھونپڑوں میں تلاش کرنا چاہیے کیونکہ آج یہ جھونپڑوں تک محدود ہوکر رہ گئی ہے اور محلوں میں اس کا مل پانا اب محال نظر آتا ہے۔یہاں دو پہلو اہم ہیں ایک طرف محلوں میں رہنے والوں پر طنزیہ نشانا ہے اور دوسری جانب جھونپڑوں میں رہنے والوں کی مدح کا عنصر نماں ہے۔

عرشؔ صہبائی کے اس مجموعے میں شامل نظموں میں نعت مخصوص، سقراۃ،ایک سوال،کھوکھلے جام بے تاب روحیں،مشورہ، احساس، جان وفا،انجام،تجدید وفا،شکوہ، جواب،نغمہ،یاد، دل، یہ تیری مست و سیہ فام غزل خواں آنکھیں، وہ دو آنکھیں، یادرفتہ، میں بنگلہ دیش ہوں ٹیگور کے نغموں کی دھرتی ہوں،ا یکتا،اے میر وطن !میرے حسین خواب کی تعبیر،نڈراور بہادر ہندوستانی سپاہیوں کے نام،سرزمین وطن،قطعہ،جہد،ہم لوگ، الیکشن نامہ،آدمی، رابندر ناتھ ٹیگوراور مجموعے کی آخری نظم ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' ہے جس کی مناسبت سے مجموعے کا نام ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' قرار پایا گیا۔عرشؔ کی ان نظموں کے علاوہ دو نظمیں ''وراثت'' اور ''نہیں ایسا نہیں ہوگا'' کے عنوان سے ان کے مجموعہ ''ریزہ ریزہ وجود'' میں شامل ہیں اور دو نظمیں ''میرے کشمیر میں''

اور ''خیال خام ہے یہ'' کے نام سے ان کے مجموعے ''شگفتِ گُل'' میں شامل ہیں۔

عرشؔ ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ اپنے دور کے معاشرے اور سماج کے بہترین شاہد اور عکاس بھی تھے۔ان کی بیشتر نظموں میں مشاہداتی فضا موجود ہے۔ان کی نظموں میں عصری حسیت پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے ان کا رشتہ ماضی اور اس کی حسین قدروں سے بھی استوار ہے۔ان کے اسلوب میں روایت اور جدت کا امتزاج ملتا ہے۔ان کی نظمیں ''سقراۃ''، ''نعمتِ مخصوص''، ''وہ دو آنکھیں''، ''وراثت''، ''میں بنگلہ دیش ہو ٹیگور کے نغموں کی دھرتی''، ''ایکتا''، ''یہ جھونپڑے یہ لوگ''، اور ''ہم لوگ'' نئے امکانات اور وسیع تر معنوی جہتوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ان کی باقی نظمیں بھی ایسی خوبیوں سے لبریز ہیں۔ان کے فن کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر طرز میں اپنا رنگ جما سکتے ہیں۔انہیں احساسات قلبی کی تصویر کھینچنے میں مہارت حاصل ہے۔یہی حال حقائق نگاری کا بھی ہے وہ جن حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں انہیں اسی حقیقت نگاری کے ساتھ شعری جامہ پہنا دیتے ہیں۔یہ بھی ان کی ایک خوبی ہے کہ وہ شاعری میں فن کو اہمیت دیتے تھے ایسا اس لئے بھی ہے کہ وہ وفاؔ، جگن ناتھ آزادؔ، فراقؔ گورکھپوری، ساحرؔ لدھیانوی، جیسی شخصیات کے ساتھ رہے ہیں اور پھر ماحول کا اثر لینا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

عرشؔ صہبائی کی مظاہر فطرت پر ایک بہترین نظم ہے جو انہوں نے اپنے مجموعے ''شگفتِ گل'' میں ''میرے کشمیر میں'' کے عنوان سے لکھ کر شامل کی ہے۔ان کا یہ شعری مجموعہ ''شگفتِ گل'' مئی 1964ء میں مکتبہ اردو ادب جموں سے شائع ہوا تھا۔ان کے اس شعری مجموعے کو حکومت جموں کشمیر کی کلچرل اکادمی نے 1961ء کی دوسری بہترین کتاب قرار دیتے ہوئے مصنف کو سات سو روپے کے انعام سے بھی نوازا تھا۔یہ عرشؔ کا دوسرا شعری مجموعہ کلام ہے۔اس میں انہوں اپنے تعارف کے متعلق کچھ بھی تحریر نہیں کیا لیکن ان کے ساتھ کام کرنے والوں میں جناب چنچل شرما نے ان شخصیت اور شاعری کے متعلق اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

> یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھے عرشؔ صہبائی کا تعارف لکھنا پڑے گا۔پہلے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھ سے ایک سنجیدہ شخص نے غیر سنجیدہ مذاق کر دیا ہو۔لیکن مجھے اس بات کا یقین بھی تھا کہ وہ شخص جو ہمیشہ دوسروں کے مذاق کا مرکز رہا ہو، کسی سے کیوں کر مذاق کر سکتا ہے۔مجھ میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ میں عرشؔ کی بات کو ٹال سکتا۔وہ ۱۹۰۰ء سے میرے ساتھ آل انڈیا ریڈیو کے ادارے میں کام کر رہا ہے۔۹ سال کا عرصہ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔لیکن میں آج تک یہ نہ سمجھ سکا کہ عرشؔ ایک اچھا انسان ہے یا اچھا شاعر۔(۴)

چنچل شرما کی رائے کے مطابق عرشؔ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت سنجیدہ اور انسانیت پرست انسان تھے۔ بہر حال ان کی نظم ''میرے کشمیر میں'' غزل کی طرز میں کہی گئی ہے۔ یہ نظم 16/اشعار پر مشتمل عرشؔ کی حقیقت نگاری اور فطرت شناسی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریاست جموں و کشمیر اپنی خوبصورتی اور قدرتی نظاروں کی بدولت ساری دنیا میں جنت بے نظیر کے نام سے جانی جاتی ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں کے لوگ اکثر و بیشتر کشمیر میں سیر و تفریح کی خاطر کشمیر میں آتے رہتے ہیں لیکن جنھوں نے کشمیر دیکھا نہیں وہ اگر عرشؔ کی نظم ''میرے کشمیر میں'' کا ہی مطالعہ کر لیں تو جہاں کا قدرتی حسن، رعنائی اور فطرت کی جادوگری ان پر آشکار ہو جائے گی۔ سرزمین کشمیر کو جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ نے قدرتی حسن سے مالا مال کیا ہے تو دوسری طرف ہزاروں سال سے یہ سرزمین علم و ادب کا ایک مشہور مرکز رہی ہے۔ یہاں تک کہ بعض قدیم ہندوؤں کا یہ اعتقاد بن گیا تھا کہ علم کی دیوی سرسوتی کشمیر میں ہی رہتی ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کی تواریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے برہمن جب اپنے بچوں کو جنیئو (زنار) پہناتے تھے تو اس وقت بچے سے کہتے تھے کہ کہو میں علم سیکھنے کے لئے کشمیر جاؤں گا، اور بچے کو شمال کی طرف چند قدم چلاتے تھے۔ اس زمانے میں کشمیر کو رشی بھومی کہا جاتا تھا۔ عرشؔ نہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اس سرزمیں کو موضوع بنایا اور نہ آخری بلکہ اردو کی شعری اور نثری روایت میں بے شمار ایسی ہستیوں نے سرزمین کشمیر کو موضوع بنا کر ادبی سرمائے میں اضافہ کیا۔ اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ یہ زمین سخنوروں کے لئے ایک محبوب موضوع رہی ہے۔ اردو کے عظم شاعر جناب حفیظ جالندھریؔ نے بھی کشمیر پر ایک جو نظم کہی ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

برف کی اونچائیاں، برفاب کی گہرائیاں　　رنگ و بو کی شوخیاں، پھولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پہ دیواروں کی بزم آرائیاں　　بنتے تنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں

آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا (۵)

پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ اپنی نظم ''اے وادی کشمیر'' میں کشمیر کے متعلق کہتے ہیں:

شاداب چٹانوں میں یہ بہتے ہوئے دریا
سچ مچ یہ دریا ہیں کہ ہے عالم تصویر(٦)

جبکہ جناب عرشؔ صہبائی نے کشمیر جنت نظیر کی مدح سرائی میں اپنی نظم ''اے میرے کشمیر'' کا آغاز یوں کیا ہے:

دیدنی ہے ہر گل رعنا مرے کشمیر میں

موجزن ہے حسن کا دریا مرے کشمیر میں
لہلہاتی کھیتیاں ہیں زینت دشت و جبل
سربہ سر ہے خلد کا نقشہ مرے کشمیر میں (۷)

عرشؔ نے نظم کا آغاز کتنی فنکاری سے کیا ہے کہ ہر وہ شے میرے کشمیر میں موجود ہے جو کسی چیز کے حسن کو دوبالا کرتی ہے مثلاً خوبصورت پھولوں کی وادی، بہتے دریاؤں کا سنگم اور لہلہاتے کھیت وغیرہ سب کچھ میرے کشمیر میں ہے۔عرشؔ کا سا انداز بیان کوئی کہاں سے لائے گا۔ان کے کلام سے ان کی بزرگی اور مشاقی کا اندازہ ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے سرزمین کشمیر کو ایک خوبصورت خطہ بنایا ہے۔اسی نوعیت کا مضمون اس سے پہلے بھی جموں کشمیر کے ایک بہترین شاعر جناب غلام رسول نشاطؔ کشتواڑی نے اپنی نظم ''تصورِ کشمیر'' میں باندھا ہے۔ان کی نظم کا ایک بند پیش ہے:

وادی کشمیر کی یہ سرزمیں — کس قدر دلکش ہے اور کتنی حسیں
چرک کی ہم مرتبہ ہے بالیقیں! — اس پہ نازاں کیوں نہ ہو عرش بریں
ہاں اسی جنت کہ یہ تصویر ہے
نام جس کا گلشن ِ کشمیر ہے(۸)

نشاطؔ کی نظم کے پہلے بند سے لے کر آخری بند تک وادی کشمیر کی مناظرات کی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے لیکن عرشؔ کی نظم میں ایسی نغمگی ہے جو اپنے ہر پڑھنے والے پر الگ اثرات مراتب کرتی ہے۔ان کی نظم بھی وادی کشمیر پر مبنی ہے لیکن نظم کا موضوع جس قدر سادہ اور نیچرل ہے نظم میں عرشؔ کی زبان بھی ویسی ہی سادہ اور سپارٹ ہے کہ پڑھنے والوں کی نظر کے سامنے سارا منظر عیاں ہوجاتا ہے۔ان کی یہ نظم یہاں کشمیر کے حوبصورت مناظروں کی نشاندہی کرتی ہے وہیں نظم میں موجود یہ شعر بھی قابل داد ہے:

ہندو مسلم بھی ہیں سکھ اور عیسائی بھی ہیں
سب مذاہب ہوگئے یکجا مرے کشمیر میں (۹)

یہ شعر اپنے اندر حقیقت لئے ہوئے ہے کیوں کہ جموں کشمیر کے ماحول کو اگرچہ کچھ سیاسی وسماجی طاقتیں اثر انداز کرنے میں سرگرم عمل ہیں تاہم جموں کشمیر کے مختلف مذاہب کے لوگ بنا کسی تفریق کے آپسی بھائی چارہ اور امن قائم کیئے ہوئے ہیں۔جموں کشمیر ایک نہایت خوشگوار ریاست ہے جبکہ اسے دوسرے مما لک میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں دہشت والا شہر تصور کیا جاتا ہے جو سراسر الزام ہے۔عرشؔ کی نظم

کا ہر شعر توجہ چاہتا ہے:

روشنی ہی روشنی پھیلی ہوئی ہے چار سو
ہو گیا عالم چراغاں مرے کشمیر میں
چارسو پھیلی ہوئی ہیں کیف زار نگینیاں
جا بہ جا ہے مستی صہبا میرے کشمیر میں
زندگی بھی ہے، محبت بھی ہے اہل دل بھی ہیں
کیا بتاؤں میں کہ ہے کی کیا مرے کشمیر میں
جس طرف اُٹھتی ہیں نظریں مسکراتی ہے حیات
اب نہیں ہے موت کا کھٹکا مرے کشمیر میں(۱۰)

عرشؔ کی معاصرین میں ڈاکٹر سدھا جین انجم کی نظم ''زیرِ آسماں'' بھی کشمیر کے موضوع پر لکھی گئی اچھی نظم ہے لیکن عرشؔ کی نظم دروازے کا ایک پٹ ہے اور سُدھا انجم کی نظم دوسرا یعنی عرشؔ نے کشمیر کے خوبصورت مناظرات کو موضوع بنایا ہے جبکہ سدھا انجم نے کشمیر میں رہنے والے لوگوں پر گزرنے والے دلخراش واقعات کو نظم میں بیان کیا ہے۔ کشمیر دنیائے ادب میں ہی نہیں بلکہ دنیائے فطرت میں بھی جنت بے نظیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ عرشؔ ملسیانی کی نظم ''جنت کشمیر یہی ہے'' بھی اس موضوع پر کہی جانے والی اچھی نظم ہے جو نہ صرف موضوع بلکہ انداز بیاں میں بھی عرشؔ کی نظم سے کچھ حد تک تعلق رکھتی ہے۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ کریں:

اس سے نہیں کوئی اچھا گلزار اسے دیکھ   اس سے نہیں بڑھ کر کوئی شہکار اسے دیکھ
اس سے نہیں کوئی اونچا کوئی دربار اسے دیکھ   اس سے نہیں بہتر کوئی دیدار اسے دیکھ
فطرت نے جو کھینچی ہے وہ تصویر یہی ہے
فردوس زمیں جنتِ کشمیر یہی ہے(۱۱)

عرشؔ ملسیانی اپنی نظم ''وادی کشمیر'' میں سرزمین کشمیر کو جنت کی کسی حور کے بے نقاب ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

تل رہا ہے زہد اس کے ہر نظارے کے عوض
وادی کشمیر ہے یا حور فطرت بے نقاب(۱۲)

عرشؔ کے معاصرین میں محمد یاسین بیگ کی بھی کئی نظموں کا موضوع کشمیر کے متعلق ہے۔ ''شگوفے''،

''زرد پتے'' اور''شاخ صنوبر تلے'' اسی نوعیت کی نظمیں ہیں۔ کشمیر کے موضوع پر جناب عابدؔ مناوری کی نظم ''میر وطن'' بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں کل چھ بند ہیں اور ہر بند میں انہوں نے پانچ اشعار کی عدد رکھی ہے۔ عابدؔ نے کشمیر کو اپنا وطن بتاتے ہوئے کشمیر کو ہندوستان کے سر کا تاج بتایا ہے۔ نظم کا ایک بند پیش ہے:

ہاں وہی کشمیر ،جو بھارت کے سر کا تاج ہے
ہاں وہی کشمیر ،جو ہے نازشِ گنگ و جمن
ہاں وہی کشمیر ،جس میں'' گلگت و لدخ'' ہیں
ہاں وہی کشمیر ،جموں ہے جہاں طلعت فگن
ہاں وہی کشمیر،جس میں وادی لولاب ہے
ہاں وہی کشمیر ،جس کا'' پونچھ'' ہے رشک عدن
ہاں وہی کشمیر، ہے'' گل مرگ'' سا گلشن جہاں
ہاں وہی کشمیر،جسم میں ہے'' مناور'' سا چمن
ہاں وہی کشمیر،جو محسود ہے فردوس کا
ہاں وہی کشمیر ہے اے دوستو! میر ا وطن (۱۳)

ریاست جموں و کشمیر کا ہی ایک اور اہم نام کشنؔ سمیل پوری کا ہے جنہوں نے حسن کشمیر کے بارے میں کئی عمدہ نظمیں لکھیں ہیں۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ کشمیر کے بارے میں جن مقامی یا غیر مقامی شعراء نے نظمیں لکھی ہیں ان میں کشنؔ کی نظمیں مشاہدے کی شادابی، زبان کی برجستگی اور خلوص کی فراوانی میں بے مثال ہیں۔ کشمیر کے موضوع پر''اے وادی کشمیر''، ''فردوس کشمیر'' اور'' مکتوب کشمیر'' ان کی بہت اہم نظمیں ہیں جو ان کے شعری مجموعہ''فردوس وطن'' 1916ء میں شامل ہیں۔ یہاں ان کی نظم مکتوب کشمیر کا ایک بند پیش ہے:

اگر تم نے کبھی فردوس کا نقشہ نہیں دیکھا   لب نسیم و کوثر ، حور کا جلوا نہیں دیکھا
اگر جنت کے پھولوں کا حسیں دستہ نہیں دیکھا   ارم کی وادیوں میں دودھ کا درہ نہیں دیکھا
تو میرے دوست کچھ دن کے لئے کشمیر آجاؤ (۱۴)

اس میں کوئی شک نہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے سرزمین کشمیر کو ایک خوبصورت خطہ بنایا ہے۔ دنیا بھر کے سیاحوں اور شعراء نے اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوکر نظم ونثر میں اتنا کچھ کہہ ڈالا ہے کہ اگر اس کو جمع کیا جائے تو ایک پورا کتب خانہ تیار ہوسکتا ہے۔

عرشؔ صہبائی کی نظم نگاری کے جائزہ کے دوران مجھے اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ انہیں آنکھیں بہت پیاری لگتی ہیں ظاہر ہے کہ ان کا اشارہ محبوب کی آنکھوں کی طرف ہے۔اس لئے دانستہ طور پر اس نوعیت کی نظم پیش کی جاتی ہے جو صرف ان کے دل میں ہی نہیں بلکہ دوسروں کے دل میں بھی اتر جاتی ہے۔عرشؔ صہبائی نے اسی شعری مجموعے ''شگفتِ گل'' کے آخر میں ایک اور نظم ''وہ دو آنکھیں'' کے عنوان سے بھی شامل کی ہے۔ عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' تیسرا حصہ (موجودہ دور) میں اس نظم کے بارے میں لکھا ہے ''یہ نظم جدید عہد کی اچھی نظموں میں شمار ہو سکتی ہے۔'' (۱۵)

عرشؔ صہبائی آسان لفظوں میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے میں ماہر تھے۔اگر چہ ان کا شعری سفر بھی روایت کے مطابق غزل سے ہی ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد کے تقاضے نے ان سے اچھی اچھی نظمیں بھی کہلوائی ہیں۔نظم ''وہ دو آنکھیں'' ان کی ایک لاجواب نظم ہے جس میں ان کی فکر کی تندی کے ساتھ ساتھ ترنم بھی موجود ہے۔نظم میں شاعر کے انداز بیاں کی جتنی تعریف کی جائے اتنی کم ہے۔نظم ''وہ دو آنکھیں'' کے مطالعہ کرتے وقت کہیں کہیں فیضؔ کی نظم ''تنہائی'' کے جیسی روانی کا حدشہ ہوتا ہے۔فیضؔ کی نظم ''تنہائی'' کو سیاسی اور رومانی دو زاویوں سے پڑھا جا سکتا ہے لیکن عرشؔ نے ''وہ دو آنکھیں'' خالص رومانی نظم کہی۔ان کی ایسی ہی نظمیں انہیں دنیائے ادب میں زندہ جاوید بنائے ہوئے ہیں۔نظم ''وہ دو آنکھیں'' کے ہر بند میں چار مصرعے ہیں اور نظم کل تین بندوں پر مشتمل ہے۔نظم پیش ہیں:

وہ دو آنکھیں جو اکثر اجنبی انداز سے مجھ کو
برابر دیکھتی ہیں اور کچھ اقرار کرتی ہیں
نہ جانے کون سے ارمان پنہاں ہیں ان آنکھوں میں
نہ جانے کون سے جذبات کا اظہار کرتی ہیں

میرے ادراک سے باہر ہے انداز بیان ان کا
میری دانست ہے بالا ہے طرز گفتگو ان کا
میں اپنے دل سے اکثر پوچھتا ہوں ماجرا کیا ہے
یہی جانے تو جانے کیا ہے آخر آرزو ان کی
بہت ہی تیز ہوجاتی ہیں دل کی دھڑکنیں اس پر
طبیعت بے سبب کچھ اور بھی گھبرانے لگتی ہے

نہ جانے ڈوب سی جاتی ہیں کیوں احساس کی نبضیں
نظر میں دور تک اک برک سی لہرانے لگتی ہے (۱۶)

اس نظم کو خالص رومانی نظم سمجھ کر اگر پڑھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ شاعر نے کتنی سادگی سے اپنی بے قراری اور بے بسی کا اظہار کیا ہے۔ کسی آنکھوں کے اجنبی انداز سے اظہار خیال سے موصوف اپنی بے خبری کا برملا اظہار کرر ہے ہیں۔ موصوف کے بار ہا دیکھنے کے باوجود کہ ان آنکھوں میں آخر کون سے جذبات اور امنگیں ہیں، سمجھنے سے قاصر ہے۔ نظم کا ہر بند قابل داد ہے۔ دوسرے بند میں دل کی دھڑکنوں کا تیز ہو جانا، طبیعت کا گھبرانا اور ''ڈوب سی جاتی ہیں کیوں احساس کی نبضیں'' کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ ایک ذاتی تجربہ ہے جس کو زندگی کے کئی موزوں احساس کی مختلف شدتوں سے ہم محسوس کرتے آئے ہیں۔ اس کی نغمگی، بے ساختگی اور یاس کی کسک اس کو ایک یادگار نظم بناتی ہے۔

نظم میں شاعر کے انداز بیاں کی جتنی تعریف کی جائے اتنی کم ہے۔ آنکھیں اردو شاعری میں استعمال کیا جانے والا کوئی نیا موضوع تو نہیں ہے۔ ایسے شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے آنکھوں کو موضوع بنا کر نظمیں کہی ہیں مثلاً خلیل الرحمان اعظمی کی نظم ''نیند پیاری نیند'' خالد انور ''یہ آنکھیں'' غضنفر ''گندم کی بالیاں'' حامدی کاشمیری ''آنکھیں'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں آنکھوں کو ہی بنیادی موضوع بنایا گیا ہے۔ عرش کی نظم ''وہ دو آنکھیں'' کا موضوع روایتی ہے لیکن جس انداز سے انہوں نے نظم کہی ہے وہ ہر کسی کو مُیسر نہیں ہو سکتا۔ عرش نے آنکھوں کو موضوع بنا کر ایک اور بہترین نظم ''یہ تیری مست و سیہ فام غزل خواں آنکھیں'' کہی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ مذکورہ نظم میں الفاظ کے انتخاب اور روانی سے ان مشاقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ شاعری کے فن پر کس قدر مہارت رکھتے تھے۔ نظم کے دو بند ملاحظہ فرمائیں:

مستی و کیف کے سو جام لٹا دیتی ہیں
بے پیے ہوش سے بیگانہ بنا دیتی ہیں
زاہدوں کو بھی رہ کفر دکھا دیتی ہیں
دشمن دل بھی ہیں یہ دشمن ایماں آنکھیں
یہ تیری مست و سیہ فام غزل خواں آنکھیں
کون یہ ان سے کہے یوں مجھے دیکھا نہ کریں
میری الفت کے ہر اک راز کو افشا نہ کریں

اس طرح بزم جہاں میں مجھے رسوا نہ کریں
ورنہ خود ہوں گی کسی روز پشیماں آنکھیں
یہ تیری مست و سیہ فام غزل خواں آنکھیں(۱۷)

عرشؔ صہبائی کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آزادؔ اور حالیؔ کی قائم کردہ شعری روایت سے فیضیاب ہے۔ان کی نظمیں عام طور پر مناظر فطرت، سماجی وتہذیبی واقعات اور نفسیاتی مسائل پر رواں دواں تبصرہ معلوم ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ بھی بہت ساری نظمیں ہیں جو عرشؔ صہبائی کی شاعرانہ عظمت کی شاہد ہیں۔

ریاست جموں میں کشمیر میں اردو نظم گوئی کی روایت کو بہتر اور جدید تر بنانے میں جہاں پروفیسر نند لال کول طالبؔ کی ''رشحات خیال'' تنہا انصاری کی ''شبنمستان'' اکبر جے پوری کی ''ساز دل'' نشاۃ کشتواڑی کی ''تصویر خیال'' جیسی کتابیں اہم ہیں وہیں عرشؔ صہبائی کی کتاب ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔عرشؔ کی نظموں کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان میں روایت کا گہرا شعور اور نئی شاعری کے تقاضوں کے تحت اسلوب بیان میں ندرت کا لاجوب احساس ملتا ہے جبکہ ان کے بعض معاصرین میں روایتی انداز اور فنی لوازمات کا خیال ہی قدرے زیادہ نمایاں ملتا ہے۔ان کی نظموں کے مضامین کا دائرہ حسن وعشق اور وعظ ونصیحت وغیرہ تک ہی محدود نہیں بلکہ مناظرات فطرت، انسانی جذبات واحساسات اور انسان کے نفسیاتی پہلوؤں کو بھی انہوں نے نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ان کی نظم گوئی میں روایت اور جدت کا سبب ریاست جموں وکشمیر کی بدلتے ہوئے سیاسی، تعلیمی، معاشی اور فکری منظرنامے پر رونما ہونے والے تغیرات اور نئے شعراء کا ردعمل سب شامل ہے۔بقول غلام جیلانیؔ:

عرشؔ صہبائی کی نظموں میں نصیحت آموز نقاط بھی کثرت سے ملتے ہیں لیکن یہ ناصح کے نطق کی کڑک نہیں ہیں اور نہ ہی باغی کے دل کی آگ ہے بلکہ نغمہ سنج کے گلے کا کافور ہے یہی ان کے شعر کی سب سے بڑی خوبی کہی جاسکتی ہے۔ان کی نظم نگاری پر کہیں کہیں ترقی پسندی کا غلبہ بھی نظر آتا ہے لیکن وہ انقلاب کے ڈھنڈورچی نہیں ہیں بلکہ تھوڑے بہت انقلابی خیال مل جاتے ہیں ان کی نظم کو پڑھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ عرشؔ صہبائی کی شخصیت کیا ہے کیوں کہ ان کا کلام ان کی شخصیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔(۱۸)

اس سے یہ بات عیاں ہے کہ عرشؔ گہری تخلیقی حیثیت کے مالک تھے۔وہ نظموں میں اپنے موضوع یا

تجربے کواس طرح پیش کرتے ہیں کہ اپنے نظرئے کا احساس دلانے کے باوجود ان کی شاعری ایک حسین فنی شاہکار نظر آتی ہے اور قاری کے لئے اس میں شرکت لازمی ہو جاتی ہے۔ یہ بات عام طور پر ان کی شاعری میں دیکھی جاسکتی ہے کہ کوئی موضوع یا تجربہ ان کی شاعری میں اس وقت تک جگہ نہیں پاتا جب تک کہ وہ تخلیقی عمل سے نہیں گزرتا۔ انہوں نے ایک حساس شاعر کی طرح اپنے عہد کے حالات کا گہرا اثر قبول کیا ہے لیکن اپنے جذبات واحساسات کی محض بیانیہ انداز میں تصویر کشی نہیں کی بلکہ اپنے داخلی وجود کی گہرایوں میں اُتر کر ان کی باز آفرینی کی ہے۔ بقول پروفیسر اسد اللہ وانی ''عرشؔ صہبائی اردو شعر و ادب کا ایک مستند اور معروف نام ہے۔ انہوں نے متحدہ ہندوستان میں آنکھ کھولی، بے لوث محبت اور ہندو مسلم بھائی چارے میں پرورش پائی، برصغیر کے اردو ماحول میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا، ملک کی تقسیم کے خونین ڈرامے کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا، خود تقسیم کا حصہ بنے، ادب کی بساط الٹتے دیکھی۔ ادب اور ادیبوں کا بٹوارہ ہوتے دیکھا، تفکر، تدبر اور تخلیق ادب پر انحطاط، تعطل اور جمود کا گہرا چھائے دیکھا''(۱۹)

عرشؔ کا کلام ان کے حالات اور معاشرے کا آئینہ ہے۔ وہ کہیں کہیں اپنے گردوپیش کے حالات سے متاثر ہو کر بھی شعر کہتے ہیں اور کئی مقامات پر ان کے ہاں بھی غالب کی طرح مضامین غیب سے رونما ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے حالات سے متاثر ہو کر شعر کہے لیکن وہ خارجی محرکات جن سے ان کے ذہن و جذبے میں تحریک پیدا ہوئی انہیں اس وقت تک انھوں نے شعر کے سانچے میں نہیں ڈھالا جب تک کہ ان کی داخلی دنیا میں بھی اس سے ہیجان پیدا نہیں ہوا۔ زندگی میں چونکہ دُکھ سکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس لئے ادیب وشاعر زندگی کے مثبت و منفی رویوں کی عکاسی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ عرشؔ نے زندگی کے حقائق پر ہمیشہ گہری نظر رکھی ہے۔ ان کی بہت سے نظمیں شخصیات، حادثات و واقعات کے ساتھ ساتھ پرفریب معاشرے کی عکاسی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی بعض نظمیں ایسی ہیں جن میں عصری حسیت اور آفاقی معنویت پوشیدہ ہے۔

عرشؔ صہبائی کی جن نظموں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ان میں ایک نظم ''الیکشن نامہ'' بھی ہے۔ یہ نظم سیاسی ماحول کی پیداوار ہے جس میں انہوں نے سیاسی رہنماؤں کو نشانا بنایا ہے جو دوران الیکشن تو خوب چاپلوسی کرتے ہیں لیکن عہدے پر فائز ہوتے ہی ان کے تیور بدل جاتے ہیں۔ جب تک الیکشن کا دور ہوتا ہے تو نیتاؤں کے لئے عوام دیوتا ہوتی ہے، وہ عوام سے اتنی ہمدردی جتاتے ہیں کہ جیسے ان کے جیسا خیر خواہ کوئی اور نہ ہو لیکن یوں ہی ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو یہی نیتا پھر '' آپ کون ہم کون'' ہو جاتے ہیں۔ عرشؔ کی شاعری میں غالبؔ کی سی تہہ

داری ملتی ہے جسکی مثالیں ان کی نظموں میں بھی مل جاتی ہیں۔نظم ''الیکشن نامہ'' میں غضب کی معنوی تہہ داری پائی جاتی ہے جس نے اسے آفاقی نظم کی حیثیت عطا کردی ہے۔ان کی یہ نظم حقیقت نگاری کا سرچشمہ ہے۔ملاحظہ ہو:

جن کو ملتی نہ تھی کبھی فرصت
غم غریبوں کے جاننے نکلے
وقت کے پر غرور شہزادے
ووٹ کی بھیک مانگنے نکلے
سادہ دل ہیں بہت عوام ابھی
ہر قدم پر فریب کھاتے ہیں
جب سنتے ہیں 'دل نشین بھاشن'
دور ماضی کو بھول جاتے ہیں
بھولے بھالے عوام کے دل کی
ہر خوشی کو خرید لیتے ہیں
جب الیکشن ہو کالے دھن والے
زندگی کو خرید لیتے ہیں
ہائے کیا چیز ہے الیکشن بھی
خاک در در کی چھانتے ہیں لوگ
جھونپڑے بھی جنہیں نصیب نہیں
ان کو بھگوان مانتے ہیں لوگ
ووٹ کے دستیاب ہونے تک
ہر بشر کو گلے لگاتے ہیں
جب ملے اقتدار تو ''نیتا''
اپنی ''جنتا'' کو بھول جاتے ہیں (۲۰)

اس نظم کے کئی پہلو ہیں۔سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ جو سیاست دان الیکشن میں حصہ لیتے ہیں انہیں بے نقاب کیا گیا ہے مجموعی طور پر ایسے سیاست دان کس کردار کے ہوتے ہیں وہ کردار نمایاں ہے اگر حق بات کہی جائے تو آج الیکشن بھی ایک کاروبار ہے۔سیاست دان کسی نہ کسی طریقے سے چناؤ میں کامیاب ہوجاتے ہیں

اور پھراس کے بعدان کے کارنامے ایسے ہوتے ہیں جن کا ذکر باعث شرم ہوتا ہے۔اقتدار ملتے ہی چند ماہ میں کروڑوں روپے کی کوٹھیاں بن جاتی ہیں۔خاندان کے تمام افراد شاہانہ زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں تمام حکومت ان کے خاندان تک محدود ہو جاتی ہے۔وہ جانتے ہیں کہ ان کی حکومت صرف پانچ سال ہے اس لئے جتنی لوٹ کھسوٹ ہوسکتی ہے وہ کر لیتے ہیں۔اس کے بعد غریب اور لاچاروں پر ان کی دہشت کا غلبہ بڑھنے لگتا ہے۔پانچ یا چھ سال کے بعد جب کسی دوسری سیاسی جماعت کی حکومت بنتی ہے تو ان کے پاس اس حکومت کی مخالفت کرنے یا گالیاں دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا بلکہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب اخبار میں برسر اقتدار حکومت کے خلاف ان کے بیان اور تصویر شائع نہ ہو۔وہ کون سی برائی ہے جس کا وہ ارتکاب نہیں کرتے لیکن پھر بھی ہمارے یہ بھولے بھالے لوگ جب بھی کسی نیتا کا دل نشین بھاشن سنتے ہیں اپنا ماضی بھول جاتے ہیں اوران کے مکر وفریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔نظم ''الیکشن نامہ'' اتنی سادہ اور رواں ہے کہ ایک دفعہ کے مطالعے سے ہی مضمون قاری پر واضع ہو جاتا ہے۔نشاۃ کشتواڑی نے بھی اپنی ایک نظم میں الیکشن کو موضوع بنایا ہے۔نظم کے چند شعار ملاحظہ فرمائیں:

چلو آج پھر ہم الیکشن لڑیں گے
لڑیں گے تو پیہم الیکشن لڑیں گے
سلامت ہو فرقہ پرستی کا پرچم
اس کو لئے ہم الیکشن لڑیں گے
الٰہی رزلٹ اپنا ہو سینٹ پرسینٹ
بڑھے اپنی انکم الیکشن لڑیں گے(۲۱)

نشاؔط کے علاوہ بھی کئی شعراء نے الیکشن کو موضوع بنا کر بہت عمدہ نظمیں کہی ہیں۔نشاؔۃ نے اس نظم میں واضع کیا ہے کہ الیکشن لڑنے والوں کو بس اپنی جیب سے مطلب ہوتا وہ اسی غرض سے الیکشن لڑتے ہیں۔نشتر امروہی کی نظم ''تعارف'' بھی اسی نوعیت کے موضوع پر ہے۔دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

نہیں پرواہ کہ لیڈر کون اچھا کون گندہ ہے
سیاست میری روزی ہے الیکشن میرا دھندہ ہے
سیاست میں قدم رکھ کر حقیقت میں نے یہ جانی
چرا کارے کند عاقل کے باز آید پشیمانی(۲۲)

یہ ہماری بدقسمتی ہے یا تقدیر کا کوئی کٹھور فیصلہ ہے کہ ہماری ملک کی سیاست ہمیشہ سے چال بازوں، ظالموں اور نا اہلوں کی ہی جا گیر رہی ہے۔آج بھی ملک کا سیاسی نظام جاہل لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اپنی گھریلو اور ذاتی زندگی کو سنوارنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ اس ملک کے رہبر بنے ہوئے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ الیکشن اردو شاعری میں ایک روایتی موضوع ہے جس میں بے شمار لوگوں نے قلم اُٹھایا ہے بعض نے اس پر طنزیہ انداز کے نشتر بھی چلائے ہیں۔اس کے ثبوت میں سید محمد جعفری کی ''الیکشن''، ''میں نشے میں ہوں'' اور ''وزیر کا خواب''،اسرار جامعی کی نظم ''لیڈر کی دعا'' پیش کی جا سکتی ہیں۔عرشؔ کی نظم ''الیکشن نامہ'' کا موضوع روایتی ضرور ہے لیکن ان کے خیال اور انداز بیان نے اسے انفرادی رنگ بھی عطا کر دیا ہے۔موصوف نے اس میں زبان و بیان، آہنگ و عروض کے ساتھ ساتھ روایتی آداب و لوازمات کا پورا خیال رکھا ہے۔

عرشؔ کی نظمیہ شاعری میں صرف ایک ہی رنگ نمایاں نہیں بلکہ آپ کی شاعری میں ادب عالیہ کی بہترین اقدار اور روایات کا التزام موجود ہے۔انہوں نے جو کچھ بھی کہا بڑے فاتحانہ انداز میں طبیعت کی حیرت انگیز سرشاری کے ساتھ کہا ہے۔عرشؔ مشکلات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گیت گانے اور ان کی ہیئت چھین لینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔آپ کی بعض نظمیں قومی یکجہتی اور وطن دوستی کی ترجمان بھی ہیں۔عرشؔ ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کے زبردست حامی تھے۔ان کی نظموں میں شدید حب الوطنی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ان کی نظموں سے ملک کی عظیم روایات اور وقیع ورثے سے محبت کا پتہ چلتا ہے۔انہوں نے اپنی منفرد آواز سے وطن دوستی کو ایک نیا آہنگ دیا ہے۔انہوں نے ''سرزمین وطن''، ''نڈر اور بہادر ہندوستانی سپاہیوں کے نام'' اور'' اے میرے وطن! میرے حسیں خوابوں کی تعبیر'' جیسی نظمیں لکھ کر اس کا منہ بولتا ہوا ثبوت دیا ہے۔ان کی نظم'' سرزمین وطن'' میں جہاں انہوں نے ایک طرف وطن کے خوبصورت ندی نالوں، دل نشیں نظاروں اور سبزہ و گل کا ذکر کیا ہے وہیں دوسری طرف آپسی بھائی چارے کا درس بھی دیا ہے۔اس نظم کے کل 6 بند ہیں۔نظم کے چار بند پیش خدمت ہیں:

حسن کے عشق کے خوب ریلے بھی ہیں
پنگھٹوں پر محبت کے میلے بھی ہیں
یوں ہی بہتا رہے آب گنگ و جمن
سرزمین وطن! سرزمین وطن

تیری ندیوں میں اک لے ہے اک گیت ہے
تیرے جھرنوں میں جیون کا سنگیت ہے
ہیں فضائیں تری ہر گھڑی نغمہ زن
سرزمین وطن! سرزمین وطن
تیری قسمت میں اک سر بلندی رہے
تیری تقدیر میں فتح مندی رہے
آسماں کو چھوئیں تیرے کوہ و دمن
سرزمین وطن! سرزمین وطن
سوئے انسانیت ہے ہر اک راستہ
تجھ کو تفریق مذہب سے کیا واسطہ
ہیں برابر یہاں شیخ اور برہمن
سرزمین وطن! سرزمین وطن(۲۳)

درج ذیل اشعار سے موصوف کے انداز بیان کا بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ساری نظم ایک نغمے کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ مصرعہ ''آسماں کو چھوئیں تیرے کوہ و دمن'' حسن تعلیل کا بہترین نمونہ ہے۔عرشؔ نے اپنے تمام کلام میں نہایت سلجھی ہوئی اور پاکیزہ زبان کا استعمال کیا ہے۔ان کے اس خاص انداز اسلوب سے یہ بات صاف عیاں ہوتی ہے کہ وہ شاعری میں دقیق مضامین اور مشکل الفاظ وتراکیب سے بہت حدتک پرہیز کرتے ہیں۔وہ باتوں باتوں میں کئی حکیمانہ اوراخلاقی مضامین کر دیتے ہیں۔یہ خوبی ان کی شاعری میں وہ خصوصیت پیدا کر دیتی ہے جس کے لئے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ہیئت کے لحاظ سے عرشؔ اپنی نظموں میں کہیں کہیں روایت کا التزام بھی رکھتے ہیں لیکن وہ اس روایت میں انفرادی رنگ بھرنے کے قائل ہیں۔

عرشؔ کے معاصرین میں بھی جذبہ وطن پرستی پر نظمیں ملتی ہیں بلکہ حب الوطنی ہر سے سرشار کلام اردو کے ہر اچھے شاعر کے ہاں ضرور ملتا ہے۔عرشؔ کے معاصرین میں نشاؔط کشتوڑی کی کلیات ''تصویر خیال'' کے حصہ سوم میں ''بادۂ وطن'' کے نام سے پورا مجموعہ شامل ہے جس میں حب وطن کے بہت سے منظومات درج ہیں۔ نشاؔط کی نظم ''اپنے وطن کی سرزمین'' ہے کا بھی وہی موضوع ہے جو عرشؔ نے ''سرزمین وطن'' میں پیش کیا ہے۔ تنوؔیر بھدرواہی کی ''عروسِ وطن'' اور ''جبین وطن'' میں بھی اسی نوعیت کا مضمون باندھا گیا ہے۔عرشؔ ملسیانی

کے ہاں ''مرحبا اے وطن''، میرے وطن، پیارے وطن''اور''اے وطن کے فنکارو''بہت اہم نظمیں ہیں۔

نظم کے لئے کسی موضوع کا انتخاب کرنا اور اس موضوع کا حق ادا کرنا دونوں الگ الگ باتیں ہیں۔ عرشؔ کی سب سے بڑی یہی خوبی ہے کہ انہوں نے نظم کے لیے جس بھی موضوع کا انتخاب کیا ہے اس حق ادا کیا ہے۔ان کے معاصرین میں اکثریت ان کی ہے جن کی اچھی نظموں کی تعداد قلیل ہے جبکہ عرشؔ کی ہر نظم جدید نظم نگاری میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔عرشؔ نے سیاسی وسماجی موضوعات کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔عرشؔ کے یہاں وطنیت کا موضوع بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔اس ضمن میں انہوں نے تقلید کے بجائے مشاہدہ اور فکر کی زد میں آنے والے خیالات ومحسوسات کی ترجمانی کی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے چکبستؔ کی طرح بعض شخصیات پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ان کی نظم ''اے میر وطن !میرے حسیں خوابوں کی تعبیر'' بھی ان کی ایک بہترین نظم ہے جو جوش وجنوں اور جذبہ وطن پرستی کی بہترین مثال ہے۔اس نظم میں شاعر اپنے پیارے وطن سے مخاطب ہے کہ جس طرح کا وہ اپنے وطن کو خوابوں میں دیکھتا ہے اس کا وطن ویسا ہی ہے اور وہ اسے ہمیشہ ایسا ہی دیکھنے کے لئے کسی بھی حد سے گزر سکتا ہے۔نظم ''اے میر وطن !میرے حسیں خوابوں کی تعبیر'' کے کل آٹھ بند ہیں۔نظم کے ہر بند کے تیسرے مصرعے کے بعد ٹیپ ''اے میر وطن !میرے حسیں خوابوں کی تعبیر'' دہرائی گئی ہے۔نظم کے کچھ بند ملاحظہ فرمائیں:

مرمٹنے کی رنگین ادا لے کے اُٹھے ہیں
دیوانے ترے عزم نیا لے کے اُٹھے ہیں
اک ہاتھ میں پرچم ہے اک ہاتھ میں شمشیر
اے میر وطن !میرے حسیں خوابوں کی تعبیر

آزاد ہے تُو اور اب آزاد رہے گا
ہر حال میں ہر رنگ میں دل شاد رہے گا
پڑسکتی نہیں پاؤں میں تیرے کوئی زنجیر
اے میر وطن !میرے حسیں خوابوں کی تعبیر

شمشیر بکف بر سرِ پیکار کھڑا ہے
ہر شخص کفن باندھ کے تیار کھڑا ہے
ہے رشک کے قابل تری یہ خوبی تقدیر
اے میر وطن !میرے حسیں خوابوں کی تعبیر

جو آنکھ تری سمت اُٹھے پھوڑ کے رکھ دوں
مغرور ہو سر تو میں اسے توڑ کے رکھ دوں
قربان تری آن پر اک شاعر کشمیر
اے میر وطن !میرے حسیں خوابوں کی تعبیر (۲۴)

مذکورہ نظم میں شاعر کی حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے جذبات موثر انداز سے نمایاں ہوئے ہیں اور مجموعی طور پر شاعر کی شعری فکر بھی عیاں ہوئی ہے۔نظم کا ہر بند احتجاجی رنگ میں رنگا ہوا ہے اور ہر مصرعے میں حب الوطنی کا شدت احساس موجود ہے۔نظم کے آخری بند میں شاعر کے جذبے وجنوں جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔یہاں ''قربان تری آن پر اک شاعر کشمیر'' لگا کر عرشؔ نے اپنے محبّ وطن ہونے کی دلیل پیش کردی ہے۔عرشؔ کے معاصرین میں آنند سروپ انجم نے بھی اسی موضوع پر نظم ''وطن زندہ رہے'' کہی ہے۔نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہیں:

پیار کی خوشبو محبت کا چمن زندہ رہے
ہم رہیں یا نہ رہیں لیکن وطن زندہ رہے
تیرا ہر جلوہ نشاط انگیز ہو
روح پرور اور راحت بیز ہو
تیرے جس گوشے سے بھی آئے ہوا
کیف آگیں ہو ترنم ریز ہو
حسن بے پایاں ترا یا بانکپن زندہ رہے
ہم رہیں یا نہ رہیں لیکن وطن زندہ رہے (۲۵)

عرشؔ صہبائی کا کلام نہ صرف موضوعاتی اعتبار سے اہم ہے بلکہ ہیت اور اسلوب کے لحاظ سے بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔انہوں نے نظم آزاد،نظم معرا،پابند نظم کے علاوہ بعض ایسی نظمیں بھی اردو ادب کو دی ہیں جو بظاہر غزل معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ غزل نہیں نظمیں ہیں۔یہ بہت مشکل فن ہے کہ تمام لوازمات غزل کے ہوں لیکن وہ نظم ہو،مفہوم کا اظہار اس کے دائرے میں محدود رہے اس نظم میں استعمال کئی گئی زبان سے ظاہر ہے کہ شاعر کو اس پر کتنی دسترس حاصل ہے۔عرشؔ کی نظم ''ہم لوگ''،''جہد''،''ایکتا''،''آدمی'' اور ''قطعہ'' اسی زمرے میں آتی ہیں۔

نظم ''ہم لوگ'' پر جب نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم ان لوگوں کے لئے کہی گئی ہے جو زندگی میں منفی نظریہ اپناتے ہیں اور جن کی طبیعت برائیوں کی طرف مائل رہتی ہے۔اس نظم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمیں ان برائیوں سے دور رہنا چاہیے جن کو ہم اپنائے ہوئے ہیں۔یعنی ہمیں ان گناہوں کو چھوڑنا چاہئے جن پر

ہماری زندگی سرگرم عمل ہے ہرگز چھوڑنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم سے دوبارہ نہیں ہوگا۔ انسان سے گناہ کا ہونا فطری بات ہے۔ لیکن بجائے گناہوں کو ترک کرنے کے برابران پر سرگرم عمل رہنا انسانی قدروں کو سیاہ کردیتا ہے۔ نظم کے کچھ اشعار پیش ہیں:

اعمالِ بد انجام میں مسرور ہیں ہم لوگ
اخلاق کی منزلوں سے بہت دور ہیں لوگ
ہر بات میں رکھتے ہیں نہاں جذبہ تخریب
ماحول ہے اک جسم تو ناسور ہیں ہم لوگ
گو حق و صداقت کے طلب گار نہیں ہیں
اوہام پرستی میں تو مشہور ہیں ہم لوگ
ممکن یہ نہیں کہ ہم سے کوئی نیک عمل ہو
معذور ہیں اس بات سے معذور ہیں ہم لوگ (۲۶)

انسان کی بداعمالیاں اور اخلاقی پستی اس نظم کا بنیادی موضوع ہے۔ عرشؔ نے اس نظم میں انسانی نفسیات کی حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ جس سماج میں آج ہم لوگ زندہ ہیں وہ سماج اگر بدنام ہے تو سبب ہم لوگ ہیں یعنی آج معاشرے میں جو بھی برائی رسم و رواج کی حیثیت اختیار کرگئی ہے اس کے ایجاد کردہ ہم لوگ ہیں۔ عرشؔ کے معاصرین میں ایسے موضوعات پر بہت کم لوگوں نے قلم اُٹھایا گیا ہے لیکن نظم نگاری کی بات کریں تو عرشؔ کہیں نہ کہیں عرشؔ ملسیانی، جگرؔ مرادآبادی اور جوشؔ ملیح آبادی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ کلیات جگرؔ مرادآبادی میں عرشؔ کی اس نظم سے کافی حدتک ملتی جھلتی جگر کی مسلسل غزل موجود ہے۔ عرشؔ ملسیانی کی کتاب ''شرارسنگ'' میں بھی ایک نظم بہ عنوان ''ہم لوگ (شعرائے اکرام)'' ملتی ہے۔ جوشؔ کے کلیات میں بھی نظم بہ عنوان ''ہم لوگ'' ملتی ہے لیکن موضوع اور فکر کے اعتبار سے یہ عرشؔ کی نظم کے بالکل برعکس ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں کہ عرشؔ کہتے ہیں:

''ماحول ہے اک جسم تو ناسور ہیں ہم لوگ'' (۲۷)

وہیں جوشؔ اپنی نظم ''ہم لوگ'' میں کہتے ہیں:

''مگر، امانت فصل بہار ہیں ہم لوگ'' (۲۸)

جناب عرشؔ ملسیانی انسان کی شخصیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

''دام ہم لوگ دانہ ہیں ہم لوگ'' (۲۹)

فراقؔ گورکھپوری کے یہاں بھی اسی عنوان پر نظم ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''جو سر بہ سر خزاں وہ بہار ہیں ہم لوگ'' (۳۰)

عرشؔ ملسیانی کی نظم کا ایک بند ملاحظہ کریں:

ساز چنگ و چغانہ ہیں ہم لوگ زندگی کا ترانہ ہیں ہم لوگ
حسن کی ایک نظم کیف ربا عشق کا ایک فسانہ ہیں ہم لوگ
ہم کو کیا واسطہ زمانے سے آپ اپنا زمانہ ہیں ہم لوگ (۳۱)

جوشؔ کی نظم ''ہم لوگ'' سے زیادہ خیالات کے معاملے میں عرشؔ ملسیانی اور فراقؔ کی نظم بہ عنوان ''ہم لوگ''، عرشؔ کی نظم زیادہ قریب ہے۔ فراقؔ کہتے ہیں:

لہو میں ڈوبی زماں خارزار ہیں ہم لوگ
جو سر بہ سر خزاں وہ بہار ہیں ہم لوگ
تغافل نگہ ناز یار ہیں ہم لوگ
بلا کشان غم انتظار ہیں ہم لوگ
ہماری جلوہ گری میں بھی شان صحری ہے
بہار گلشن بے برگ و بار ہیں ہم لوگ (۳۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر شاعر کا اپنا ایک دائرہ کار ہوتا ہے اور ایک خاص انداز بیان جو اسے دوسروں سے منفرد ثابت کرتا ہے۔ لیکن جب ایک ہی بات ہو اور نظریات الگ ہوں وہاں کہیں نہ کہیں انحراف کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ عرشؔ اور جوشؔ کے نظریات میں اتنی تبدیلی کا سبب کچھ حد تک وقت اور زمانہ ہو سکتے ہیں کیوں کہ جوشؔ کا شعری سفر جب شروع ہوتا ہے تب عرشؔ صہبائی کی پیدائش بھی واقعہ نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے زمانہ کی تبدیلی نے ماحول اور انسان دونوں کو بدلہ ہے گویا دونوں نظمیں اپنے اپنے وقت کے اعتبار سے حقیقت پر مبنی ہیں۔ جوشؔ کی نظم ''ہم لوگ'' کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں:

خزاں کے جور سے ہر چند خوار ہیں ہم لوگ
مگر، امانت فصل بہار ہیں ہم لوگ
ہر اک سانس ہے گو صد ہزار حشر بدوش

مگر ، پیامِ ثبات و قرار ہیں ہم لوگ
زمیں سے کرتے ہیں ناز ،اورآسماں سے غرور
وہ کبر دوست کے آئینہ دار ہیں ہم لوگ
حیات کی ابدی رات کے اندھرے میں
چراغ عابدشب زندہ دار ہیں ہم لوگ (۳۳)

جوشؔ نے نسل آدم کو ''امانت فصل بہار'' کہا ہے جب کہ عرشؔ نے اسے ''اخلاق کی منزلوں سے دور'' قرار دیا ہے۔دونوں کے نظریات میں تبدیلی کا سبب زمانے کی تبدیلی ہے۔یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان جن اخلاقی قدروں کی بدولت انسان کہلاتا ہے وہ اب انسان کے اندر نہ ہونے کے برابر ہیں۔انہیں حالات کی تبدیلی کے سبب عرشؔ نے انسان کواوہام پرست بتایا ہے۔عرشؔ کی نظمیں ہی نہیں بلکہ ان کی تمام اصناف شاعری سماجی وابستگی اورانسانی جذبات کی شاعری ہے۔ان کا احساس آفاقی ہے جو پوری عالم انسانیت کواوراس کے کرب والم کواپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔انہوں نے نظم ''ہم لوگ'' کا اختتام ان اشعار سے کیا ہے:

ہر وقت لبوں پر ہیں محبت کے ترانے
بارغم ایام سے گو چور ہیں ہم لوگ
ہم باز بدی سے کبھی آنے کے نہیں عرشؔ
فطرت ہی کچھ ایسی ہے مجبور ہیں ہم لوگ (۳۴)

عرشؔ کی نظموں کی یہی بات انہیں سب پر برتری دلاتی ہے کہ وہ چند جملوں میں عالم انسانیت کے مسائل اورمعاملات کو سمیٹنے کی قدرت رکھتے تھے۔یہ محض کوئی بات نہیں ہے بلکہ اس کا حقیقی مشاہدہ آپ ان کے کلام کے مطالعے سے کر سکتے ہیں۔ان کی نظم ''ہم لوگ'' بھی تو سارے عالم کے لوگوں کواپنے احاطے میں سمیٹے ہوئے ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی نظموں میں عالم گیراخوت اورجذبہ انسانی کے عناصر موجود ہیں۔وہ پورے عالم انسانیت کوایک اکائی تسلیم کرتے ہیں۔

عرشؔ کی نظم ''جہد'' بھی ایک منفرد لب ولہجے کی پیامی نظم ہے جو سات اشعار پر مشتمل ہے۔یہ نظم بھی ان کی بہترین نظموں کا حصہ ہے جس میں وہ اولاد آدم سے براہ راست مخاطب ہیں۔یہ نظم حب الوطنی اورذہنی بیداری کے جذبے کا اظہار کرتی ہے۔اس میں بھی عرشؔ کا کمال ہے کہ ہیئت کے اعتبار سے یہ نظم غزل معلوم ہوتی ہے لیکن یہ نظم ہے۔نظم کا آغاز عرشؔ یوں کرتے ہیں:

وفور درد سے دل کا قرار پیدا کر
جو ہو سکے تو خزاں سے بہار پیدا کر(۳۵)

یہ نظم جب تخلیق کی گئی تب ترقی پسند تحریک کا مکمل خاتمہ ہو چکا تھا لیکن اس تحریک کا اثر بھی اس نظم میں ملتا ہے یعنی ادب برائے زندگی کے فلسفے سے یہ شعر خالی نہیں بلکہ اثر انداز لگتا ہے۔خزاں سے بہار کے معنیٰ غم سے خوشی پیدا کرنے کے ہیں جو حقیقتاً غم کے بعد ہی لازمی ہے اس شعر میں بنی نوع انسان کو یہی مشورہ دیا گیا ہے کہ غم کی بہتات سے ہی دل کو قرار میسر ہوتا ہے یعنی غم کے بعد ہی خوشی نصیب ہوتی ہے اس لئے اگر تجھے بہار کا منہ دیکھنا ہے تو اس کے لئے خزاں کو بھی گلے لگانا پڑے گا یعنی درد سہہ کر ہی قرار حاصل ہوتا ہے۔عرشؔ کی یہ نظم خوداری انسان میں ایک نئی روح پھونکنے کا کام کر رہی ہے۔ یہ انسان کے اندر چھپے ہوئے کچھ کر گزرنے کے جذبے کو ہوا دے رہی ہے۔اس نظم کے مطالعے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ عرشؔ نے ماحول سے براہ راست اثر قبول کیا ہے اور اسی کی پیدا کردہ یہ نظم ہے:

جو ساز گار ہوں انسان کی زندگی کے لئے
نئے طریق کے لیل و نہار پیدا کر
وطن کی خاک میں نہاں ہے حسن لالہ وگل
وطن کی خاک سے رنگ بہار پیدا کر(۳۶)

مندرجہ بالا اشعار میں یہاں مصرعہ اولیٰ سے اگر ''وطن کی'' اور مصرعہ ثانی سے بھی برابر اسی طرح ''وطن کی'' کو ہٹا دیا جائے تو بھی یہ شعر مکمل تھا لیکن غزل کے بحر و وزن سے دور ہو جاتا یہاں شاعر کی حاضر ذہنی داد طلب ہے کہ انہوں ''وطن کی'' کو دونوں مصرعوں میں لگا کر شعر کے حسن کو دوبالا کر کے حب الوطنی کا جذبہ بھی نمایاں کر دیا ہے:

ہر ایک کو بادہ حُب وطن کے جام پلا
ہر ایک نگاہ میں کیف وخمار پیدا کر
ہوس پرست نہ بن،لذت گنہ پہ نہ جا
نگاہ خلق میں اپنا وقار پیدا کر(۳۷)

عرشؔ ان اشعار میں بنی آدم سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس وطن کے ہر فرد کو وطن پرستی و حب الوطنی کے جذبے سے سرشار کر،وطن سے محبت کرنے کے جام پلا کہ حب الوطنی سے ان کے ذہنوں کو کیف

وسرور حاصل ہو۔موصوف مزید تاکید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لذت گناہ سے دور رہ ہوس پرست نہ بن بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بنائی ہوئی مخلوق کی نگاہوں میں اس مقام کو حاصل کر جس مقام ومنزلت ووقار کے ساتھ اس نے تمہیں خلق کیا ہے۔عرشؔ کے معاصرن میں ایسی نظمیں نہ کے برابر ہیں لیکن اردو کے بڑے شاعروں کے یہاں اس قسم کی نظمیں ملنا عام بات ہے۔ڈاکٹر غلام جیلانیؔ جو عرشؔ کے چہیتے شاگردوں میں شامل ہیں وہ عرشؔ کی اس نظم کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''مجموعی طور پر اس نظم میں عرشؔ صہبائی کے خیال کہ پرواز کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔وہ کہیں نہ کہیں اس نظم میں علامہ اقبال کے ہم خیال نظر آتے ہیں یہ نظم عرشؔ صہبائی کی نظموں میں ایک اہم مرتبہ رکھتی ہے جس میں انہوں نے خود کو پہچاننے کا مشورہ دیا ہے۔اس نظم کا ہر شعر ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے''(۳۸)

عرشؔ اس نظم میں نہ صرف اقبال بلکہ اردو دب کے دیگر شعراء اقبالؔ،جگرؔ مرادآبادی اور سرارالحق مجازؔ کے بھی ہم خیال نظر آتے ہیں۔ان کے ہاں بھی کئی مقامات پر اسی نوعیت کے مضمون باندھے گئے ہیں۔مثلاً عرشؔ کہتے ہیں:

دلوں میں جذبہ مہر و وفا کے پھول کھلا
خزاں رسیدہ چمن میں بہار پیدا کر
نثار تجھ پہ ہو رنگ بہارِ باغ حیات
نگاہوں میں وہ شعورِ بہار پیدا کر(۳۹)

علامہ اقبالؔ کی ایک نظم جس کا عنوان ''جاوید کے نام'' ہے۔اس میں اقبالؔ یوں کہتے ہیں:

دیار عشق میں اپنا نام پیدا کر　　نیا زمانہ نئی صبح شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو　　سکوت لالہ و گل کلام پیدا کر(۴۰)

جبکہ جگرؔ مرادآبادی بھی اپنی نظم ''دل حسیں ہے تو محبت بھی حسیں پیدا کر'' میں کہتے ہیں:

پہلے تو حسن عمل ،حسن یقین پیدا کر
پھر اسی خاک سے فردوس بریں پیدا کر
بندگی یوں تو ہے انسان کی فطرت لیکن
ناز جس پہ کریں سجدے، وہ جبیں پیدا کر(۴۱)

اسرارالحق مجازؔ اپنی ایک نظم بہ عنوان ''نوجوان'' میں کہتے ہیں:

جلال آتش وہ برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر (۴۲)

اگر عرشؔ کی نظم ''جہد'' کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سن 1975ء میں جب ہندوستان میں 21/ماہ تک ایمرجنسی لگائی گئی تھی تب ملک میں ہر جانب خوف اور دہشت کا ماحول تھا۔ ملک کے نوجوان باوجود ملک کی آزادی کے خود کو قید خانے میں تصور کرنے پر قائل تھے، زندگی کی وہ رویش، وہ حرکت وجنوں سب پست سا ہوگیا تھا۔ ملک میں ہر طرف آپسی رنجشیں وتضاد، بداعمالی و بداخلاقی اور تخریب کاری و چور بازاری کا ماحوم گرم تھا۔ انسان انسانیت کو بھول کر اپنی خود کی ایجاد کردہ ہوس اور نفرت کی دنیا میں رہنے کا عادی ہوگیا تھا۔ عرشؔ کی یہ نظم ان حالات میں پست ہوئے نوجوانوں کے جذبوں کو نئی ترنگ دیتی ہے۔ عرشؔ اولادآدم کو یہ پیغام دیتے ہیں:

ہوس پرست نہ بن، لذت گنہ پہ نہ جا
نگاہ خلق میں اپنا وقار پیدا کر
نثار تجھ پہ ہو رنگ بہار باغ حیات
نگاہ میں وہ شعور بہار پیدا کر (۴۳)

عرشؔ کی نظموں میں جذبات کی شدت ہے۔ ان کی نظمیں مناظرات فطرت سے تعلق رکھتی ہوں یا کسی بھی دوسرے سیاسی وسماجی مضامین پر مشتمل ہوں ان میں جوش وخروش ہے، جذبے کی فراوانی ہے، انقلاب کی گھن گرج ہے اور خوبصورت الفاظ اور تشبیہوں کی تکرار ہے۔ عرشؔ کی نظموں میں وہ تاثر موجود ہے جو عوام کے ذہنوں کو متاثر کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام کے لئے وہ موضوعات چنے ہیں جو سچائی، شرافت، اتحاد، باہمتی اور انسانیت کا درس دیتے ہیں۔ ان کا کلام اسرار ومعائب، عرفانی کیفیات اور رموز حسن وعشق سے مالا مال ہے۔ عرشؔ نے اپنی شاعری سے ایسا درس دیا ہے کہ جس کے ذریعے زندگی کے اہم مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ان کی نظمیں بالخصوص درس اخلاق، احساس فرض اور معاشی دشواریوں کے سلسلے میں خضر راہ کا کام دیتی ہیں۔

عرشؔ صہبائی کے ہاں ایسی کئی نظمیں بھی مل جاتی ہیں جو ایک خاص موضوع پر کہی گئی ہیں لیکن ان کا انداز بالکل غزل جیسا ہے اور ان میں برابر غزلیت پائی جاتی ہے۔ ان میں ''آدمی'' بھی ایک ایسی ہی نظم ہے۔ وہی غزل جیسا مطلع مختلف اشعار اور مقطع لیکن غزل نہیں، غزل نما ہے ملاحظہ کیجئے:

صاحب علم و ہنر ہے آدمی — محرم شمس وقمر ہے آدمی
حیف اک نان جویں کے واسطے — سر بہ سجدہ در بہ در ہے آدمی

دونوں عالم کی خبر رکھتا ہے یہ
اور خود سے لیکن بے خبر ہے آدمی

آدمیت کا نہیں کچھ اس کو پاس
کس قدر شوریدہ سر ہے آدمی

اس کی ہستی ایک مشت خاک ہے
سرگرداں کس بات پر ہے آدمی

شرپسندی اس کی فطرت ہے مگر
دیکھنے میں بے ضرر ہے آدمی

عرش پر ہے رات دن اس کا دماغ
خود بہ نازاں کس قدر ہے آدمی (۴۴)

یہ بہت مشکل فن ہے کہ تمام لوازمات غزل کے ہوں لیکن وہ نظم ہو۔ اس نظم میں استعمال کی گئی زبان سے ظاہر ہے کہ شاعر کو اس پر کتنی دسترس حاصل ہے۔ اس نظم کے آخری شعر میں ابہام گوئی کی مثال بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں لفظ ''عرش'' دو معنوں میں استعمال ہوا۔ اس شعر کے مصرعہ اولیٰ کو اگر چھپا دیا جائے تو لگتا ہے کہ انسانی شخصیت کس قدر بلند و بالا ہے لیکن اگر مصرعہ ثانی کو ملا کر پڑھا جائے تو شعر کے اصل معنی واضح ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شعر پر انسانی شخصیت کی مدح نہیں بلکہ ہجو کا پس منظر حاوی ہے اور شعر ایک طنزیہ نشتر معلوم ہوتا ہے۔ ایسے شعر اردو ادب میں نایاب تو نہیں کم یاب ضرور ہیں۔ اعلیٰ پائے کی شاعری کی یہ پہچان ہوتی ہے شعر کے مصرعہ اولیٰ پڑھ کر شعر کا مفہوم قاری اندازہ نہ کر سکے کہ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے لیکن جب مصرعہ ثانی ملا کر پڑھا جائے تو اصل مفہوم تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ اردو میں ایسی نظمیں بہت کم ملیں گی زیادہ تر ایسی نظمیں استاد شاعروں کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ انتخاب کلام نظیرؔ اکبر آبادی میں نظیرؔ کے ہاں بھی ہمیں اسی ردیف پر نظم بہ عنوان ''آدمی نامہ'' ملتی ہے۔ ایک بند ملاحظہ کریں:

دنیا میں پادشہ ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس اور گدا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی (۴۵)

جیسے کہ میں پہلے ہی کہا ہے عرشؔ کی نظم ''آدمی'' کی نوعیت کی نظمیں ہمیں ان کے معاصرین میں نہیں ملیں گی بلکہ برصغیر ہند و پاک کے چند گنے چنے بڑے شاعروں کے ہاں ہی ملیں گی۔ عرشؔ کی نظم کے موضوع اور انداز بیاں سے ملتی ہوئی ایک نظم ہمیں جناب سید محمد جعفریؔ کے ہاں بھی بہ عنوان ''آدمی'' ملتی ہے۔ سید محمد جعفریؔ کی نظم کا ایک بند پیش ہے:

جو چاند پر گیا سو ہے وہ بھی آدمی　　　جو گپ اڑا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
جو ہنس ہنسا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی　　　جو جی جلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ہیں آدمی کے سارے زمانے میں رنگ روپ
ہیں آدمی ہی چاندنی اور آدمی ہی دھوپ(۴۶)

عرشؔ صہبائی کی طنز شاعری میں ایک مخصوص (یعنی اصلاحی) انداز لئے ہوئے ہے۔انہوں نے انسان اورانسانی نفس کی بدولت معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو بے نقاب کیا ہے۔عرشؔ حد درجہ حالات کا سمجھوتا ضرور کرتے تھے لیکن جہاں بغاوت کی ضرورت ہوتی وہاں اس سے گریز بھی نہیں کرتے تھے۔وہ حق بات کو ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کے قائل تھے۔ان کی زندگی کے حالات یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ خدمت کے جذبے کوفروغ دیااور کبھی جھوٹی شہرت اور تصنع سے حاصل شدہ منصب کی تمنا نہیں کی۔زمانے کی نمائش اور گروہ بندی سے ہمیشہ دور رہے، حال میں جیتے ہوئے بھی ہمیشہ مستقبل پر نگاہ رکھی۔ان کے نزدیک تجربات انسانی اور مختلف علوم وفنون قوم کی وراثت کے برابر تھے۔وہ ایک پاکیزہ سماج کا تصور رکھتے تھے جہاں انسانی تہذیب کی قدر ہو۔وہ جانتے تھے کہ جب آدمی کے اندر خیانت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے،نظر عیار ہو جاتی ہے اور ذوق عمل بھی مجروح ہو جاتا ہے تو معاشرے کی صالح اقدار اور تہذیبی اور سماجی روح میں زنگ لگ جاتا ہے۔ان کی شاعری میں معاشرتی زوال کی نشانیاں بھی مل جاتی ہیں۔

عرشؔ صہبائی نے چھ مصرعوں پر مشتمل مسدس کی ہیئت میں بھی ایک نظم ''ادائے سلام'' کے نام سے لکھی ہے جو تسلسل اور انداز واسلوب کے لحاظ سے ایک عمدہ نظم ہے۔ادبی حلقوں میں اس نظم کو کافی سراہا گیا اکثر ادبی مجلسوں میں بڑے شوق سے اسے سُنا جاتا رہا ہے۔دراصل یہ نظم جوشؔ ملیح آبادی کی ایک نظ میں شامل مصرعہ ''اس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ'' پر تضمین ہے۔عرشؔ صہبائی نے اس مصرعہ پر اپنی خوبصورت تضمین کر کے اپنی استادانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے۔موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے یہ نظم جوشؔ کی ایک نظم سے مماثلت رکھتی ہے۔جوشؔ ملیح آبادی کی نظم ملاحظہ کیجئے:

آنکھوں میں غنچہ ہائے نوازش نچوڑ کر　　　مرے دل شکستہ کو نرمی سے جوڑ کر
ہونٹوں پہ نیم موج تبسم کو توڑ کر　　　مری طرف خفیف سا گردن کو موڑ کر
کل صبح رستے میں سہانی حیا کے ساتھ
اس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ(۴۷)

اب عرشؔ صہبائی کی ''ادائے سلام'' ملاحظہ فرمائیں جو اسی نظم سے تضمین ہے۔ دیکھئے کتنی خوبصورت تضمین ہے:

چہرے سے اپنے گیسوئے سخن سنبھال کر   پردے سے اپنا چاند سا مکھڑا نکال کر
بانکی ادا سے ریشمی آنچل اچھال کر   دیوانہ وار آنکھوں میں آنکھوں کو ڈال کر

کچھ مسکرا کر اور جبیں تک اٹھاکے ہاتھ
اس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ(۴۸)

عرشؔ کی نظموں میں مضامین کے سادہ اور نیچرل ہونے کے جو اوصاف ہیں، ان سے انکار ممکن نہیں بلکہ اگر ہم ان کے معاصرین کی نظمیہ شاعری کا ان کی نظموں سے مقابلہ و موازنہ کریں تو معلوم ہوگا کہ عرشؔ کے یہاں روانی، جاذبیت اور اصلیت زیادہ ہے۔ جس طرح کی نظمیں عرشؔ نے کہی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ذہن جدت پسند اور مجتہدانہ تھا۔ انہوں نے نہ صرف حب وطن، قومی یکجہتی، آپسی بھائی چارے، معاشی و سماجی نابرابری، سیاست دانوں کی بداعمالیوں و عدل وانصاف وغیرہ کو اپنی نظموں میں جگہ دی بلکہ انسان کے نفس میں ابھرنے والے جذبات واحساسات کو بھی بڑی فنکاری سے اپنی ہاں برتا ہے۔ اگرچہ ان کا تعلق درس و تدریس سے نہیں رہا لیکن ان کی نظم ''جان وفا'' بچوں کی تعلیم پر مبنی ہے۔ اس میں وہ بچوں کی تعلیم پر زور دیتے ہیں کیوں کہ وہ خود اپنے بچپن میں اچھی تعلیم سے محروم رہے تھے اس لئے ان کی یہ نظم ان کے جذبات کی ترجمان ہے کہ تعلیم دنیا کی تمام دولت کی بنیاد ہے۔ عرشؔ نظم کے شروع میں انسان کی پستی اور حالات حاضر پر طنزیہ لہجے میں قلم اٹھاتے ہیں لیکن آخر تک آتے آتے انہیں بچوں کی تعلیم کی فکر لاحق ہوتی ہے کیوں کہ آج کے بچے ہی ہمارا مستقبل ہیں۔ نظم کے آغاز کا کچھ حصہ ملاحظہ فرمائیں:

میری جان وفا! یہ چپ کیسی
کس لئے ہونٹ سل گئے یکسر
ایسے لگتا ہے ہم پریشان حال
ایک مرکز پہ مل گئے آکر
تو بھی غمگیں ہے میں بھی افسردہ
آج چہروں پہ وہ نکھار نہیں
چاروں جانب خزاں کے سائے ہیں
زندگی پہ کوئی بہار نہیں

درد،غم ،فکر،رنج،محرومی
روح پہ کس قدر خراشیں ہیں
زندگی نام کونہیں ہم میں
یعنی ہم چلتی پھرتی لاشیں ہیں(۴۹)

عرشؔ کا محبوب ایک وفادار اور معصوم صفت محبوب ہے جو ہندوستانی سماج کا پروردہ ہے۔عرشؔ اکثر نقلابی لہجے میں بات کہنے کے عادی تھےلیکن یہاں نہایت نرم انداز میں اس سے مخاطب ہیں کہ لبوں پر خاموشی کے پہرے کس لئے کیوں ہونٹ سل گئے ، پھرخود ہی اس کا سبب بھی بیان کرتے ہیں کہ حالات کے ستائے ہوئے ہم سب ایک ہی مقام پرآ کرمل گئے ہیں اور یہ حال صرف ہماراہی نہیں ہے بلکہ ہرکسی پرغم اورافسردگی کا رنگ غالب ہے۔ ہماری حیات میں بہار کی کوئی صورت نہیں ہر جانب خزاں ہی خزاں ہے۔ہماری روح پر دردو الم ،رنج ومحرومی کی خراشیں ہیں اور ہم زندہ ہیں مگر نام سے حقیقت میں سب چلتی پھرتی لاشیں ہیں۔عرشؔ نے اس نظم جہاں انسان کی پستی کواجاگرکیا ہے وہیں اس پستی کا حل بھی بتاتی ہے۔ ماں باپ اوراولاد کے درمیانی رشتے کوبھی عرشؔ اس نظم میں واضع کرتے ہیں۔نظم کا اختتام اسی بند پر ہوتا ہے:

جان سے بھی عزیز تر بچے
دل کی ٹھنڈک ،جگر کے ٹکڑے ہیں
روشنی ہیں ہماری آنکھوں کی
زندگی کے حسین سپنے ہیں(۵۰)

اس طرح کی نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر شاعری میں فنکاری اور ہنر مندی رکھتی ہو تو تہذیبی ، مذہبی ،اخلاقی اور تعلیمی پہلوؤں کو پیش کرنے کا بہتر وسیلہ بن سکتی ہے۔عرشؔ کی نظموں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف نئے موضوعات کا تعین کیا بلکہ نیا ڈکشن اوراپنی الگ شعری لغت بھی تیار کی ہے۔ان کے اپنے شعری لہجے پران کی اپنی ہی چھاپ ہے جسے کسی قدر توجہ کے ساتھ پہچانا جا سکتا ہے۔عرشؔ کے اشعار نیچرل ہو یارواں ، بیانیہ ہو یا محاکاتی انہوں نے ہر جگہ زبان کی صحت ، بیان کی خوبی ،الفاظ کی بہترین انتخاب،لفظی مناسبتوں اور ترکیبوں کا لحاظ رکھا ہے۔لطیف احساس کی گرمی اور جذبے کی شدت ان کے اشعار کے خاص جوہر ہیں۔ان کے اشعار کا موضوع کچھ بھی ہوانہوں نے اس کی پرکھ سختی سے کی ہے۔

عرشؔ صہبائی نے یہاں سیاسی ،سماجی ، مذہبی ، حب الوطنی ،آپسی بھائی چارے اور انسان کی نفسیات

سے تعلق رکھنے والے موضوعات کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے وہیں ایک شخصی نظم ''رابندر ناتھ ٹیگور'' بھی کہی ہے جس میں انہوں نے ٹیگور کی مدح سرائی کی ہے۔ اردو شاعری کی روایت کی اگر ہم بات کریں تو اس طرح کی نظمیں پہلے بھی کہی جاتی رہی ہیں۔ مثلاً جگن ناتھ آزاد کی ''ماتم نہرو'' اور ''نوحہ ابوالکلام آزاد''، نظیر اکبر آبادی کی ''فراق'' اور ''سوز فراق''، عرش ملسیانی کی ''شہید اعظم'' اور ''ماتم اقبال'' وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں۔ اس بات سے کوئی بھی انجان نہیں کہ ہندوستان کے عظیم سپوت ٹیگور نے 1913ء میں ''گیتا نجلی'' نامی کتاب لکھی تھی جس پر انہیں دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل پرائز ملا تھا۔ عرش صہبائی نے ٹیگور کو اس لئے موضوع سخن بنایا کیوں کہ وہ انہیں ایک عظیم فنکار کے علاوہ ایک بہترین انسان بھی تصور کرتے تھے۔ عرش نے نظم کے ہر شعر کے آخر میں ''ٹیگور نے'' کو دہرا کر ٹیگور کے کاموں کی فہرست بیان کی ہے۔ نظم کے اشعار پیش ہیں:

توڑ ڈالا ہر طلسم تیرگی ٹیگور نے
اہل دنیا کو دکھائی روشنی ٹیگور نے
ہر بشر کے رخ پہ رقصاں ہیں ضیائیں علم کی
یوں اڑائی ہے جہالت کی ہنسی ٹیگور نے
رنگ ونسل و مذہب و ملت کی تفریق اٹھ گئی
کام یہ بھی کر دکھایا مہ رشی ٹیگور نے
بے حس و بے کیف تھا بنگال کا ماحول جب
ایک تازہ روح اس میں پھونک دی ٹیگور نے
غنچہ ہائے فکر سے پیدا کیا رنگ بہار
یوں سجایا گلستان شاعری ٹیگور نے (۵۱)

ٹیگور نے علم و ادب کا ایک بہت بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ مگر گیتا نجلی سے ان کی آن، بان، شان اور پہچان قائم ہے۔ یہ مختصر سی گیتوں کی کتاب دراصل ان کے الہامی اور روحانی احساسات کا شاعرانہ اظہار ہے۔ اس کو پڑھئے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی صوفی اپنے وجد کی آخری منزل پر پہنچ کر کچھ ایسے الفاظ منہ سے نکال رہا ہے جنہیں صرف محسوس کیا جاسکتا ہے سمجھایا نہیں جاسکتا۔ مکمل ''گیتا نجلی'' مادیت سے پریشان لوگوں کے لئے ایک روحانی غذا ہے۔ اس کتاب میں رشیوں، منیوں کے قدیم ہندوستان کی مقدس اور خوشگوار فضا تو ملے گی مگر کسی دھرم کی برتری کی وکالت کا شائبہ بھی نہیں ملے گا۔ یہ کتاب روحانیت اور انسانیت کے امتزاج کا نغمہ ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ ٹیگور کی اعظمت کو ہندوستان کے لوگوں سے پہلے یورپ والوں نے پہچانا۔ چونکہ وہ اپنی مادی زندگی سے اوب چکے تھے ،تھک چکے تھے ۔ ٹیگور دراصل انسانیت کے اعلیٰ اقدار کے نغمہ نگار تھے۔ جہاں جہاں انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا فقدان تھا، ٹیگور کی شاعرانہ شخصیت وہاں کے لئے ضرورت بن گئی تھی۔ وہ ہندوستانی ادب میں عظمت کا ایک نشان تھے بھی، اور ہیں بھی۔ اسی سبب سے عرشؔ صہبائی ان کے متعلق یہ کہتے ہیں:

اک مدبر اک سخنور اور اک رہبر تھا وہ
خدمت اہل وطن کیا کیا نہ کی ٹیگور نے
ساری دنیا سے لیا حسن عقیدت کا خراج
خود دل سے جب لکھی گیتانجلی ٹیگور نے
دہر میں اپنے وطن کا نام اونچا کر دیا
اس طرح قسمت جگادی قوم کی ٹیگور نے
وہ تخیل وہ سلاست وہ روانی وہ بیان
شعر میں الہام کی ہر بات کی ٹیگور نے (۵۲)

غلام جیلانی اپنی کتاب ''عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی'' کے صفحہ نمبر 187 پر میں عرشؔ کی اس نظم کی تخلیق کے متعلق لکھتے ہیں۔ ''یہ نظم لکھ کر انہوں نے اپنے آپ کو نظیر بنارسی کے ساتھ کھڑا کر لیا ہے جنہوں نے ٹیگور پر مرثیہ لکھا ہے۔'' بہرکیف نظم روانی، سادگی اور اصلیت اور جوش وغیرہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ نظم میں فصیح الفاظ موقع کی نزاکت کے مطابق جڑے ہوئے ہیں جو قابل داد ہیں۔

عرشؔ صہبائی کا انتقال 2020ءمیں ہوا، انہوں نے اردو نظم میں ہونے والی عہد وعہد کی تبدیلیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کو اپنی نظموں میں سمونے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ مختصراً یہ کہ انہوں نے فطرت کی مصوری، جذبات نگاری، حب الوطنی، قومی جوش، سیاسی، ادبی و رومانی، مذہبی اور انسانی نفسیات پر مبنی کئی اچھی نظمیں اردو ادب کو دی ہیں جن کا موضوع روایتی ضرور ہے لیکن ان کے اپنے مخصوص انداز بیان نے ان میں چار چاند لگائے دئے ہیں۔ عرشؔ کی تمام تر نظموں کے مطالعہ سے ایک بات عیاں ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ان میں اصلیت اور مقصدیت پر خوب زور دیا ہے۔ عرشؔ نے اپنے کلام کے لئے وہ موضوعات چنے ہیں جو سچائی، شرافت، اتحاد، بلند ہمتی اور انسانیت کا درس دیتے ہیں۔ بعض ایسے موضوعات جن پر صرف نثر میں ہی اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے انہیں بھی نظم میں پیش کرنے کی کوشش نے عرشؔ صہبائی کو اچھا فنکار ہونے کا پروانہ عطا کیا

ہے۔ان کی نظموں میں اصلاحی پہلو بھی جلوہ گر ہے۔ظلم وستم سے انہیں نفرت ہے اور صداقت سے محبت، ان کی نظمیں عریانی کیفیات اور رموز حسن وعشق سے مالا مال ہیں۔ان کی نظموں میں مزاح کا رنگ شدید جذبے و بغاوت کے ساتھ ملتا ہے۔انہوں نے نظموں میں سنجیدگی، خیال انگیزی اور ترتیب وتسلسل کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ان کی شاعری میں ایسا درس موجود ہے کہ جس کے ذریعے زندگی کے اہم مسائل کا حل کیا جا سکتا ہے۔

عرشؔ صہبائی نے اگر اردو نظم میں نئی دنیا قائم کی ہے تو جو قطعات کہے ہیں ان میں بھی انہیں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس صنف کو بھی انہوں نے اپنا ظہار خاص کا حصہ بنایا ہے۔ انہوں نے جتنے بھی قطعے لکھے ہیں ان میں آورد سے کام نہیں لیا بلکہ ان کی فطرت میں آمد ہے اس لئے ان کے قطعات میں کوئی قطعہ بھی بھرتی کا نہیں ملتا۔عرشؔ صہبائی ایک بلند پایہ غزل گو ہیں اس لئے ان کی شعری صلاحتیں قطعے کی صنف میں بھی زیادہ اجاگر ہوتی ہیں۔ جدید قطعہ کی ابتدا درحقیقت احسان دانشؔ سے ہوتی ہے۔ان کے مجموعہ کلام ''دردِ زندگی'' میں ان کے 33 قطعات شامل ہے ۔اردو میں نریش کمار شادؔ ،اخترؔ انصاری، عبدالحمید عدمؔ، احمد ندیمؔ قاسمی اور رئیسؔ امروہی وغیرہ ایسے شعرا ہیں جنہوں نے دیگر اصناف سے زیادہ بحیثیت قطعہ نگار شاعر زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے شعراء ہیں جنہوں نے شاعری کی دوسری اصناف کے علاوہ قطعہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔انہیں ناموں میں عرشؔ صہبائی بھی ایک ایسا ہی نام ہے جنہوں نے اردو غزل و نظم کے ساتھ ساتھ قطعہ نگاری میں بھی اپنا ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ دور جدید میں عرشؔ صہبائی نے بھی قطعہ گوئی کے اصول وضوابط کو مدنظر رکھتے ہوئے اس صنف کو اپنایا ہے۔انہوں نے قطعے کو ایک مستقل صنف کی حیثیت دیتے ہوئے اس میں بعض نئی خصوصیات پیدا کیں جن کا التزام ان کے معاصرین کی قطعہ نگاری میں نہیں ملتا۔اس بنا پر ان کے قطعات کو ہم جدید قطعات کہہ سکتے ہیں۔جدید قطعہ دراصل مختصر نظم ہوتا ہے جس میں مصرعہ بہ مصرعہ خیال کی تعمیر ہوتی ہے۔قطعہ میں کوئی مصرعہ بھی غیر ضروری اور بھرتی کا نہیں ہوتا۔عرشؔ صہبائی نے اپنے قطعات میں اس فنی وصف کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔جدید قطعے کے لئے انہوں نے چار مصرعوں کی قید رکھی ہے اور خود انہوں نے جتنے بھی قطعات کہے ہیں وہ چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔

اردو نظم نگاری میں جس قدر انہوں نے کلاسیکی روایت کی پاسداری کی ہے قطعہ نگاری میں وہ بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ان کے کلام میں (131) قطعات ملتے ہیں جو ان کی قطعہ نگاری کا تمام سرمایہ ہے اور جو ان

کے شعری مجموعے ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' میں نظموں کے ساتھ شامل ہیں۔ان کے یہ سبھی قطعات ان کے شعری مجموعے ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' میں شامل ہیں۔عرشؔ نہایت ہی ذہین انسان تھے۔انہوں نے قطعہ نگاری میں نئے تجربے کیے اور قطعہ نگاری کی محدود دنیا کو وسیع کرنے کی کوشش کی۔نئے موضوعات پر قلم اٹھایا اوران کو دلچسپی عطا کی۔انہوں نے روایتی موضوعات کو بھی بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔کبھی وہ اپنے دور کی اخلاقی پستی کو بیان کرتے ہیں تو کبھی ملک اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔کہیں کہیں سیاست اور سیاست دانوں کی طرف طنزیہ نشانہ بناتے ہیں تو کہیں انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔غرض انہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں کی طرح قطعات میں بھی مختلف موضوعات ومنظومات کا استعمال کیا ہے۔ریاست جموں کشمیر کی ادبی روایت میں عرشؔ صہبائی نے اردو قطعے کی دنیا کو وسعت دینے کی کوشش میں نئے راستے بنائے ہیں۔عرشؔ صہبائی کے قطعات ان کی غزلوں کی تعداد کے مقابلے میں لکھے ہیں لیکن انہوں نے فنی اعتبار سے اس صنف کو استحکام بخشا ہے دوسری طرف ان کی اپنی قطعہ نگاری کا اسلوب بھی منفرد ہے۔عرشؔ کے قطعات میں یہ وصف پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے منفرد اور اچھوتے تجربوں اور مشاہدوں کو چار مصروں میں بھر پور طریقے سے پیش کر دیتے ہیں۔مثلاً:

یہ حال نہ دیکھا کبھی جس حال میں اب ہیں
اخلاق کی کی پستی پہ پشیماں ہی کب ہیں
اے عرشؔ مناسب نہیں الزام کسی پر
ہم لوگ خود ہی اپنی ذلالت کا سبب ہیں (۵۳)

ہمارے ملک کو آزاد ہوئے 70/برس سے زائد کا عرصہ ہو گیا۔آزادی کے دوران جن لوگوں کو اقتدار ملا ان میں بہت کم تھے جو اس کے اہل تھے۔جو لوگ اقتدار میں آئے ان میں زیادہ ایسے تھے جنہوں نے اسے قائم رکھنے کے لئے ایسے ایسے زاویے قائم کئے جن کا ذکر کرتے ہوئے انسانیت شرما جاتی ہے۔عرشؔ نے جس طرح غزلیات یا پھر منظومات میں مختلف موضوعات ومضامین کو پیش نظر رکھا ہے اسی طرح قطعات میں بھی انہوں نے ان موضوعات کا خوب استعمال کیا ہے۔کبھی وہ اس دور کی اخلاقی پستی کی بات کرتے ہیں تو کبھی ملک اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔کہیں کہیں سیاست اور سیاست دانوں کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔اس دنیا کا یہ دستور ہے جب کسی کو بھی کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا تو اس میں اکثر اعلیٰ صفات دیکھنے کو ملتی

ہیں لیکن وہیں جب کسی عہدے پر فائز ہو جائے تو وہ پاؤں زمین پر نہیں لگا تا، عہدے کے خمار میں وہ خود کو بھول ہی جاتا ہے۔ غرض اس نوعیت کے موضوعات کو بھی عرشؔ نے اپنے قطعات میں جگہ دی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاعر کی اپنے ماحول پر کتنی گہری نظر ہوتی ہے۔ بقول عرشؔ:

اتفاقاً اگر کوئی کم ظرف بر سرِ اقتدار آتا ہے
اختیارات کے خمار میں اپنی اوقات بھول جاتا ہے (۵۴)

عرشؔ صہبائی کے قطعات پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ادب کے ساتھ ساتھ زندگی کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک ہی خوبصورت ڈھنگ میں پیش کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ ان کے اکثر قطعات زندگی کی سچائیوں کے آئینہ دار ہیں۔ دنیا میں مفلسی انسان کو احساس کمتری کا شکار بنا دیتی ہے۔ ذیل کا قطعہ بھی حق پر مبنی ہے اگر چہ بے سہاروں پر ظلم کوئی نئی بات نہیں لیکن عرشؔ نے اسے نئے انداز میں پیش کر کے اس خیال میں جدت پیدا کر دی ہے:

دل میں احساس کمتری لاکر
سو طریقوں سے رنج دیتی ہے
مفلسی آدمی کے ہونٹوں سے
مسکراہٹ بھی چھین لیتی ہے(۵۵)

میں نے بارہا عرشؔ صہبائی صاحب کی زبان مبارک سے سنا ہے کہ انہوں نے نہایت تنگدستی کی زندگی گزاری ہے۔ وہ اس بات کے از خود شاہد رہے ہیں کہ مفلسی انسان سے کیا کیا اور کیسے کیسے امتحانات لیتی ہے۔ ان کی شاعری میں بے شمار کلام اس بات کا زندہ ثبوت ہے۔ مثلاً یہ قطعات دیکھیں:

بے ادب ،بے شعور ،آوارہ
کتنے الزام اس دھرتی ہے
جس کو دنیا یہ دیکھتی ہے غریب
اس سے کیا کیا مذاق کرتی ہے(۵٦)

زندگی ہر کسی پر سو طرح سے ستم ڈھاتی ہے اور ہر ادیب و شاعر نے زندگی کے مسائل کو اپنے یہاں ایک مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کائنات میں مفلس ہونا کسی عذاب سے کم نہیں لیکن اسی کا نام تو زندگی ہے۔ جناب غلام رسول نشاؔط کشتواڑی نے اپنے ایک قطعہ میں مفلسی کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

مفلس ہے یا کہ طائر بے پر ہے زمیں پر
مجبور ہے بے چارہ یہ افلاس کا مارا
افلاس کی چکی میں پسا جا رہا ہے
یاور ہے اس کا کوئی نہ ہے اس کا سہارا (۵۷)

ایسے قطعات آج کی زندگی کا عکاس ہیں۔ان میں آج کے انسان کی دردناک صورت حال سے بھی واسطہ پڑتا اوراس کرب سے بھی گزرنے کا احساس ہوتا ہے کہ یہ ہر حساس ذہن کا مقدر ہے۔بکھرتی ہوئی قدریں،انسانی رشتوں کا ٹوٹنا،لاچاری اور مظلوموں پر ظلم،گاؤں کو نگلتے ہوئے شہر،اپنے باطن میں خود کی تلاش غرض یہ وہ موضوعات ہیں جو آج کل کی زندگی کی دین ہیں اوراسی لئے آج کی شاعری میں نمایاں نظر آتے ہیں۔عرشؔ کی خصوصیت یہ ہے کہ اول تو وہ ان موضوعات میں اپنی شخصیت کو شامل کر کے ان کے خارجی پن کو داخلیت میں بدل دیتے تھے۔دوسرا یہ کہ ان سے عہدہ بر ہوتے وقت بھی وہ جذباتیت کا شکار ہو کر تڑاخ پر نہیں اتر آتے اور تیسری اور زیادہ اہم بات یہ کہ وہ یہیں رک نہیں جاتے بلکہ شدت احساس اور ندرت الفاظ کے ساتھ اپنے فن کو اور ابھارتے ہیں۔وہ زندگی کو مثبت اقدار اور انسان کی وجودی نیکی پر یقین رکھتے تھے اور چونکہ انسان کم ازکم اب تک اس کائنات کا مرکزی کردار ہے اس لئے وہ نہ کائنات سے مایوس ہوتے تھے اور نہ انسان سے۔انسان کی سرشت میں (ہزار برائیوں اور نفرتوں کے باوجود) محبت اصل جوہر کا درجہ رکھتی ہے اس لئے ہر درد لا علاج کی دوا بھی محبت ہی قرار پاتی ہے۔یہ محبت دو انسانوں تک محدود نہیں بلکہ اس کے دائرۂ عمل میں پوری انسانیت اور آگے بڑھ کر پوری کائنات آجاتی ہے اور ایک فرد کو خود کے دکھ درد سے بے نیاز کر کے پوری انسانی برادری سے جوڑ دیتی ہے۔ایسا انسان پھر اپنی سے زیادہ دوسروں کی پرواہ کا قائل ہو جاتا ہے:

تلخ ہوتا ہے جام غم لیکن
پینے والے اسے بھی پیتے ہیں
ہم نے سیکھا ہے یہ محبت میں
دوسروں کے لئے بھی جیتے ہیں(۵۸)

عرشؔ کے قطعات میں یہاں زندگی اوراس کے مختلف پہلو نظم ہوئے ہیں وہیں موت کا منظر بھی وہ بڑے عالمانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں زندگی سے بے زاری کے واضح نقوش مل جاتے ہیں۔وہ اس اس بات کے قائل تھے کہ انسان کچھ بھی کرلے اسے زندگی کی پریشانیوں اور مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل نہیں

ہوسکتا کیوں کہ غم و آلام زندگی کا وقار ہیں۔اسے ایک ہی صورت میں فرار ممکن ہے کہ وہ دنیا کو الودا کہہ دے اور اگر یہ اس کے بس میں نہیں تو غم و آلام سے دوچار ہونا اس کا مقدر ہے۔اس سلسلے میں عرشؔ کا یہ قطعات قابل داد ہے:

غیر ممکن ہے زندگی سے فرار
آدمی بھاگ کر کہاں جائے
یا زمانے سے پھیر لے آنکھیں
یا زمانے کی ٹھوکریں کھائے (۵۹)

بادِ صرصر کے ایک جھونکے نے
لہلہاتا چمن اجاڑ دیا
زندگی بزم تو سجاتی تھی
موت نے کھیل ہی بگاڑ دیا (۶۰)

زبان و اظہار کی سادگی کے باوجود عرشؔ کے قطعات یک سطحی یا محض اطلاعاتی نہیں ہوتے بلکہ ان میں تہہ داری اور رمزیت کی وہ کیفیت بدرجہ اتم ہوتی ہے جو شاعری کی پہچان ہے۔عرشؔ صنف قطعہ کے مزاج داں ہیں اس لئے تلخ سے تلخ بات کرتے ہوئے بھی ان کا لہجہ نرم اور سجل رہتا ہے۔وہ زندگی کی کھردری حقیقتوں کو فنی سطح تک لانے کے قادر ہیں اور اس سلسلے میں الفاظ اور صوتی آہنگ ان کے سب سے بڑے ہتھیار ہیں۔ وہ بے رحم سچائیوں کے اظہار کے لئے زبان کے ساتھ زبان کے ساتھ بے رحمی کے قائل نہیں تھے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ زندگی کی آلودہ حقیقتوں کو بھی وہ فنی شفافیت عطا کر دیتے تھے۔یہی وجہ ہے ان کے پاس ہیئت یا زبان کے ظاہری روپ میں کوئی اجنبی تجربہ نہیں آتا البتہ معنوی اعتبار سے ان کے اشعار ایسے تجربوں سے دوچار کرتے ہیں جو حسی اور تخیلی سطح پر نئے بھی ہیں اور ہم عصر زندگی کے آئینہ دار بھی ہیں۔مثلاً:

جام کے پاش پاش ہونے سے
ربط کیف و سرور ٹوٹ گیا
موت کی اک ذرا سی ٹھوکر سے
زندگی کا غرور ٹوٹ گیا (۶۱)

عرشؔ کے ان قطعات کا موضوع نیا نہیں ہے بلکہ اس عنوان پر عرشؔ سے پہلے بھی کئی شعرا نے بہت کچھ کہا ہے اور بہت بہتر انداز میں کہا ہے۔مثلاً فانیؔ کا یہ قطعہ ملاحظہ کریں:

دم لینے کی تو مہلت ملنا ہی چاہیے تھا
دن رات بحر غم میں کیا فرق چاہیے تھا
فانی کی زندگی بھی کچھ زندگی تھی یا رب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیے تھا (۶۲)

اسرارالحق مجاؔز کا یہ قطعہ بھی زندگی اور موت کا مرقع ہے:

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسماں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے (۶۳)

عبدالحمید عدؔم کے یہ قطعات بھی اسی رنگ کے ہیں:

اک حسین جوئبار بہتی ہے اک شکستہ سے مقبرے کے قریب
زندگی بے قرار رہتی ہے(۶۴) موت کتنی مداخلت بھی کرے

زندگی ہے اک حسین سزا
زیست اپنی ہے غم پرائے ہیں
ہم بھی کن مفلسوں کی دنیا میں
قرض کی سانس لینے آئے ہیں (۶۵)

زندگی میں مفلسی، غم، الم، یاس وغیرہ ایسے احساسات ہیں جو نہ ہوں تو انسان زندگی کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوسکتا لیکن اگر یہ ہوں تو بھی انسان کی زندگی راحت وسکون سے خالی ہوتی ہے۔شوریدؔہ کاشمیری کے اس قطعہ سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

زہر ہیں زہر زندگی کے لئے اُف یہ وسواس یہ شکوک یہ وہم
موت بہتر ہے آدمی کے لئے(۶۶) ان سے یارب نجات ورنہ

مجاؔز، شوریدہ کاشمیر، عبدالحمید عدؔم کے قطعات میں زندگی کا جو رچاؤ موجود ہے وہی عرشؔ صہبائی کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے مثلاً اسی قطعے سے ملتا ہوا ایک قطعہ عرشؔ کے ہاں یوں موجود ہے:

زندگی کا کمال تو دیکھو
غم میں بھی یہ خوشی سی پاتی ہے

اس سے بڑھ کر ہو کیا فراخ دلی
موت کو بھی گلے لگاتی ہے(٦٧)

عرشؔ ملسیانی کے یہاں بھی اسی نوعیت کے قطعات مل جاتے ہیں جن میں حیات اور قضا کی اہمیت کو وہ برابر ٹھہراتے ہیں۔قطعہ ملاحظہ کیجئے:

جاوداں ہونے کی خواہش ہے بشر کو لیکن
جاودان ہوتا تو کیا جانیے کیا ہو جاتا ہے
زندگی پر نہ اگر موت عنایت کرتی
ہو کے مختار، ہر شخص ،خدا ہو جاتا(٦٨)

بہرحال یہ عرشؔ صہبائی کی انفردیت قرار دیں یا روایتی نقطہ نظر کہ وہ اپنے قطعات میں دوسروں کی زندگی کو بھی اجاگر کرتے ہیں وہ چاہے کسی بھی فرقہ یا گروہ سے تعلق رکھتے ہوں۔اس سے ان کی نظروں کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔وہ غریب مزدور جن کی طرف کوئی دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا ان کی زندگی کو نمایاں طور پر بیان کرتے ہیں۔اوران کا تعریف کرتے ہیں۔وہ مصائب میں رہ کر بھی دل شکستہ نہیں ہوتے۔زندگی کے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں:

قابل رشک ہے حیات ان کی غم اٹھاتے ہیں شکر کرتے ہیں
ریل کی پٹریوں سے جو دن رات کوئلے چن کے پیٹ بھرتے ہیں(۵۹)

زندگی سے متعلق ایک قطعہ ہو تو اس کا ذکر کیا جائے۔شاعر کی توجہ قدم قدم پر زندگی کی طرف رہتی ہے۔ اوراس میں جو خوبیاں ہیں وہ ان سے متاثر ہوتا ہے۔اس سے زندگی کی نئی راہیں تلاش کرتا ہے:

آپ کس سوچ میں ہیں گم سم سے کیا تذبذب ہے کیا ارادہ ہے
جس طرف میکدہ ہے اس جانب زندگی کا حسیں جادہ ہے (٦٠)

زندگی کیا ہے دامن صد چاک
اس کو دن رات سی رہا ہوں میں
یہی مقصد ہے میرے جینے کا
اسی مقصد سے جی رہا ہوں میں(٦١)

اس خیال میں ایک دنیا بسی ہوئی ہے۔بجائے اس کے کہ زندگی پر کوئی خوف طاری ہو وہ موت کو گلے

لگاتی ہے۔حقائق کچھ بھی ہوں لیکن شاعر کے انداز بیاں نے اس منظر کو باوقار طریقہ سے بیان کیا ہے۔اس سے زیادہ حوصلہ کی مثال اور کہاں ملے گی۔اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کا ذہن کتنا زرخیز ہے جو ایسے انداز سے سوچتا ہے۔یہ قطعہ ملاحظہ کریں جس میں شاعر زندگی سے گلہ بھی کرتا ہے جو برحق ہے:

کوئی راحت میرے پاس آتی نہیں ہر مسرت مجھ سے ہے سہمی ہوئی
مجھ کو رکھا ہے اس نے محروم سکوں زندگی کو کیا غلط فہمی ہوئی (۶۲)

اس پہ کیا کیا ستم نہ ٹوٹے عرش
پھر بھی شان و ادا سے گزری ہے
موت کی لرزہ خیز وادی سے
زندگی مسکرا کے گزری ہے (۶۳)

عرشؔ نے بے شمار ایسے غریب اور پست الفاظ اپنے قطعات میں استعمال کئے ہیں کہ ان سے قبل چند گنے چنے شعرا کے ہاں ہی ایسے الفاظ دیکھنے کو ملتے ہیں۔اکثر ہر کوئی ان کے استعمال سے گریز کرتا ہے لیکن کبھی وہ اس انداز سے استعمال کئے جاتے ہیں کہ نگینہ کی صورت معلوم ہوتی ہے۔ایسے الفاظ میں لفظ ''طوائف'' بھی شامل ہے اور پھر اس کا استعمال شاعری میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔لیکن اس قطعہ میں لفظ طوائف اس خوبصورتی کے ساتھ استعمال ہوا ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نظر نہیں آتا۔یہ لفظ غیر مہذب ہو کر بھی اہم بن گیا ہے۔اور قطعہ کی جان نظر آتا ہے:

جس کو کہتے ہیں دوستی کا فرض بھول کر بھی ادا نہیں کرتی
وہ طوائف ہے عرشؔ یہ دنیا جو کسی سے وفا نہیں کرتی (۶۴)

یہاں طوائف کے معنی اور واضح ہو گئے ہیں اور صرف جنس تک محدود نہیں رہے۔اس طرح قارئین کو عرشؔ صہبائی کے قطعوں پر جگہ جگہ ایسی خوبیاں ملیں گی۔یہاں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انہوں نے اہل ادب کو کئی نئے قطعات عطا کئے ہیں۔اگر چہ طوائف کا جہاں استعمال کیا گیا ہے اس قطعہ کا ہم حوالے دے چکے ہیں لیکن اس قطعہ میں بھی طوائف کا استعمال تعریف سے بہت پرے ہے۔یہاں اسے ظلمت سے تشبیہ دی گئی ہے کس خوبصورت طریقے سے مفہوم بیان کیا گیا ہے:

جو ہیں ظلمت پرست دُنیا میں زندگی ان کی یوں گزرتی ہے
اک طوائف تمام دن جیسے رات کا انتظار کرتی ہے (۶۵)

عرشؔ صہبائی کا تمام کلام چاہے وہ کسی صنف میں بھی ہو حقائق سے وابستہ ہوتا ہے۔ ایک طوائف کی زندگی رات سے وابستہ ہے اس لئے ظلمت پرست ترکیب نے اس مفہوم کو اور واضح کر دیا ہے ایسی باریکیاں آپ کو بہت کم ملیں گی۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک پرانے مفہوم کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ قطعہ میں نغمگی بھی پائی جاتی ہے۔ یہ خوبی ان کے کلام میں ہر جگہ ملے گی اس خوبی کی وجہ سے ان کا کلام قاری کو ازبر ہو پاتا ہے۔ اور دوسروں کے لئے تقلید کا باعث بنتا ہے۔ دوسروں پر ناحق جبر وظلم کرنے والوں کی زندگی کو عرشؔ طوائف کی سی زندگی تعبیر کرتے ہیں۔ عرشؔ کے علاوہ بھی اردو میں کچھ شاعر ملتے ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کے متعلق طوائف کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان شعرا میں قتیلؔ شفائی کے یہاں ایسا ہی ایک قطعہ ملتا ہے جس میں وہ زندگی کو طوائف تصور کرنے پر مجبور ہیں۔ قطعہ ملاحظہ کیجئے:

کوئی بر ہم ہے تو خائف کوئی مطمئن کوئی نہیں ہے اس سے
زندگی ہے کہ طوائف کوئی (۶۶) نہیں کرتی یہ کسی سے بھی وفا

عبدالحمید عدمؔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

زیست اپنی ہے غم پرائے ہیں زندگی ہے کہ اک حسیں سزا
قرض کی سانس لینے آئے ہیں(۶۷) ہم بھی کن مفلسوں کی دنیا میں

عرشؔ کے ان قطعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی کے مطالعہ کے بارے میں کہاں نکل گئے ہیں معلوم نہیں ان پر جیسے یہ وہی یا الہام ہوتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ وہ واحد اکیلے شاعر ہیں جو زندگی کی ان سچائیوں سے واقف ہیں بس ان کا انداز بیان دوسروں سے مختلف ہے۔ البتہ اسی طرز کا ایک قطعہ مہیشؔ چندر نقشؔ کے یہاں بھی ملتا ہے:

اپنی دوشیزگی کو کھوتی ہے جب کلی باد صبح سے مل کر
زندگی شرمسار ہوتی ہے(۶۸) مسکراتی ہوئی موت کی آنکھیں

عرشؔ کے قطعات میں انسان کو مرکزیت حاصل ہے۔ انسان کائنات کا مرکز ومحور ہے۔ دنیا میں انسانوں کے دم سے زندگی اور رونقیں نظر آتی ہیں۔ انسان کی موجودگی کائنات میں رنگوں کی ضمانت ہے۔ انسان کے زندگی گزارنے کے کچھ اصوال اور ضابطے ہوتے ہیں جو انسان کو دوسری مخلوقات سے مختلف کرتے ہیں۔ ان اصولوں سے ہی انسانیت کو وقار ملتا ہے۔ چونکہ عرشؔ صہبائی کی زندگی انسانی قدروں کی آئینہ دار ہے

ان کے کلام پر اس کا گہرا اثر ہے۔اس قطعہ میں انسانی خوبیاں کس شدت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئی ہیں:

بے نواؤں کو ، بے سہاروں کو   چاک زخم جگر کے سینے دو
یہ تقاضا ہے آدمیت کا   خود جیو دوسروں کو جینے دو(۶۹)

ہم یہ بات جانتے ہیں کہ قطعات میں استعمال کیا گیا خیال نیا نہیں۔ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے آدمیت کا یہی تقاضا رہا ہے کہ ہر انسان خود بھی جیئے اور دوسروں کو بھی جینے دے۔لیکن جس انداز سے یہ قطعہ کہا گیا ہے اس نے اسے نیا بنا دیا ہے۔اور قطعہ کے پہلے دو مصرعوں نے قطعہ کو ایک مضبوط بنیاد دی ہے۔عرشؔ صہبائی کے قطعوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں شامل تمام مصرعے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ اس طرح ان میں ایک گہرا رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ یہ فنی باریکیاں قطعہ کو عظیم بنا دیتی ہیں اور قطعہ دل میں اتر جاتا ہے۔اس صورت میں اس کا مقبول ہونا قدرتی بات ہے:

لب پہ شکوہ کبھی نہ لاؤں گا   رنج جھیلوں گا غم اٹھاؤں گا
زندگی کے وقار کی خاطر   میں بہرحال مسکراؤں گا(۷۰)

پھیل جائیں جو تیری ہستی پر   حسرت و رنج و یاس کے سائے
اپنی تدویر سے بنا لے بات   جب مقدر جواب دے جائے(۷۱)

عرشؔ نے اپنی زندگی جس پریشانی اور بدحالی میں گزاری اس کا ذکر انہوں نے کئی مقامات پر کیا ہے۔اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہیں کئی گھریلو کام بھی انجام دینے ہوتے تھے جن میں کھانا بنانے سے لے کر لپائی تک شامل ہیں۔انہیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی کہ وہ پیوند لگے کپڑوں میں اسکول جایا کرتے تھے۔انسان کی زندگی میں کچھ واقعات ایسے گزرتے ہیں کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہوتا کہ آیا وہ زندگی جی رہا ہے یا موت کی آغوش میں ہے۔ ہر پریشانی کے بعد آسانی ہے اس امید پر وہ ہر مصیبت کا نہایت عاجزی سے برداشت کرتا ہے لیکن حقیقتاً وہ رنج والم کے ایسے دائرے میں ہوتا ہے کہ محض سانس لینے کو زندگی تصور کرتا ہے۔کشمیر لال ذاکر کا ایک قطعہ دیکھئے جو اسی کیفیت کی ترجمانی کر رہا ہے:

ابتدا ہے کہ انتہا کیا ہے   سوچتا ہوں یہ ماجرا کیا ہے
گر میں اس کو حیات سمجھوں تو   میرے اللہ پھر قضا کیا ہے(۷۲)

عرشؔ کو اپنے بچپن سے جوانی تک کئی طرح کے تجربات وحوادث کا سامنا کرنا پڑا لیکن آخر ان تمام مشکلوں

کا حل بھی ہوا اور انہیں زندگی کی تمام سہولتیں نصیب ہوئیں جس کا اندازہ ان کے اس قطعے سے لگایا جا سکتا ہے:

گلستان حیات میں اے عرشؔ منتظر پر بہار جلوے ہیں
ایسے عالم میں کیا کرے کوئی اک نظر ہے ہزار جلوے ہیں(۷۳)

عرشؔ صہبائی ہر کسی کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرتے تھے لیکن اکثر لوگ ان کی سادگی کا غلط فائدہ اٹھا لیتے تھے باوجود اس کے وہ انہیں اپنا عزیز گردانتے تھے۔انہوں نے اپنی زندگی میں وفا کے بدلے میں جفا کرنے والے بھی دیکھے ہیں۔اسی لئے شاید وہ یہ کہنے پر مجبور تھے:

زندگی کی شگفتہ راہوں میں کانٹے اک اک قدم پہ بوتے ہیں
آجکل کے یہ خود غرض احباب آستینوں کے سانپ ہوتے ہیں(۷۴)

قدر کیا اس کو دوستی کی عرشؔ جو خلوص و وفا سے عاری ہو
نیک و بد کی اسے کہاں پہچان؟ جس کا شیوہ فریب کاری ہو (۷۵)

عرشؔ زندگی کو ایک امتحان گردانتے تھے۔اس میں جو مشکلات اور حادثات پیش آتے ہیں وہی زندگی کا حاصل تھے۔وہ ہر حال میں زندگی کو بامعنی خیال کرتے ہیں اور اس سے ہر حال میں محبت کرتے تھے۔وہ زندگی کے ہر پہلو کو سمجھتے بھی تھے۔انسان کے ضمیر کے سلسلے میں ایک اور قطعہ پیش خدمت ہے۔انسان کا ضمیر اس کا رہنما ہوتا ہے اور وہ اس رہنما کے ساتھ انسان کیا سلوک کرتا ہے۔وہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے:

ناز ہے جس پر آدمیت کو گو ہر بے نظیر بکتا ہے
چند سکوں کے واسطے اے عرشؔ آدمی کا ضمیر بکتا ہے(۷۶)

یہاں ایک اور بات قابل تعریف ہے۔شاعر نے ضمیر کو گوہر بے نظیر قرار دیا ہے۔یہ حق پر مبنی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موصوف زندگی کی قدروں سے واقف ہی نہیں ان پر عمل پیرا بھی تھے۔اس سے اس بات کا علم بھی ہوتا ہے کہ شاعر کی اپنی زندگی تجربات و مشاہدات سے بھری پڑی تھی۔ان کے احساسات میں شدت تھی جنھیں بیان کرنے میں وہ کسی جھجک سے کام نہیں لیتے تھے۔دوسرے الفاظ میں ہمیں اس کی بے باکی کی داد دینا پڑے گی۔عرشؔ کے معاصرین میں بھی ایسے قطعات ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں زندگی کے ٹھوس حقائق کی نقاب کشائی کا جذبہ کارفرما ہے۔امینؔ بانہالی کا یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

کئی ایسے ہیں گھر والے بھی ہیں نا آشنا جن سے
کئی ایسے ہیں جن کا ذکر اخبارات کرتے ہیں

کوئی انسان بہ ذات خود مگر کچھ بھی نہیں کرتا
یہ سب انسان کے اچھے برائے حالات کرتے ہیں(۷۷)

امین آج کل کے سیاسی رہنماؤں پر کتنی معصومی سے دلالت پیش کرتے ہیں کہ کئی ایسے ہیں جن سے ان کے اپنے ہی بے خبر ہیں، کئی وہ جن کا کردار اخبارات سے پتہ چلتا ہے۔شاعر کا کہنا ہے کہ کوئی انسان از خود کچھ نہیں کرتا بلکہ حالت سے مجبور ہو کر وہ سب کچھ کرتا ہے۔اسی سے ملتا ہوا خیال عرشؔ صہبائی کے یہاں بھی ملتا ہے۔ایک ہی خیال کو مختلف شاعر اپنے اپنے انداز میں ڈھالتا ہے اور ہر کسی کا اپنا الگ شعری پیمانہ اور الگ انداز بیان ہوتا ہے۔عرشؔ نے اپنے یہاں اسی خیال کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے:

بے بسوں اور بے سہاروں پر ستم بے پناہ کرتا ہے
اقتدار اور وقار کی خاطر آدمی ہر گناہ کرتا ہے (۷۸)

انسان کوئی بھی ہو جب تک کسی کو اقتدار اور وقار حاصل نہیں ہوتا وہ عام آدمی ہی رہتا ہے لیکن جب اسے یہ نعمت حاصل ہوتی ہے تو یہ بے بسوں اور بے سہاروں پر بے پناہ ستم توڑتا ہے اس کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارے ملک میں ایسا کہاں نہیں اس کے ظلم وستم کا شکار کمزور لوگ بنتے ہیں جن کے پاس ظلم وستم سہنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔وہ اس قابل بھی نہیں کہ خود پر ہونے والے جور وستم کے خلاف احتجاج بھی کر سکیں یہ قطعہ ایسے لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے اور انہیں مجبوری کی گہری نیند سے بیدار ہونے کی تحریک دیتا ہے۔اسی نوعیت کا ایک قطعہ اخترؔ انصاری کے ہاں بھی ملتا ہے جس میں وہ نہایت طنزیہ پیرائے میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان کسی حال میں بھی گناہ سے پرہیز پر قائل نہیں ہوتا ہے۔قطعہ ملاحظہ کیجئے:

جی کو نا حق نڈھال کرتے ہو روح کو پائمال کرتے ہو
آدمی اور گناہ سے پرہیز تم بھی اختر کمال کرتے ہو (۷۹)

اخترؔ کی یہ بات صداکت پر مبنی ہے لیکن عرشؔ کا انسان کی نفسیات کے معاملے میں اپنا الگ نظریہ ہے۔ وہ اپنے ایک قطعہ میں یوں فرماتے ہیں:

دل پہ چھاتی ہے ایک بہشت سی اپنے سائے سے خوف آتا ہے
جب بھی کوئی گنا سرزد ہو آدمی کانپ کانپ جاتا ہے(۸۰)

ایسا صرف اور صرف حساس دل لوگوں کے ساتھ ہی واقعہ ہوتا ہے کہ گناہ ہونے پر ان کا ضمیر انہیں احساس گناہ کرواتا ہے۔سرکش اور بے خوف لوگوں کے ساتھ کچھ بھی ہوانہیں صرف اپنے اپنوں کا خیال رہتا، وہ

اپنے مقاصد تک تکمیل کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔عرشؔ کا یہ اس بات کی صداکت بیان کرتا ہے:

صحبت گل میں رہ کے بھی ہر دم　　فطرت خار و خس نہیں جاتی
دولت بے شمار پاکر بھی　　انسان کی ہوس نہیں جاتی(۸۱)

عرشؔ کے قطعات حقیقی خیالات و جذبات پر مبنی ہیں۔اہل سیاست پر طنز ان کی شاعری کا ایک اہم جز رہا ہے۔ان کے قطعات ہی نہیں نظم،غزل اور دوہا سبھی اصناف میں سیاسی رنگ ملتا ہے۔جس بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ عرشؔ اپنے سماج کی برائیوں کا پردہ فاش کرتے تھے اسی شدت کے ساتھ انہوں نے اپنے سیاسی رہنماؤں اور ان کی سیاسی کاروایوں کا پردہ فاش کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ان کے یہ قطعات دیکھیں:

یہ مانتے ہیں کہ بازار عقل بند ہوا
نہیں غلط کہ جہالت کا دور دورہ ہے
سنبھل ہی جائیں گے ہم لوگ ٹھوکریں کھا کر
اگر چہ گندی سیاست کا دور دورہ ہے (۸۲)

عرشؔ کے قطعات سے ان کی بے باکی اور بے خوفی کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کے اسی انداز کے سبب ان کے دوست کم دشمن زیادہ بن جاتے تھے۔نظموں کی طرح ان کے قطعات میں بھی وہی روانی و تسلسل،سادگی و سلاست،جذبے کا خلوص اور واقعیت ہے۔انہوں نے سیاسی رہنماؤں پر کھل کر چوٹیں کی ہیں۔جیسا کہ پہلے بھی ذکر گزرا ہے کہ ایسی چوٹین ان کے معاصرین کے ہاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ریاست جموں وکشمیر کے بہترین غزل گو شاعر شوریدہؔ کاشمیر کے کلام میں بھی سیاست پر طنز ملتی ہے۔ان کا ایک قطعہ ملاحظہ کریں:

دن دن بڑھتے ہیں دنیا کے دھندے
پڑتے ہیں گردنوں میں کیا کیا پھندے
تانے ہیں خدایانِ سیاست نے یہ جال
کیونکر نہ گرفتار بلا ہوں بندے(۸۳)

جب سیاسی رہنماؤں پر طنز کا سلسلہ چل ہی پڑا ہے تو خورشید بسملؔ کے اس قطعے میں آج کے ساسی کارکنان پر طنز کا الگ انداز ملتا ہے:

بنے دل پھینک ہیں اپنے منسٹر
حسیوں کو بڑے پیارے ہوئے ہیں

اجی ! ترشی سے نہ تم ان سے بولو
بچارے عشق کے مارے ہوئے ہیں (۸۴)

ریاست جموں و کشمیر گزشتہ کئی برسوں سے نامساید حالات سے دوچار ہے اور اہلِ ریاست جن غیر موافق حالات کا شکار ہیں اس کا وہاں کے شعراء اور ادبا کو پورا پورا احساس ہے اور انہوں نے جرات اور بے باقی سے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ ریاست کے ان ناپسندیدہ حالات صرف سیاسی حالات ہی نہیں زمینی حالات بھی بہت حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ مثلاً خورشید بسملؔ کا ایک اور قطعہ دیکھئے:

زیادہ مہنگائی نہ تھی دفاتر میں — کام چلتا تھا شادمانی سے
سینکڑوں میں اب نہیں ہوتا — کل جو ہوتا تھا چائے پانی سے (۸۵)

زیر مطالعہ قطعات میں کہیں کہیں ایسے قطعات بھی نظر سے گزرتے ہیں جن کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مخاطب محبوب ہے لیکن یہ قطعات محبوب کے برعکس اہل سماج کے سرپرست رہنماؤں سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ ان کا ایک قطعہ ایسا ہے جس میں شاعر نے اپنے سرپرست حکام کی خامیوں کا اظہار طنزیہ لہجے میں کیا ہو۔ طنز بھی کتنی عاجزی سے کی ہے یہ ان کا اپنا انداز ہے:

مکر، جور و جفا، ریا کاری — آپ ان میں کمال رکھتے ہیں
ہم سمجھتے ہیں ہم غریبوں کا — آپ کتنا خیال رکھتے ہیں (۸۶)

جب قطعہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو شک گزرتا ہے کہ محبوب کوئی سیاسی رہنما ہے۔ ایسی خوبیاں عام طور پر سیاسی رہنماؤں میں پائی جاتی ہیں۔ خیر قاری کچھ بھی سمجھے لیکن شاعر نے جس طریقے سے طنز کی ہے وہ ان کا اپنا الگ انداز ہے۔ عرشؔ صہبائی کے قطعات میں مضمون کوئی بھی ہو بنیادی طور پر پر وہ اعلیٰ شاعری کا نمونہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان میں ''شعر ابرائے شعر گفتن'' والی کوئی بات نہیں ہوتی۔ عرشؔ صہبائی کو قطعہ نگاری میں بھی ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ عرشؔ صہبائی کے قطعات پڑھنے کے بعد حساس ہوتا ہے کہ انہوں نے جس بات کا اظہار کیا ہے وہ خود اس سے دوچار رہے ہیں اسی باعث ان کا ہر قطعہ پر اثر ہے۔ اس میں کسی قسم کی بناوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ جب ہم سماج پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو غربت تنگ دستی و بے بسی کا پرچم ہر جگہ لہراتا نظر آتا ہے۔ بے شمار لوگ اس کی زد میں ہیں، بے بسی کا جو طرح ردعمل ہے وہ سب پر ظاہر ہے لیکن جب اسے منظوم طریقے سے بیان کیا جائے اور وہ بھی عرشؔ صہبائی کے ذریعہ تو قاری تڑپ اٹھتا ہے کیونکہ ان کا بیان کرنے کا انداز الگ ہے:

آدمی بے بسی کے عالم میں — ایسے ٹھنڈی سی آہ بھرتا ہے

کوئی بے تاج و تخت شہزادہ جیسے ماضی کو یاد کرتا ہے (۸۷)

حسن بیان نے اس میں اور بھی جان ڈال دی ہے۔ یہاں احساس کمتری ہر بات کی وضاحت کرتا ہے۔ مفلسی کی اس سے زیادہ تفسیر نہیں ہوسکتی۔ یہ وہی جانتے ہیں جنہوں نے مفلسی میں زندگی گزاری ہو۔ وہ کون سا مضمون ہے جسے عرشؔ صہبائی نے اپنے اشعار میں استعمال نہیں کیا اور اسے شعری لباس نہیں پہنایا۔ یہ قطعہ قاری کو اپنی طرف کھینچتا ہے:

اک جان خزیں ہے جس پر ہم لاکھ صدمے اٹھائے جاتے ہیں
باوجود ان گنت مصائب کے ہر طرح مسکرا کے جاتے ہیں (۸۸)

وقت کے ساتھ بڑھتی رہتی ہیں زندگی کی ضرورتیں کیا کیا
جیسے دریا بدلتا رہتا ہے ہر قدم اپنی صورتیں کیا کیا(۸۹)

دور تک ہے الم کی تپتی دھوپ ہم ترستے ہیں راحتِ دل ہو
زندگی جس طرح ہو ریگستان اور خوشی کوئی اڑتا بادل ہو(۹۰)

عرشؔ صہبائی کے کئی قطعات ایسے بھی ہیں جنکے مضامین نئے نہیں بلکہ کئی دوسرے شعراء نے بھی وہ مضامین باندھے ہیں۔لیکن جس طریقے سے عرشؔ صہبائی نے بیان کئے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔ یہاں ان کی ذہنی صلاحیتوں کی داد دینا پڑتی ہے محبوب کا کئے ہوئے وعدے کو بھول جانا کوئی نئی بات نہیں، سالہا سال سے اس مضمون پر شعر کہے جا رہے ہیں۔لیکن یہ تشبیہ پہلی بار نظر سے گزری ہے:

ان کے وعدے کا کیا یقین جن کو
بھولنے کی ادا بھی آتی ہے
ان کا وعدہ ہے رند کی توبہ
شام پڑتے جو ٹوٹ جاتی ہے(۹۱)

عرشؔ صہبائی نے صنف قطعہ کے تمام فنی تقاضوں ولوازمات کو مدنظر رکھتے ہوئے انسانی زندگی سے متعلق حسن وعشق، قلبی واردات، تجربات ومشاہدات، تاریخی، سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی جیسے موضوعات بڑی فنکاری سے اس صنف میں برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ واقعات حسن وعشق کا بیان اردو شاعری کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ حسن محبوب میں آنکھوں کو ایک اہم خصوصیت حاصل ہے۔ عبدالحمید عدمؔ محبوب کی

آنکھوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تمہارے حسن کو میری نظر لگی ہے ضرور
کہاں ہو پہلے سے تبدیل ہو گئے ہو تم
خدا کرے میری آنکھوں سے نور چھن جائے
نگاہ شوق میں تحلیل ہو گئے ہو تم(۹۲)

اختر انصاری کہتے ہیں:

کوئی جنگل میں گا رہا ہے گیت   دھیمی آواز، دکھ بھرا لہجہ
دل کو گویا یہ مل گیا ہے حکم   اشک خوں بن کے آنکھ سے بہہ جا(۹۳)

جاں نثار اختر کا قطعہ ملاحظہ کریں:

حسن کا عطر ، جسم کا صندل   عارضوں کے گلاب زلف کا عود
بعض اوقات سوچتا ہوں میں   ایک خوشبو ہے صرف تیرا وجود(۹۴)

حسن وعشق ایک ایسا موضوع ہے جسے صنف غزل کے علاوہ دیگر شعری اصناف میں بھی بڑی خوبی و کامیابی کے ساتھ برتا ہے لیکن اکثر و بیشتر شعرا نے اس موضوع کو صنف غزل میں ہی برتنا مناسب سمجھا ہے اور اسی میں اپنی کامیابی کے قائل رہے ہیں لیکن عرش صہبائی نے اپنی غزلیہ شاعری کی طرح اپنے قطعات میں بھی اس موضوع کو بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔اس ضمن میں یہ قطعات دیکھئے:

ہم کلامی تو دور کی ہے بات   دید کو بھی ترس گئیں آنکھیں
آپ آئے نہ حسب وعدہ جب   ابر بن کر برس گئیں آنکھیں(۹۵)

عرش صہبائی کے خالص رومانی اور ہلکے پھلکے قطعات بھی اردو میں ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں۔حسن وعشق ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہر صنف میں ادبی سرمایہ موجود ہے۔ یہ موضوع غزل کے ساتھ زیادہ منسلک ہے لیکن غزل کے علاوہ دیگر شعری اصناف دوہا قطعہ وغیرہ میں بھی اس موضوع کو کئی اچھے شعراء نے برتا ہے۔اردو قطعہ میں جن شعراء نے قطعات کہے ہیں ان میں حسن وعشق،محبوب کی اداؤں وفریب کاریوں وغیرہ کا بیان ملتا ہے۔عرش کے قطعات (بالخصوص عشقیہ قطعات) میں جو گہری داخلیت ہے اس نے ان کے قطعات میں افسردگی کسک اور ایک تحت نغمہ کی سی کیفیت پیدا کردی ہے۔انہیں شعرا میں ایک عرش صہبائی بھی آتے ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنی غزلوں،نظموں،دوہوں میں بلکہ قطعات میں بھی محبوب کے حسن

وجمال کے مختلف جزیات، بے وفائی ووفا شناسی اور بغض وعداوت وغیرہ کو بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے۔ان کے قطعات میں عشقیہ مضامین خوبصورت تشبیہات واستعارات اور دل کش تراکیب ان کے مخصوص انداز بیان کے ساتھ موجود ہیں۔اس ضمن میں چند قطعات ملاحظہ کیجئے:

عین ممکن ہے عمر بھر کوئی ان حسیں وادیوں میں بھٹکا ہو
آپ کی ان دراز زلفوں میں دیکھئے کوئی دل نہ اٹکا ہو (۹۶)

اے محبت ! تیرے فقیروں کو
عظمت تخت و تاج کیا معنی
مست ہیں اپنے حال میں جو انہیں
ساری دنیا کا راج کیا معنی ! (۹۷)

چاندنی رات کہکشاں تارے راستے کی دھول ہوں جیسے
دل مرحوم اور تمنائیں اک سمادھی پہ پھول ہوں جیسے (۹۸)

عرش کی شاعری ملال اور ہجر کی سیاہ راتوں میں ستاروں سے بھرے ہوئے آسمان میں پورے روشن چاند کی رفاقتوں کو پالینے کی شاعری ہے۔عرش کے لہجے میں اس ہندوستانی لڑکے کے جزبوں کی پوری شدت اور سچائی ہے جو زندگی میں امکان بھر عشق کر کے خود پر بے شمار جذبوں اور کیفیات کو منکشف کر لیتا ہے۔ان کے بیشتر قطعات آپ بیتی ہیں جن کا مخاطب بھی خود شاعر کی ذات ہے۔اس لئے ان کے لہجے میں کہیں کہیں خود کلامی کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ان کے بعض قطعات میں آپ بیتی کے علاوہ جگ بیتی کا عنصر بھی موجود ہے۔مثلاً یہ قطعات دیکھیں:

آج ساعت یہ تیری قربت کی ساری خوشیاں سمیٹ لائی ہے
وہ کسی اور کو نصیب کہاں میرے گھر میں جو عید آئی ہے(۹۹)

اک تبسم کی بات ہی کیا تھی اس کرم سے میں شاد ہوجاتا
اس میں نقصان آپ کا کیا تھا میں اگر با مراد ہو جاتا (۱۰۰)

عرش کے یہاں عشقیہ جذبات سے تھرتھراتے ہوئے بہت سے قطعات ملتے ہیں جو ہمارے دکھتے ہوئے دلوں کی دھڑکنوں کو اور تیز کر دیتے ہیں اور ہماری سانس اور آواز رُک سی جاتی ہے۔ان کا چٹیلا پن محتاج

بیان نہیں۔مغربی شاعری کا بھی لب ولہجہ ان میں حلاوت کئے ہوئے ہے۔ان قطعات میں عرشؔ نے نہایت عاجزی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے وہ ایک طرف محبوب کی قربت کو عید سے تصور کرتے ہیں اور دوسری جانب محبوب کی ایک ہلکی تبسم کو شادمانی و بامراد ہونے کا سبب بتاتے ہیں ۔اردو کی عشقیہ شاعری میں جس پاکیزگی ،معصومیت،شرافت ،بلندووسیع تخئیل اور جن مفکرانہ احساسات کی ضرورت ہوتی ہے وہ عرشؔ کی شاعری میں بخوبی ملتے ہیں۔عرشؔ کے جذبات شوقیانہ اور عامیانہ نہیں ہیں بلکہ ایسے ہیں کہ آج کی اردو تہذیب آنکھیں بند کر کے فخر کر سکتی ہے۔ان کے یہ قطعات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے جذبات محبت کرنے والے دل کے جذبات ہیں۔ان کا محبوب کوئی فرضی اور تصوراتی نہیں بلکہ اسی دنیائے آب وگل سے تعلق رکھتا ہے۔

عرشؔ صہبائی نے جس طرح سے روزمرہ زندگی میں انسانی شخصیات کو دیکھا ہے اس کی ہو بہو تصویر اپنے قطعات میں پیش کر دی ہے جس طرح وہ بوالہوسی کا شکار رہے اور اس حقیقت کو جس خوبی سے پیش کیا ہے اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔عرش کے قطعات فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے نظر آتے ہیں۔مزید چند قطعات پیش ہیں:

کشتہ رنج و غم رہے ہیں ہم   کبھی دیکھی نہیں ہے شکل نشاط
پھر بھی ثابت قدم رہے ہیں ہم   داد دو تم وفا کی راہوں میں (۱۰۱)

زندگی کا سراغ پانے دے   زندگی میں مجھے فقط اک بار
اپنی آنکھوں میں ڈوب جانے دے   اے سراپا بہار و رعنائی (۱۰۲)

دو سمندر ہیں کیف و مستی کے   واقعی تیری نیم باز آنکھوں میں
ہم جو قائل ہیں مئے پرستی کے   اس سے ان کو بھی دخل حاصل ہے (۱۰۳)

عرشؔ کا کلام کہنے کا انداز سب سے جدا ہے وہ محبوب کی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پانا چاہتے ہیں جو بالکل نئی بات ہے۔وہ پہلے شاعر نہیں جنہوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھا ہے بلکہ اردو کے ہر چھوٹے بڑے شاعر کی شاعری میں عشقیہ جذبات کا اظہار ملتا ہے۔عرشؔ کے قطعات ان کی ذہنی اپج کا پتہ دیتے ہیں۔اردو غزل میں تو عشقیہ جذبات کی بر مار ہے لیکن بہت سے شعراء کے قطعات میں بھی ان جذبات کا اظہار ملتا ہے۔مثلاً صابرؔ دت کا یہ قطعہ پیش ہے:

روز حالات مارتے ہیں مجھے
روز جیتا ہوں تیری آنکھوں سے

کچھ تو مستی شراب دیتی ہے
کچھ میں پیتا ہوں تیری آنکھوں سے (۱۰۴)

عبدالحمید عدمؔ نے محبوب کی آنکھوں پر عرشؔ کے خیال سے کچھ کچھ ملتا ہوا قطعہ کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مے اور میکدے سے جو دامن چھڑا لیتے ہیں وہ بھی محبوب کی آنکھوں ڈوب ہی جاتے ہیں۔ چونکہ محبوب کی آنکھ سے بڑھ کر نشہ شراب میں بھی نہیں۔ قطعہ ملاحظہ کیجئے:

کون ہے جن نے مے نہیں چکھی کون جھوٹی قسم اٹھاتا ہے
میکدے سے جو بچ نکلا ہے تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے(۱۰۵)

اسی سے ملتا ہوا خیال کونریش کمار شادؔ نے اپنے قطعے میں یوں پیش کیا ہے:

اب تو کاجل کی کوئی گنجائش نہ
واقعہ ہے نہیں ہے آنکھوں میں
دوسری شئے سامنے بھی کیوں کر
جب کہ ساجن مکیں ہے آنکھوں (۱۰۶)

جان نثار اخترؔ کا بھی ایک قطعہ ملاحظہ کیجئے:

کتنی معصوم ہیں تیری آنکھیں بیٹھ جا میرے روبرو ، میرے پاس
اک لمحے کو بھول جانے دے اپنے اک اک گناہ کا احساس(۱۰۷)

عرشؔ ماحول کے اعتبار سے اگر چہ قنوطی دوری کی پیداوار تھے اور انہیں زندگی کے بیشتر حصے میں مختلف پریشانیوں اور تلخ تجربوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن ذہنی اعتبار سے رجائیت پسند تھے۔ ان کے کلام میں حسرت و ناکامی سے متعلق جن خیالات کا اظہار ملتا ہے ان کی تہہ میں بھی شگفتگی کا ایک ایسا جوہر پایا جاتا ہے جو ان کی رجائیت پسندی کی دلیل ہے۔ چوں کہ ان کے قطعات شوخی بیان سے خالی نہیں ان کے خیالات افسردگی خاطر اور غم و الم کا یاس انگیز اثر پڑھنے والے کی طبیعت پر زیادہ دیر تک نہیں رہنے دیتے۔ ان کی نفسیاتی گہرائی اور باطنی زرف بینی کلام کو ایک خاص لطف بخشتی ہے جو ان کی شگفتہ مزاجی، شوخ طبعی اور ظرافت کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ ان کی ظرافت ایک ذہنی انبساط کا باعث ہوتی ہے۔ خیالات کے علاوہ قطعات میں جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ زبان کہاں سے لائیں گے۔ پھر اتنی پاکیزہ زبان، اس سے قطعہ اور بھی پر وقار ہو جاتا ہے اس زبان میں سلاست کی بھی خوبی ہے۔ ان کا طرز اظہار ایمائی ہے وہ تفصیلات میں نہیں جاتے صرف

اشارے کر دیتے ہیں۔ان کے قطعات میں شعریت اور حسن کاری کا التزام بھر پور ملتا ہے۔انہوں نے اپنے قطعات کے ذریعے زندگی ،فطرت ،سماج اور کائنات کے بارے میں جس انوکھے زاویے کی تشکیل اور جس سرکشانہ روئے کی تفسیر کی ہے وہ ان کے تخلیقی فن کا کارنامہ بھی ہے اور دانشورانہ فکر کا اعجاز بھی۔ان کے تمام قطعات موضوعات وفنی لحاظ سے کامیاب اور دلکش ہیں۔

عرشؔ صہبائی کو بنیادی طور پر غزل کا شاعر قرار دیا گیا ہے۔اس کا جواز یہ ہے کہ انہوں نے زیادہ کلام غزل کی شکل میں کہا ہے۔ورنہ حق بات یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کی جس صنف میں بھی کلام کہا اسے عروج تک پہنچایا ہے۔اردو غزل کے بعد عرشؔ نے سب سے زیادہ دلچسپی دوہے کہ تخلیق میں لی ہے کیوں کہ غزل کے علاوہ ان کا مکمل شعری مجموعہ اسی صنف میں ملتا ہے۔ان کے دوہوں کا مجموعہ بہ عنوان ’’تجھ بن چین کہاں‘‘ 2009ء میں شائع ہوا جس میں مختلف موضوعات پر مشتمل دوہے موجود ہیں۔موصوف نے انسان اور انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف مضامین کونئی طرز تحریر و نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ بڑی دلکشی اور معنوی تہہ داری کے ساتھ اپنے دوہوں میں پیش کیا ہے۔انہوں نے زیادہ تر اپنے دوہوں میں بھی وہی مضامین پیش کئے ہیں جو انہوں اپنی دیگر اصناف غزل،نظم اور قطعہ میں برتتے ہیں۔عرشؔ ایک موضوع کو مختلف انداز میں مہارت رکھتے تھے۔میں اس بات کی بھی وضاحت کر دوں کہ ان کی دیگر اصناف شاعری کی طرح ان کے دوہوں میں بھی وہی شعریت وفنی لوازمات ملتے ہیں۔ان کے دوہوں میں غزلیت کا عنصر بھی موجود ہے۔

جب ’’تجھ بن چین کہاں‘‘ کی ہم ورق گردانی کرتے ہیں تو اس میں دوہوں کی کل تعداد 303 / پائی جاتی ہے۔یہ بات قابل تعریف ہے کہ ان میں کوئی بھی ایسا دوہا نہیں جو بھرتی کا ہو۔ورنہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض شعرا غزلوں یا دوہوں کی تعداد بڑھانے کے لیے طبیعت پر زور دے کر دوہے کہہ لیتے ہیں۔اس سے ان کے کلام کا معیار متاثر ہوتا ہے اور بات ’’شعر برائے شعر گفتن‘‘ پر ختم ہوتی ہے۔ایسے شاعروں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جنہیں اس الزام سے بری قرار دیا جاسکتا ہے۔ موصوف کے دوہوں کے مضامین اگرچہ نئے نہیں ہیں لیکن ان کے جیسا انداز بیان کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملے گا بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ عرشؔ صہبائی کی شاعری سے دوسروں کو تحریک حاصل ہوتی ہے۔ان جیسا شعر کہنے کا انداز تو پیدا نہیں ہوسکتا لیکن ان کے کلام سے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔الفاظ کی نشست و برخاست سمجھ میں آتی ہے جب اس معیار کا کلام کہنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ کلام یقیناً سطحی کلام سے مختلف ہوگا۔الفاظ کی مزاج آشنائی ہوگی۔اگر کوئی نو آموز

شاعر کسی مشاق شاعر سے وابستہ ہوگا تو قاری فوراً سمجھ لے گا کہ یہ فلاں شاعر کے دامن ادب سے وابستہ ہے۔ بات پھر وہیں اگر ختم ہوتی ہے کہ ایسے شاعر کی رہنمائی کرنے والے شاعر کی طبیعت میں آمد ہو، اگر وہ خود کسی کی تقلید کرتا ہوگا تو دوسروں کو کیا دے سکے گا۔

جب ہم عرش صہبائی کے دوہوں میں روایت پسندی کا جائزہ لیں گے تو یہ تمام باتیں ابھر کر آپ کے سامنے آجائیں گی کہ انھوں نے روایت کا بھی بخوبی خیال رکھا ہے لیکن کسی کی تقلید پر وہ ہرگز قائل نہیں ہوئے۔ اس سے اس بات کی وضاحت بھی ہو جائے گی کہ آمد اور آورد کی شاعری میں کیا فرق ہے۔ ایک بات کا اظہار کرنا بے حد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب طبیعت میں آمد ہو تو ریاضت اس صورت میں ضروری ہے، کوئی فن بھی ہو ریاضت کے بغیر بات نہیں بنتی۔ ریاضت کو مشق سے بھی وابستہ کیا جاسکتا ہے اور کسی شاعر کو مشاق شاعر بننے کے لیے ایک عرصہ درکار ہے۔ اس کے لیے بھی رہنمائی بے حد ضروری ہے۔ جہاں تک اردو شاعری کا سوال ہے آج اس کے بے شمار ٹھیکیدار مل جائیں گے جنھوں نے قدم قدم پر دکانیں کھولی ہوئی ہیں۔ ایسے لوگ ہی اردو زبان کے زوال کا باعث بن رہے ہیں۔ جموں وکشمیر میں ان کی بھرمار ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ دور ہی ان دکانداروں کا ہے۔ اگرچہ ایسی دکانیں ''مورکھ منڈلیوں'' کے نام سے جانی جاتی ہیں لیکن انھیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہرحال ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی جس سے یہ دکانیں بند ہوسکیں۔

اردو دوہا کے بارے میں کئی مضامین بھی مل جاتے ہیں اور کئی مجموعے بھی۔ جب اردو کے دوہے کے بارے میں تفصیل سے بات کرتے ہیں تو یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ جب اردو نے ہندی کی اس صنف کو اپنایا تو زبان کا استعمال قدرے مختلف تھا۔ اردو میں فارسی کی آمیزش ہونا قدرتی بات ہے۔ اس کا براہ راست ایک اثر یہ ہوا کہ دوہے کہنے کا انداز بے شک نہیں بدلا فنی طور پر اس کی شکل وصورت وہی رہی لیکن زبان بدلنے سے اس کا مزاج بدل گیا اور دوہا زیادہ پروقار نظر آنے لگا۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا۔ عرش صہبائی نے ایسے دوہے کہے ہیں جس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ دوہا اردو شاعری کی ہی صنف ہے۔ لیکن اردو کے بیشتر شعرا کے یہاں ایسا نہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے دوہے صرف اس لیے کہے ہیں کہ دوہا نگاروں میں ان کا نام شامل ہو۔ اردو شاعری کے بیشتر شعرا صرف اسی مقصد سے شعر کہتے ہیں۔

ایک مخصوص بحر و وزن والے دو مصرعوں میں ایک مکمل تجربہ، ایک مکمل خیال یا ایک مکمل موضوع سمیٹ لینے کی بے پنا قوت وصلاحیت نے نہ صرف دوہا کو قبولیت عام وشہرت دوام بخشی بلکہ ہندی کی اس قدیم روایتی

صنف نے کشت سخن میں تخم غزل کو بارآور اور ثمر بار بنانے میں بھی اہم کردار ادا کئے۔ وہ دوہا نگاری کی روایت ہی تھی جس نے غزل کے ہندوستان میں قدم رکھنے سے پہلے اس کی باریابی کے لئے فضا سازگار اور زمین ہموار کر رکھی تھی۔ یہاں تک کہ ایہام گوئی کی روایت کی تشکیل میں اس کا خون جگر اور اسی کے قلب ونظر کام آئے اور کشت سخن میں غزل نے وہ گل کھلائے کے دوہے کا رنگ ماند پڑ گیا اور غزل اپنے رنگ وآہنگ میں حیات وکائنات کے خارجی مسائل اور داخلی کیف وکم کو سمیٹتی چلی گئی۔ اس کے مختصر حدود میں لامحدود وسعتیں سمٹتی گئیں۔ اس بنیادی عشقیہ اور فرقیہ مزاج میں انقلاب آفریں تغیرات رونما ہوئے اور پھر دوہا نگاری کی روایت غزل کے زیر اثر آ گئی۔ اس میں مضامین وموضوعات اور مسائل حیات وکائنات نے اپنی تجلیاں بکھیرنا سروع کیں۔ یہ سلسلہ دراز ہوا اور پھر اردو کے غزل گو شعراء نے بھی اس سلسلے کو وسعت دی اور اس وسعت کو عصری رجحانات سے ہم آہنگ کرنے میں نمایاں کردار ادا کئے۔ عرشؔ صہبائی انہیں شعراء میں سے ایک اہم شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بہر حال عرشؔ صہبائی کے آبائی وطن جموں وکشمیر میں کوئی ایسا شاعر نہیں جو دوہوں کے حوالے سے جانا جاتا ہو۔ یہاں صرف شام لال کالرا (عابدؔ پیشاوری) ایک ایسے شاعر گزرے ہیں جن کے اردو دوہوں کا دیوان ''رحمٰن رنگ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ موصوف دلی سے یہاں ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ بنیادی طور پر وہ تقسیم وطن سے پہلے پیشاور سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا ریاستی شعراء میں عرشؔ کے علاوہ کوئی بھی ایسا شاعر نہیں جس کے ہاں دوہوں پر مشتمل مکمل مجموعہ منظر عام پر ہو۔ اس لئے بھی عرشؔ صہبائی کی انفرادیت ریاستی ادب پر حاوی ہے کہ انہوں ریاستی ادب کو دوہا جیسی عظیم صنف کا ادبی ذخیرہ عطا کیا۔ عرشؔ کے علاوہ دوسرے شعراء کے ہاں مکمل کتاب تو اس صنف میں نہیں ملتی لیکن کئی ایسے شعرا ہیں جن کے ہاں کچھ کچھ کلام اس صنف میں ملتا ہے۔

عرشؔ صہبائی نے اپنے دوہوں میں زیادہ تر وہی مضامین پیش کیے ہیں جو انھوں نے اپنی دیگر اصناف میں پیش کیے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انھوں نے دیگر اصناف میں شامل موضوعات کو مزید جدت اور ندرت سے اپنے دوہوں میں پیش کیا ہے۔ وہ ایک موضوع کو مختلف طریقوں سے برتنے میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے دوہوں کے موضوعات کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ان کے مضامین میں غیر معمولی تنوع اور دلکشی ہے۔ حسن، عشق، ہجر، وصال، تنہائی، محفلیں، موسم، گاؤں، شہر، گھر، کہاوتیں، نصیحتیں سب ان کے کینوس کا حصہ ہیں۔ ان کے دوہوں میں ایک خلیق ذہن، طبع رسا، باشعور ذہن کے غیر معمولی تجربوں کا اظہار ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ

ان کے دوہوں میں شاعر کا لب ولہجہ عام اور مفکر یا دانشور کا نہیں بلکہ ایک عام انسان کا ہے۔ ایک ایسا عام انسان جسے ورثے میں برصغیر کے اعلیٰ فنکاروں و ناقدوں کی عظمت ملی ہو۔ ان کے دوہوں کا خالق ایک سیدھا سادہ عام انسان ہے۔ اس ضمن میں ان کے چند دوہے ملاحظہ کیجئے:

پہلے وہ ناراض تھا اب ہے دل سے دور
چھوٹے چھوٹے زخم ہی بنتے ہیں ناسور(۱۰۸)
کبھی نہ ظاہر کر سکے ہم دل کے جذبات
ان سے نظریں بھی ملیں لیکن ہوئی نہ بات(۱۰۹)

یہ کیسا انداز ہے یہ کیسا دستور
جس کو چاہا ٹوٹ ہوا وہ اور بھی دور(۱۱۰)

ریزہ ریزہ کرگئے ان نینوں کے بان
پھر بھی کوئی زخم ہے اور نہ کوئی نشان (۱۱۱)

یہ اور ایسے کتنے ہی دوہے ہیں جو احساسات اور جذبات کی مختلف سطحوں کو بے ساختہ چھو لیتے ہیں۔ ان کی معنوی گیرائی و گہرائی، تہداری اور پرو کاری شعور وفکر کے تانے بانے کو اس طرح ہم آہنگ کرتی ہے کہ مختلف رنگوں کے ساتھ دھوپ چھاؤں کی ایک نئی اور انوکھی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور قاری اس انوکھی کیفیت میں دیر تک کھویا رہتا ہے۔ یہ کیفیت عرشؔ صہبائی کو اعتبار فن عطا کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے دوہوں کی جس قدر اب تک پزیرائی ہوئی ہے وہ آنے والے وقت میں اس سے بھی زیادہ حاصل ہوگی۔ ان کے یہ ہی نہیں کئی ایسے دوہے ہیں جو عشقیہ جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس موضوع کی روایت بڑے طویل عرصے پر محیط ہے۔ ہر دور میں ہر شاعر کے یہاں عشقیہ جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ ساحرؔ شیوی کا یہ قطعہ دیکھیں:

اک مدت کے بعد میں آئی ہے ایسی رات
پریتم مجھ سے کہہ گئے اپنے من کی بات(۱۱۲)

ہر عہد کے شعراء نے اپنے محبوب کے حسن، قد و قامت، آنکھوں، لبوں بلکہ محبوب کی ہر ہر ادا کو اپنے اپنے انداز میں شعری جامہ پہنایا ہے۔ جو عشقیہ جذبے ہمیں نوجون شاعروں کے یہاں بھی بہت کم ملتے ہیں وہ عرشؔ کی شاعری میں عام ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام سے متاثر ہونے والوں کی تعداد جموں کشمیر کی پہنچنے والے

دوسرے شعراء کے مقابلے بہت زیادہ ہے۔ان کی شاعری تمام اصناف میں محبوب کی اداؤں کا حوب بیان ملتا ہے۔عرشؔ کے دوہوں پر بہت کچھ لکھنے کا دل کرتا ہے مثلاً ان کے بعض دوہوں میں نفسیاتی کیفیت کو نہایت ہی سلیقے اور دردمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ان کے یہ دوہے اس کا جواز ہیں:

تری نگاہ شوق سے بکھرے رنگ ہزار
اس کی اک اک بات میں نغموں کی جھنکار(۱۱۳)
آنکھیں اس کی کیا کہیں مستی کے دو جام
ہم پلکوں کی اوٹ میں کرتے ہیں آرام(۱۱۴)

گلہ نہیں وہ اگر کرے آنے میں تاخیر
جو دل کو پہنا گیا وعدوں کی زنجیر(۱۱۵)

جذبہ عشق کے متعلق ایسے خیالات عرشؔ کی شاعری میں ہم آہنگ ہیں۔انسان کے دوسرے جذبات کو یہ سرفرازی یا یہ شرف حاصل نہیں ہے جو عشق کے جذبات کو حاصل ہے۔اب اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے کہ اس میں گفتگو کے بہت سے پہلو پیدا ہو جاتے ہیں۔تصوف سے لے کر معاملہ بندی بلکہ فحش نگاری تک، یہ سب عشق کے مختلف شیون ہیں مختلف انداز و ادا کہہ لیں ،لیکن ہے ایک ہی سلسلے کی کڑی ،کہیں اس کا رشتہ معاملہ بندی سے کہیں تصوف،کہیں نہ کہیں عشق خالص سے یا تصوراتی سے ایک دوسے سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اسی لئے اس موضوع کی روایت بہت وسیع ہے۔ ہر جدت پسند شاعر اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے اپنے جدا انداز و اسلوب کا مظاہرہ ضرور کرتا ہے لیکن کہیں نہ کہیں وہ روایت پسندی کا حامل رو رہوتا ہے۔عرشؔ صہبائی کہتے ہیں:

دور بہا لے جائے گا دلوں کو اپنے سنگ
بڑا قیامت خیز ہے گوری کا یہ رنگ(۱۱۶)

دوہے میں لفظ''گوری'' سے مخاطب محبوب ہے۔موصوف محبوب کے رنگ کو قیامت خیز بتاتے ہیں۔جمیلؔ عظیم آبادی کا یہ دوہے بھی اس سلسلے میں اہمیت رکھتا ہے:

مدبھری ہیں انکھیاں تیری سندر تیرے روپ
آنچل مکھ پر رکھنا گوری لگے نہ تیکھی دھوپ (۱۱۷)

سندر مکھڑا مدھ بھری آنکھیں ہرنی جیسی چال
جس رستے سے گزرے گوری آجائے بھونچال (۱۱۸)

ڈاکٹر فرازؔ حامدی کے یہاں بھی ایک دوہاں ملتا ہے جس میں میں محبوب کے لئے لفظ ''گوری'' کا استعمال کچھ یوں ہوا ہے:

چپکے چپکے پوچھ رہے تھے نینوں سے یہ نین
پیا ربھی کیا سیلاب تھا گوری بہا لے گیا چین (۱۱۹)

عابدؔ پشاوری محبوب کی آنکھوں کے متعلق کچھ یوں اظہار کرتے ہیں:

وہ آنکھیں جھیلیں نہیں اور نہ ہی گرداب
لیکن جو بھی جھانک لے ہو جائے غراب (۱۲۰)

جمیلؔ عظیم آبادی کا یہ دوہا بھی اسی موضوع پر اشارہ ہے:

جب سے تجھ سے آنکھ ملی ہے تن من ہے بے چین
من ساگر میں ہلچل کر گئے تیرے دونوں نین (۱۲۱)

ساحرؔ شیوی کہتے ہیں:

چاہت کے احساس کا بڑھنے دل کچھ مول
ساحرؔ منہ سے بات کر آنکھوں سے مت بول (۱۲۲)

عرشؔ صہبائی کے بہت سے دوہے عشق ومحبت اور فطرتی رنگ رکھتے ہیں۔ مثلاً:

دنیا میں ہے لازم غم کا دل سے میل
پودوں کو ہے گھیرتی جیسے کوئی بیل (۱۲۳)

گزرے جہاں جہاں سے وہ کھلتے گئے پھول
کاش میسر ہو کبھی ان راہوں کی دھول (۱۲۴)

دل کو چھوتا ہوے عرشؔ کے کچھ اور دوہے دیکھئے:

مٹ جاتے شکوے گلے دل ہوجاتا سیر
ان سے مل کر راہ میں رو لیتے کچھ دیر (۱۲۵)

آتے آتے راہ میں جب ہو اس کی دید
عرشؔ دل نا شاد کی ہو جاتی ہے عید(۱۲۶)

بے شک من بے چین ہے بے شک ہو یہ اداس
لیکن اس کو دیکھ کر مٹ جاتی ہے پیاس (۱۲۷)

یہ ایسے دوہے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری کے دل پر گہری زرب لگتی ہے اور انہیں یہ اپنے دل کے جذبات معلوم ہوتے ہیں۔ جب کسی سے ملنے کی آس ہو اور وصل جب تک ممکن نہ ہو بے چینی کا عالم رہتا ہے لیکن جب دید ہو جاتی ہے تو سارے دکھوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔اسی خیال کی پاسداری چند لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ سرشاؔر بلند شہری کے ایک دوہے میں ملتی ہے:

پنگھٹ کی شوبھا گئی موسم ہوئے اداس
پنچھی پتھر بن گئے تک تک تیری آس(۱۲۸)

عرشؔ صہبائی کے یہ دوہے عشق و محبت کی جلوہ سامانیوں سے لبریز ہیں۔ان میں تخلیل اور جذبے نے مل کر بڑی حسین تعبیریں تخلیق کی ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عرشؔ کی دورس نگاہیں حسن کی تلاش و جستجو میں سرگرداں تھیں۔ان میں حسن کی دوشیزگی بھی ہے اور حسن نظر کا شباب بھی۔ان میں زندگی بھی ہے اور زندگی کا احساس بھی۔رومان ان کا اپنا میدان ہے جس میں ان کے فنی جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔انہوں نے ہر صنف میں عشق و عاشقی کے معاملات اور قلبی واردات کو اپنی شاعری میں موضوع بنایا ہے۔ان کے دوہوں میں کثرت سے ایسے مضامین ملتے ہیں جو''مصرعہ تر'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ان کے رومان پرور جذبات و احساسات شگفتگی و نغمگی کے ساتھ جب شعر کے قالب میں ڈھلتے ہیں تو وہ شعر دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر کیف و سرور کا باعث بن جاتا ہے:

دل آمادہ ہو اگر ان سے کرنا پریت
امن ،محبت ،عاجزی ، جیون کا سنگیت(۱۲۹)

موصوف کی رومانی شاعری روایتی موضوعات کے ساتھ ان کے اپنے ایجاد کردہ انداز و اسلوب کا آئینہ ہے۔ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے نہ صرف غیر مردف بلکہ مردف اور بقید مطلع غزلوں کو بھی وجود عطا کیا ہے۔ان کے دوہوں میں بھی اکثر ڈاکٹر فرازؔ حامدی کے دوہوں کہ طرح قوافی کا استعمال عام ملتا

ہے۔ ڈاکٹر فراؔز حامدی کے یہاں عربی فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ ملتا ہے جبکہ عرشؔ کے یہاں ایسا بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ دونوں کے یہاں دوہا غزل میں قافیہ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ردیف بھی ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔ دونوں کے ہاں موضوعات میں بھی مماثلت ملتی ہے۔ مثلاً عرشؔ کے یہ دوہے ملاحظہ کیجئے:

کبھی کبھی وہ غم پڑیں دل سب سے کٹ جاے
جیسے کسی پہاڑ پر اک بادل پھٹ جائے (۱۳۰)

اس صورت میں کس طرح دن میں رات نہ ہو
بیٹھے رہیں وہ سامنے لیکن بات نہ ہو (۱۳۱)

کون آ یا یہ بزم میں کس کو اتنا ہوش
آنکھیں جیسے میکدہ نظریں جام فروش (۱۳۲)

اس پر کچھ ایک فراؔز حامدی کے دوہے پیش ہیں جن میں ردیف و قافیہ کا آہنگ موجود ہے:

آنکھیں حیراں کر گیا جلوؤں کا احساس
مجھ سے پہلے کون تھا آئینے کے پاس (۱۳۳)

ہونٹوں پر انکار ہے آنکھوں میں اقرار
آخر کب سے ہوگئے تم بھی دنیا دار (۱۳۴)

عرشؔ کے یہاں مجازی محبوب کے ساتھ ساتھ حقیقی محبوب پر بھی دوہے ملتے ہیں۔ اس کائنات میں بسنے والے تمام مذاہب کے لوگ ہر مسائل و نکات پر اپنا الگ نظریہ رکھتے ہیں لیکن خدا کی ذات کے متعلق سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ واحد ذات ہے جس کے جیسا نہ کائنات میں دوسرا کوئی ہے نہ کبھی ہو سکے گا۔ کائنات کی ہر شہ میں اس کا عکس موجود ہے۔ عرشؔ یہ دوہا اس کے جواز کے طور پر پیش ہے:

آخر کسی بھی چیز سے اس کو ہے کیا کام
جس نے اپنی زندگی کردی اس کے نام (۱۳۵)

کہیں پہ کانٹے پھول ہیں کہیں پہ چھاؤں دھوپ
کہنے کو وہ ایک ہے لیکن کتنے روپ (۱۳۶)

اسی خیال کو اردو دوہے کے ایک اچھے شاعر غیاث الرحیم شکیبؔ نے اپنے دوہے میں یوں برتا ہے۔

جیسا چاہے روپ اس کے سارے روپ
ہم کو سب منظور ہے سایہ ہو کہ دھوپ(۱۳۷)

عرشؔ صہبائی کے سارے دوہے سادہ اور سلیس زبان میں تخلیق کئے گئے ہیں۔ان سب میں طرز بیان نیا نیا سا ہے اور اظہار و اسلوب کی وہ تازہ کاری بھی موجود ہے جو عصری غزل کا خاصہ ہے۔ان خوبیوں نے دوہوں میں معنوی تب و تابش پیدا کردی ہے۔انھیں فکری توانائی اور لطافت انگیز کیفیت سے بھی آراستہ کر دیا ہے لہذا بجا طور پر ان میں تغزل کی خوبی اور ندرت خیزی پیدا ہوگئی ہے۔ان دوہوں میں یقیناً شگفتگی، گداختگی، محویت، خستگی اور رنجوری کی روایتی باتیں ہیں لیکن انداز اظہار کی جدت نے ان میں تغزل کا رچاؤ پیدا کر دیا ہے:

جہاں پہ ہر انسان کی ہرتی ہو تضحیک
مجھ کو اس ماحول سے کیا ہوگی تحریک(۱۳۸)

چہرے پر افسردگی دل میں غم کی پھانس
ہم بھی کس ماحول میں لیتے رہے ہیں سانس(۱۳۹)

عرشؔ جس ماحول میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے وہ نہایت خوشگوار تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے آس پاس کے سماج و معاشرے میں تبدیلیوں کے سب گراوٹ آتی گئی جس ظلم و افردگی کا سا ماحول بن گیا۔ اسی سب سے وہ اپنے سماج اور معاشرے میں پھیلی برائیوں پر زور وشور سے طنز کرتے ہیں۔مندرجہ بالا دوہا اس کی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔عرشؔ کے علاوہ کئی ایسے شعراء ہیں جنھوں نے اپنے سماج اور ماحول کی اچھائیوں اور برائیوں کو اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔مثلاً ساحرؔ شیوی کا یہ دوہا ملاحظہ کیجئے:

ساحرؔ صبر وضبط کو کرکے اپنی ڈھال
آلودہ ماحول میں زندہ ہوں تا حال(۱۴۰)

پرویز اخترؔ کا یہ دوہا بھی اسی مضمون کی عکاسی کرتا ہے:

آنکھیں موندے عمر بھر بنتے رہے بس خواب
ہم نے سیکھے ہی نہیں جینے کے آداب (۱۴۱)

شرشار بلند شہری کا یہ دوہا بھی ملاحظہ ہو:

جگ ماٹی کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا فقیر
دوہوں آنکھیں موند کے خود کو کہے امیر(۱۴۲)

عرش صہبائی دوہے کے تجربہ کار شاعر تھے۔انہیں اپنی تخلیل پر گرفت اور جذبات پر کنٹرول تھا۔زندگی کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کا انہیں شعور ہے اور قدروں کی پامالی کا شکوہ بھی ہے۔انہوں نے زندگی اور زندگی کے متعلق اہم گوشوں مثلاً پیار، نفرت، سچ اور جھوٹ کے موضوعات پر کھری اور سچی باتیں دلنشیں انداز میں کہی ہیں۔ان کے مزاج میں سکون اور ٹھہراؤ ہے۔ان کے لہجے میں تمکنت اور سادگی ہے۔یہ اوصاف دوہا کے شاعر کے لئے بہت ضروری ہیں۔ان کے یہ دوہے اس کا جواز ہے:

ہم راحت کے لمحوں کو کرتے کہاں تلاش
اس دل پر چھایا رہا اکثر غم معاش(۱۴۳)
اک مفلس کی کیا کہیں کیا ہے بود و باش
کچھ ہے فکر زندگی، کچھ ہے غم معاش(۱۴۴)

ہر دور میں شاعروں کے ساتھ فکر معاش ایک اہم مسلہ رہا ہے کیوں کہ وہ فنکار، ادیب و شاعر ہو سکتے ہیں لیکن شاعری انہیں شہرت دلا سکتی ہے ان کا گھر نہیں چلا سکتی۔اس کے لئے کچھ سرمایہ ضروری ہے۔عرش کو بھی اپنی زندگی میں یہ فکر لاحق رہی ہے۔یہ دوہے ان کی فکر معاش کی دلالت پیش کرتے ہیں۔اسی بات کو عابدؔ پشاوری کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

جگہ جگہ ڈھونڈتے پھریں مردہ ادب کی لاش
لاشیں جن کی زندگی لاشیں وجہ معاش(۱۴۵)

عرش کی شاعری میں ان کی ذاتی زندگی کا عکس ملتا ہے۔انہوں نے نہ صرف اپنے دوہوں میں بلکہ اپنی دیگر شعری اصناف کی طرف اپنی ذاتی زندگی کے دردوغم اور مصائب وآلام کا اظہار بڑی متانت اور سنجیدگی اور برجستگی کے ساتھ کیا ہے۔ان کی زندگی افلاس، تنگ دستی، محرومی اور تنہائی میں بسر ہوئی ہے۔ان کی زندگی کا کارواں درج ذیل دوہوں سے صاف عیاں ہوتا ہے۔عرش صہبائی درست بات کہنے سے کبھی نہیں کتراتے، چاہے ان پر کوئی مصیبت کیوں نہ آئے۔دوسرے کئی دوہوں کی طرح اس دوہے میں ان کا طنزیہ اسلوب صاف دکھائی دیتا ہے:

جو بھی سیاست داں ہے چہرے پر ہے نور
ماہر ہے تقریر میں اور عمل میں دور(۱۴۶)

عرشؔ سیاست دان ہیں ہر اک بات میں تیز
بدی کے شیدائی مگر نیکی سے پرہیز(۱۴۷)

ٹیڑھے جو بھی کام ہوں ان سے رہیے دور
کہیں نہ یہ کہنا پڑے کھٹے ہیں انگور(۱۴۸)

یہاں سیاست دان سے ہر کوئی بے زار
کیا اس کی تقریر ہے کیا اس کا کردار(۱۴۹)

عرشؔ صہبائی نے اپنے سماج اور معاشرے کے مختلف مسائل افلاس، تنگ دستی، عورتوں کا استحصال، نفسیاتی الجھنوں، دقیانوسی رسم ورواج، محرومی اورنئی تہذیب سے سماج ومعاشرے میں رونما ہونے والی بداخلاقی، عریانی، نفسانفسی، ہوس وحرص اور بے راہ روی وغیرہ مضامین پر بڑے خوب دوہے کہے ہیں۔ دراصل انھوں نے اپنے سماج ومعاشرے میں پنپ رہےان مذکورہ مسائل کوابھارنے کی کوشش کی ہے جنہیں ایک عرصے سے دبایا جا رہا تھا۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں ان حقائق کی طرف بھی اشارے کیے ہیں جن کی وجہ سے سماج و معاشرہ میں افلاس، تنگ دستی، بداخلاقی اور بے راہ روی کے پھیلنے کا خدشہ رہتا ہے۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں سماج ومعاشرہ کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر بڑی بڑی باتیں کہہ دی ہیں جو قاری کے دل ودماغ پر گہرے تاثرات مرتب کرتی ہیں۔ دوہے میں اخلاقی مضامین کی سب سے زیادہ اہمیت رہی ہے۔ اس سے زیادہ اہمیت اس زبان کی رہی ہے جوعوام الناس کی زبان رہی ہےاوران کی روایتی تہذیبی اوراخلاقی واقداری فضااور ماحول سے ہم آہنگ رہی ہے۔ خالص ہندی روایت سے متعلق ہونے کی وجہ سے دوہے کے عشقیہ میلان اور ہجر کی کیفیات میں نسوانی جذبات کا اظہار ہوتا رہا ہے، سواس روایت کوعرشؔ نے بھی استحکام اوراستقلال کی صورت عطا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے:

ہوا ہے نظر جہیز کی گھر کا سب سامان
جب بھی کسی غریب نے کیا ہے کنیا دان(۱۵۰)

کہنے کو عورت مگر قدرت کا شہکار
اک کھلونے کی طرح بکے سربازار(۱۵۱)

نردھن کنیا رو پڑی یہ کیسا وردان
جن سے ہیں بیاہی گئی وہ ہے پتا سمان(۱۵۲)

عجب گھٹن ماحول میں ذہن و نظر علیل
سوچ رہا ہوں جینے کی نکلے کوئی سبیل(۱۵۳)

یہ اردو دوہے کی ادبی روایت کا وہ پچھڑا ہوا موضوع ہے۔اس پر غزل،نظم،قطعہ اور رباعی وغیرہ میں ایسے موضوعات پر بہت سرمایہ مل جاتا ہے لیکن دوہے میں چونکے دو ہی مصرعوں میں بات کہنی ہوتی ہے جو نہایت مشکل فن ہے۔ احترؔام اسلام کا یہ دوہا اسی موضوع کی عکاسی کررہا ہے:

دن دن بڑھتی فائلیں کبڑی ہوتی میز
دلن میرے بھاگ کی لائی خوب جہیز(۱۵۴)

اعجاز تابشؔ کہتے ہیں:

اجڑا اجڑا سال لگے بچپن کا سنسار
تابشؔ میکے آئے ہے دلہن پہلی بار(۱۵۵)

اسی سلسلے میں راجؔ منی کا یہ دوہا بھی اہم ہے:

اگلی اگلی پھر رہی کیسے سنائے حال
بابا کا گھر چھوڑ کر جانا ہے سسرال(۱۵۶)

ان مذکورہ موضوعات کے علاوہ عرشؔ صہبائی نے تصوف، دنیا کی بے ثباتی، ذاتی تجربات اور مشاہدات، فرقہ پرستی، مغربی تہذیب کی تلقین اور مشرقی تہذیب کی پامالی، جمہوریت کی تنگ نظری اور اخلاقی مضامین پر بھی بڑی خوبی و ندرت سے کامیاب دوہے کہے ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات تنوع ملتا ہے۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اسے اپنے فن اور الفاظ کی جادوگری سے خوبصورت اور جاوداں بنا دیا۔ ان کے دوہے کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے ادب کے ساتھ زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے درج ذیل دوہے دیکھئے جن میں انھوں نے زندگی اور اس سے متعلق پہلوؤں کو نئے رنگ اور نئے انداز و اسلوب سے بیان کیا ہے:

ہونٹوں پر افسردگی ہر چہرہ بے نور
جس کو کہیے زندگی وہ ہے کوسوں دور(۱۵۷)

جہاں میں دانا کون ہے کون یہاں نادان
سب پہچانے جائیں گے تو خود کو پہچان(۱۵۸)

بویا جو بھی بیج ہو پھوٹے گا وہ ضرور
گھڑا بھرا جب پاپ کا ٹوٹے گا وہ ضرور(۱۵۹)

اپنی اس تہذیب کی نبض رہی ہے ڈوب
اس لیے ماحول سے اب دل گیا ہے اوب(۱۶۰)

دل کو کچھ راحت ملے کب ہے یہ امکان
یاد رہے گا زندگی یہ تیرا احسان(۱۶۱)

عرشؔ صہبائی نے اپنے دوہوں میں سادہ، سلیس، رواں اور عام فہم زبان استعمال کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان کے دوہوں میں ہندی زبان کے الفاظ کا استعمال زیادہ ملتا ہے۔دوہا ایک ہندی صنف ہے اس لیے ہندی زبان کے الفاظ کا استعمال ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہندی زبان کے بھی ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جسے اردو زبان کا قاری آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔انھوں نے اس صنف میں عربی، فارسی کے شعری الفاظ بھی استعمال کر کے اس صنف کو اردو شعری اصناف کے اور قریب کر دیا ہے۔انھوں نے صنف دوہا کے فن، ہیئت اور انداز بیان کو مدنظر رکھتے ہوئے معنی تہہ داری، مضمون کی دلکشی، ندرت اور الفاظ کی نشست کا خیال رکھا ہے۔ بقول کوثر چاند پوری: ’’عرشؔ صہبائی کے کلام میں خلوص تاثر کی فراوانی ہے۔اکثر اشعار خلش پیکاں کی طرح احساس میں چبھے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔‘‘(۴۸)

موصوف بے حد حساس دل واقع ہوئے ہیں۔اس لیے ان کے دوہوں میں غضب کی گہرائی ہے۔وہ دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھتے ہیں۔ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا کلام دوسروں سے جدا ہے۔انھوں نے طویل ریاضت سے اسے سنوارا ہے۔چونکہ وہ خوددار واقع ہوئے ہیں اس لیے اعزازات کی بھیک مانگنے کے لیے کہیں نہیں جاتے۔اس کے باوجود کئی غیر سرکاری اداروں کی طرف سے انھیں مختلف باوقار خطاب سے نوازا گیا ہے۔اس کے باوجود بھی وہ ہمیشہ کام کو ترجیح دیتے تھے۔وہ کبھی اپنے نام کے ساتھ کسی خطاب کو نہیں جوڑتے جبکہ یہ دور ہی نمائشی دور ہے۔ان کے دوہے ان کی زندہ دلی کا جواز ہے:

مان لیا ہم کو ملا اجڑا ہوا نصیب
ہم فنکار مگر پھر بھی دل کے نہیں غریب (۱۶۲)

عرشؔ صہبائی کے بیشتر دوہے مختلف مضامین سمیٹے ہوئے ہیں جو فلسفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔لیکن انداز بیان نے سونے پر سہاگہ کا کام کر دیا ہے۔موجودہ عہد تنقید نگاری کا عہد ہے کیوں آج کا انسان اپنی سوچ کے دائیرے میں قید ہے اور ہر چیز کو اپنی عقل کے پیمانے پر پرکھنے کا عادی ہے۔جو چیز اس کی عقل کے مطابق ہے اس کی تعریف بجا لاتا ہے اور جو عقل سے باہر ہے اس پر اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔اس سلسلے میں وہ نہ صرف انسانوں کی ایجادات پر تردد کے شکار نظر آتا ہے بلکہ کائنات کے بنانے والے سے وہ سے بھی کئی طرح کی شکایتیں رکھتے ہیں۔ہر چیز کے اچھے برے پہلوؤں کو اجاگر کرنا بھی آسان کام نہیں اس کے لئے بھی تعمیری سوچ کی ضرورت ہوتی ہے۔عرشؔ آج کے دور کے تنقید نگاروں پر طنز کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں:

شعر و ادب میں ہر جگہ جاتا ہے جو ہار
بنتا ہے وہ بعد میں اک تنقید نگار (۱۶۳)

آج کے دور کے نام نہاد نقادوں کی کیا خوبصورت ترجمانی کی ہے۔یہ دوہا توجہ طلب ہے:

چیدہ چیدہ لفظ یہ کر لیتے ہیں یاد
فن سے گو واقف نہیں لیکن ہیں نقاد (۱۶۴)

اس بات کو عابدؔ پشاوری کچھ یوں کہتے ہیں:

عابدؔ دل کی بات کہہ چھوڑ ان کا ارشاد
جو بے تہ بے نقد ہے وہ ہی بڑا نقاد (۱۶۵)

عرشؔ صہبائی کی زندگی مختلف تجربات اور مشاہدات سے بھری پڑی ہے۔یہ تجربات اور مشاہدات ان کی زندگی کی بنیاد ہیں۔اسی بنیاد پر ڈاکٹر جاویدؔ وشِشٹ نے ان کے ایک شعری مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں ''مغنی حیات'' کے خطاب سے نوازا ہے۔عرشؔ صہبائی خود بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ان میں جو ادبی صلاحیتیں ہیں وہ قدرت کی دین ہے۔اس خیال کی تائید میں عرشؔ صہبائی کی شاعری زندگی کے عین قریب ہے۔یہ دوہا دیکھئے:

بے شک تیری ذات سے کوئی نہیں امید
اس پر بھی اے زندگی ہم ہیں تیرے مرید (۱۶۶)

غم کیا میری زندگی مٹتی ہے مٹ جائے
لیکن میرے خلوص پر کوئی حرف نہ آئے (۱۶۷)

زندگی اپنے ظاہر و باطن میں نت نئے تجربوں سے گزرنے کا نام ہے اور شعر و ادب، حساس لمحوں اور تجربوں کو تخلیقی روپ دینے کا فن ہے۔ عرشؔ صہبائی کی یہی خوبی ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں اپنی زندگی کے تازہ دم تجربوں، نت نئے جذبوں اور احساسات کے جہان معنی کی بارہا صورت گیری کی ہے۔ ان کے دوہوں سے ظاہر ہے کہ عرشؔ زندگی سے کتنی محبت کرتے تھے۔ زندگی ان کی ''محبوب'' تھی اور زندگی کا وہ کون سا مسئلہ ہے جس پر نظر نہیں ڈالی گئی۔ زندگی اور موت دونوں ایک دوسری کی حقیقت کی شاہد ہے۔ عرشؔ کی شاعری میں یہاں زندگی کے مختلف معاملات و مسائل کا بیان ملتا ہے وہیں موت اور اس کی مختلف شکلوں کا بیان ملتا ہے۔ وہ کون سا مضمون ہے جسے عرشؔ صہبائی نے اپنی شاعری میں نہیں باندھا۔ یہ دوہے دیکھئے:

آخر کو مٹ جائیں گے کیا ڈالی کیا پات
کسی بھی شئے کو دہر میں حاصل نہیں ثبات (۱۶۸)

ایک دوجے میں جذب ہیں دن میں جیسے رات
موت بھی ہے اک زندگی سمجھے کون یہ بات (۱۶۹)

اک جیسے رہتے نہیں دنیا کے حالات
قدرت کا یہ اصول ہے دن کے بعد ہے رات (۱۷۰)

کسی انسان کی جسمانی زندگی پر جو سب سے بڑی مصیبت جو وارد ہوسکتی ہے وہ موت ہے اور اگر کوئی شخص اسے خاطر میں نہ لاتا ہو تو پھر اس کی زندگی کہ گہرائیوں اور بلندیوں کی انتہا نہیں۔ عرشؔ مختلف موقعوں پر یہ نکتہ سمجھاتے ہیں کہ موت اور حیات میں کوئی فرق نہیں دونوں برحق ہیں بلکہ ایک دوسرے کے وجود کا سبب ہیں۔ ان کے مطابق جیسے زندگی کے حالات کی تبدیلی برحق ہے ٹھیک اسی طرح زندگی سے موت کی تبدیلی بھی متعین ہے جس سے کسی زندہ کو فرار حاصل نہیں اور نہ کبھی ہوسکتا ہے۔ عابدؔ پشاوری کا یہ دوہا اسی موضوع کی عکاسی کرتا ہے:

فانی ہے یوں تو یہاں عابد ہر انسان
موت اک عالم کی مگر عالم کا نقصان (۱۷۱)

موصوف اپنے دوہوں سے موت کے عالمگیری اور اٹل ہونے کی طرف ہمارے توجہ مبذول کراتے

ہیں اور موت کو زندگی کا تصور کرتے ہیں۔انسان کی زندگی میں موت سے بھی زیادہ ظالم اگر کوئی چیز ہے تو وہ غریبی ہے جو انسانوں پر طرح طرح کے ستم ڈھاتی ہے۔عرشؔ نے بھی اس موضوع کو اپنے دوہوں میں بڑی ہنر مندی سے برتا ہے۔چند دوہے ملاحظہ کیجئے:

پھیلیں ہر اک گام پر جب غربت کے سائے
روٹی کی خاطر یہاں عصمت بھی بک جائے(۱۷۲)

یہ امید کہ جاگ اٹھے سویا ہوا نصیب
اس کا رستہ دیکھتا آج بھی کوئی غریب(۱۷۳)

ذہن میں ای بکھراؤ سا من میں جھوٹی آس
اس کے سوا کچھ بھی نہیں اک مفلس کے پاس(۱۷۴)

بات بڑی دلچسپ ہے بے شک ہے یہ عجیب
غربت ہے قائم وہی مٹے ہیں صرف غریب(۱۷۵)

ایسے اور بھی کئی دوہے ہیں جو اسی خیال کی عکاسی کرتے ہیں۔ہمارے ہندوستان کی یہ روایت ہے کہ شعراء غربت و تنگ دستی میں زندگی گزارتے آئے ہیں۔ہندوستان کے شہر ممبئی سے تعلق رکھنے والے شاعر ہستی مل ہستیؔ بھی اردو دوہا نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ان کے یہاں بھی اس نوعیت کے دوہے ملتے ہیں۔ان کا یہ دوہا عرشؔ کے دوہے کے برعکس ہے:

میرے ہندوستان کا ہے فلسفہ عجیب
یوں یوں آئی ''یوجنا'' تیوں تیوں بڑھے غریب(۱۷۶)

موجودہ دور میں انسانی معاشرے سے ساری اخلاقی قدریں پامال ہوگئیں ہیں۔ہر طرف قتل وخون کا بازار گرم ہے۔جان مال، علم ادب ناقدری کا شکار ہیں۔غریب اور محنت کشوں کا استحصال جاری ہے۔ہر بشر ناجائز طریقوں سے دولت کمانے، امیر کبیر بننے، برتری حاصل کرنے میں سرگرم عمل ہے۔متوسط طبقہ ہراساں و پریشاں ہے، ہر طرف لوٹ مار کا بول بالا ہے۔سیاست بازی نے تمام تر اقدار کو ملیامیٹ کردیا ہے۔اب نوبت یہاں تک آن پڑی ہے کہ ملک و وطن کی ناموس بھی خطرے میں نظر آنے لگی ہے۔عالمی سطح پر ظلم و ستم کا ایسا دور دورہ ہے کہ جیسے انسانیت ہر جانب چیخ رہی ہے۔ایسے سینکڑوں موضوعات پر شعراء نے دوہے کہے ہیں جو مابعد

جدید رویئے اور نئی حقیقت پسندی کے غماز ہیں۔ یہاں عرشؔ کے کچھ دوہے اس کے جواز کے طور پر پیش ہیں:

قسمت سے حاصل جنہیں اقتدار کے جام
کس درجہ نااہل ہیں کس کس کا لوں نام(۱۷۷)

آپ کہاں مصروف تھے مطلق کیا نہ یاد
اک مدت سے شہر میں ہوا نہ کوئی فساد(۱۷۸)

ذہن سے یہ مفلوج ہیں عقل سے کوسوں دور
پھر بھی سیاسی رہنما کس درجہ مشہور(۱۷۹)

دل میں کتنی ظلمتیں چہرے پر ہے نور
ایسے میں راس آئے گا کیا دور جمہور(۱۸۰)

عرشؔ کے دوہوں میں کوئی مضمون بھی ہو اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے یہ دوہے سیاسی رنگ لیے ہوئے ہیں ایک ابدی حقیقت پر مبنی ہیں۔ سیاست دانوں کے بارے میں یہ بڑا عجیب دوہا ہے:

یہ ہے میرا تجربہ یہ میرا انومان
مجرم ہوگا لازماً جو ہے سیاستدان(۱۸۱)

یہاں ہندی لفظ 'انومان' استعمال بھی غور طلب ہے۔

یہی نہیں آج کل سرکاری دفاتر میں جو ماحول ہے میں اس کی عکاسی اس دوہے میں دیکھئے:

افسر ہو یا اردلی سب کو ماریں ڈنگ
دونوں رشوت خور ہیں کیا راجا کیا رنک(۱۸۲)

اس کے ساتھ ہی سماج پر بھی خوب روشنی ڈالی ہے:

بگڑے گی کل اور بھی جو صورت ہے آج
ویسے اس کے لوگ نہیں جیسا میرا سماج(۱۸۳)

عرشؔ صہبائی کے دوہوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان کی نظر زندگی کے ہر شعبے پر ہے۔ وہ اپنے ماحول کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ چاہے زندگی کا ماحول ہو، چاہے ملک کا سیاسی ماحول:

دل میں کتنا جوش تھا کتنے تھے ارمان
اقتدار کن کو ملا کون ہوئے قربان(۱۸۴)

اندر سے ہیں بھیڑیئے باہر سے ہیں مور
اعلیٰ عہدوں پر یہاں فائز رشوت خور(۱۸۵)

عرشؔ نے اپنے دوہوں میں جو سیاسی تصویر کو پیش کیا ہے وہی ان کے معاصرین میں دوسرے کئی دوہا نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔ ندؔا فاضلی کا یہ دوہا دیکھیں:

سات سمند پار سے کوئی کرے بیوپار
پہلے بھیجے سرحدیں پھر بھیجے ہتھیار(۱۸۶)

ظفرؔ گورکھپوری کہتے ہیں:

جیون اندھیاری گلی ہر جانب سے وار
پیچھے خونی بھیڑئے آگے چوکیدار(۱۸۷)

ظفر انصاری ظفرؔ کہتے ہیں:

گھپ اندھیری رات ہے جاگے رہیو یار
بنے ہوئے ہیں چور ہی گھر کے چوکیدار(۱۸۸)

عرشؔ صہبائی کے دوہوں کے مجموعے میں کوئی دوہا ایسا نہیں جسے نظر انداز کیا جا سکے۔ وہ ایسی خوبصورت تشبیہیں استعمال کرتے ہیں کہ قاری انھیں پڑھ کر جھوم اٹھتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دوہا دیکھئے:

وہ اک گھنا درخت ہے ٹھنڈی اس کی چھاؤں
اس کو دیکھوں جس گھڑی یاد آ جائے گاؤں(۱۸۹)

یہ بہت مشکل ہے کہ ان کے تمام دوہوں کا حوالہ دیا جائے۔ لیکن ہم یہاں ان کے منتخب دوہے پیش کر رہے ہیں جن سے ان کی دوہا نگاری کی خصوصیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

دنیا میں ایمان کا رہے نہ کوئی نشان
ہر گھر میں چاہیے ایک سیاست دان(۱۹۰)

مکاری، دھوکہ دہی اس کا کاروبار
دنیا گرگٹ کی طرح بدلے رنگ ہزار(۱۹۱)

دوہے پر اس طویل جائزے کے باوجود یہ انکاری نہیں کہ دوہا ہندی کی ایک مقبول صنف سخن ہے۔ عرشؔ نے اپنے یہاں دوہے کی تہذیبوں کے امتزاجات کے جس رخ کو پیش کرتے ہیں ،اس نے ہندی روایات سے استعفادہ کرتے ہوئے بھی اسے اردو ہی کی ایک مقبول صنف بنا دیا اور یوں ہمارے شعری سرمایہ اظہار میں اضافہ کیا ہے۔عرشؔ جس طرح کئی سطحوں پر زندگی کرتے تھے، ویسے ہی ان کی تخلیقات کا اظہار بھی کئی سطحوں پر ہوتا ہے۔تاہم انہوں نے جموں کشمیر کے شعری ادب میں دوہا نگاری کا ایسا راگ چھیڑا ہے کہ یہاں دوہا انہیں سے منسوب ہوگیا ہے۔عرشؔ نے تہذیب و معاشرت ، سیاست و معیشت ، اخلاق و محبت ، مرد وزن کے استحصال اور دوسرے کئی اہم موضوعات و مضامین کو اپنے دوہوں میں بڑی خوبصورتی ،خوش اسلوبی اور فنی چابکدستی سے برتا ہے اور دوہا نگاری کی روایت میں معنوی تہداری اور فنکارانہ ہنرمندی سے چار چاند لگانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔عوامی رجحان و میلان جو دوہے کا بنیادی وصف اور طرۂ امتیاز رہا ہے، وہ عرشؔ کے دوہوں میں بھی موجود ہے.

حواشی:

١۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ١٩٧٦ء، ص، ٣

٢۔ ایضاً ص، ٦

٣۔ ایضاً ص، ٨

٤۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ١٩٦١ء، ص، ٦

٥۔ پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین احمد، کتاب واقعات کشمیر، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سنٹر، ٢٠٠١ء، ص، ٣١

٦۔ ایضاً ص، ٣١

٧۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ١٩٦٤ء، ص، ١٠

٨۔ نشاطؔ کشتواڑی، تصویر خیال، ٹیا محل دہلی: ھمارادور پبلیکیشنز، ١٩٨٨ء، ص، ٢١٥

٩۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ١٩٦٤ء، ص، ١٠

١٠۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ١٩٦٤ء، ص ص، ١٠، ١١

١١۔ عرشؔ ملسیانی، شرار سنگ (اشاعت اول)، دہلی: یونین ٹریڈنگ پریس، ١٩٦٧ء، ص ص، ٣١، ٣٢

١٢۔ عرشؔ ملسیانی، کلیات عرشؔ ملسیانی، نئی دہلی: لبرٹی آرٹ پریس، ١٩٨٣ء، ص، ٢٥٤

۱۳۔ عابدؔ مناوری، شمیم گل، جموں: مکتبہ اردو ادب ۱۹۶۷ء، ص ۱۲۲

۱۴۔ حامدی کاشمیری، جموں وکشمیر میں اردو ادب، سرینگر: گلشن پبلشرز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۰

۱۵۔ عبدالقادر سروریؔ، کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر کے اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ۱۹۸۴ء، ص ۷۶

۱۶۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندوستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵ء، ص ۹۶

۱۷۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص ۴۲

۱۸۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویژن، ۲۰۱۵ء، ص ۱۸۰

۱۹۔ شیرازہ، عرشؔ صہبائی نمبر، جلد ۵۶، شمارہ ۳۔۴، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۰

۲۰۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص ص ۶۴، ۶۵

۲۱۔ نشاطؔ کشتواڑی، تصویر خیال، مٹیا محل دہلی: ہمارا دور پبلیکیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۳۲۰

۲۲۔ نشترؔ امروہی، پوسٹ مورٹم، دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۷۳

۲۳۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص ص ۵۹، ۶۰

۲۴۔ ایضاً، ص: ۵۴۔۵۵

۲۵۔ شیرازہ، معاصر اردو نظم نمبر، جلد ۵۳، شمارہ ۸۔۱۰، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، ص: ۱۰۹

۲۶۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص ۶۳

۲۷۔ ایضاً ص ۶۳

۲۸۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، کلیات جوش ملیح آبادی، نئی دہلی: فرید بک ڈپوٹ (پرائیویٹ) لمٹیڈ، ۲۰۰۷ء، ص ۵۰۸

۲۹۔ عرشؔ ملسیانی، کلیات عرشؔ ملسیانی، نئی دہلی: لبرٹی آرٹ پریس، ۱۹۸۳ء، ص ۳۳۴

۳۰۔ فراقؔ گورکھپوری، روح کائنات، الہ آباد: ودیا ساگر پریس، ۱۹۹۲ء، ص ۸۷

۳۱۔ عرشؔ ملسیانی، کلیات عرشؔ ملسیانی، نئی دہلی: لبرٹی آرٹ پریس، ۱۹۸۳ء، ص ۳۳۴

۳۲۔ فراقؔ گورکھپوری، روح کائنات، الہ آباد: ودیا ساگر پریس، ۱۹۹۲ء، ص ۸۷

۳۳۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، کلیات جوش ملیح آبادی، نئی دہلی: فرید بک ڈپوٹ (پرائیویٹ) لمٹیڈ، ۲۰۰۷ء، ص ۵۰۸

۳۴۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص ۶۳

۳۵۔ ایضاً ص ۶۲

۳۶۔ ایضاً ص ۶۲

۳۷۔ ایضاً ص،۶۲
۳۸۔ غلام جیلانی،عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی،جموں:آزاد بک ویژن،۲۰۱۵ء،ص،۱۹۲
۳۹۔ عرشؔ صہبائی،یہ جھونپڑے یہ لوگ،جموں:مکتبہ اردو ادب،۱۹۷۶ء،ص،۶۲
۴۰۔ علامہ اقبالؔ،بال جبریل،طبع پنجم،نئی دہلی:کمال پبلیشنگ ہاوس،۱۹۵۴ء،ص،۱۵۳
۴۱۔ جگرؔ مرادآبادی،کلیات جگر،دہلی:ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس،۲۰۱۱ء،ص،۱۸۶
۴۲۔ اسرارالحق مجازؔ،کلیات مجاز،دہلی:کتابی دنیا،۲۰۰۶ء،ص،۱۲۹
۴۳۔ عرشؔ صہبائی،یہ جھونپڑے یہ لوگ،جموں:مکتبہ اردو ادب،۱۹۷۶ء،ص،۶۲
۴۴۔ ایضاً۔ص،۶۶
۴۵۔ فاروق ارگلی،انتخاب کلام نظیر اکبرآبادی،دہلی:فرید انٹرپرائز،۲۰۰۳ء،ص،۲۲۶
۴۶۔ سید محمد جعفری،تیر نیم کش،لاہور:چنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء،ص،۱۳۷
۴۷۔ کرن کوشل ٹھاکر،اردو غزل کی عہد ساز شخصیت،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۳ء،ص،۵۱
۴۸۔ عرشؔ صہبائی،شکست جام،جموں:مکتبہ اردو ادب،۱۹۵۸ء،ص،۱۲۸
۴۹۔ عرشؔ صہبائی،یہ جھونپڑے یہ لوگ،جموں:مکتبہ اردو ادب،۱۹۷۶ء،ص،۲۴
۵۰۔ ایضاً ص،۲۵
۵۱۔ ایضاً ص،۶۷،۶۸
۵۲۔ ایضاً ص،۶۷
۵۳۔ ایضاً ص،۱۱۷
۵۴۔ ایضاً ص،۵۷
۵۵۔ ایضاً ص،۱۰۲
۵۶۔ ایضاً ص،۱۰۱
۵۷۔ غلام رسول نشاطؔ کشتواڑی،تصویر خیال،دہلی:ہمارا دور پبلی کیشنز،۱۹۸۸ء،ص،۱۷۱
۵۸۔ عرشؔ صہبائی،یہ جھونپڑے یہ لوگ،جموں:مکتبہ اردو ادب،۱۹۷۶ء،ص،۱۰۶
۵۹۔ ایضاً ص،۱۰۵
۶۰۔ ایضاً ص،۹۰
۶۱۔ ایضاً ص،۸۸

۶۲۔ فاطمہ پروین، اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، حیدرآباد: عمر پریس (پرنٹو پریس)، ۱۹۸۰ء، ص، ۸۱
۶۳۔ صابر دت، مدیر فن اور شخصیت، اردو قطعہ نمبر، شمارہ نمبر ۳۵، ۳۶، ممبئی: ساحر پبلیشنگ ہاوس، مارچ ۱۹۹۵ء، ص، ۱۳۸
۶۴۔ ایضاً ص، ۱۰۳
۶۵۔ ایضاً ص، ۱۰۱
۶۶۔ شوریدہ کاشمیری، جوش جنوں، دہلی: جمال پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۰ء، ص، ۴۶
۶۷۔ عرش صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص، ۹۷
۶۸۔ مالک رام، کلیات عرش، نئی دہلی: لبرٹی آرٹ پریس پٹوڑی روڑ، ۱۹۸۳ء، ص، ۱۶۸
۶۹۔ عرش صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص، ۸۴
۶۰۔ ایضاً ص، ۹۰
۶۱۔ ایضاً ص، ۱۰۲
۶۲۔ ایضاً ص، ۸۱
۶۳۔ ایضاً ص، ۸۰
۶۴۔ عرش صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵ء، ص، ۱۱۶
۶۵۔ عرش صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص، ۹۵
۶۶۔ صابر دت، مدیر فن اور شخصیت، اردو قطعہ نمبر، شمارہ نمبر ۳۵، ۳۶، ممبئی: ساحر پبلیشنگ ہاوس، مارچ ۱۹۹۵ء، ص، ۱۸۱
۶۷۔ ایضاً ص، ۱۰۱
۶۸۔ صابر دت، شعری ادب، نئی دہلی: تین مورتی پبلی کیشنز، ۱۹۶۶ء، ص، ۱۰۷
۶۹۔ عرش صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص، ۷۴
۷۰۔ ایضاً ص، ۱۰۲
۷۱۔ ایضاً ص، ۱۰۹
۷۲۔ صابر دت، مدیر فن اور شخصیت کشمیری لال ذاکر نمبر، ممبئی: ساحر پبلیشنگ ہاوس، اکتوبر ۱۹۹۴ء، ص، ۳۴۹
۷۳۔ عرش صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص، ۹۶
۷۴۔ ایضاً ص، ۱۰۸
۷۵۔ ایضاً ص، ۱۰۸
۷۶۔ ایضاً ص، ۱۰۰

۷۷۔ امینؔ بانہالی، اندھیروں کا مسافر، جموں: کریسنٹ ہاوس پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص۶۳

۷۸۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص۱۰۵

۷۹۔ صابر دت، مدیر فن اور شخصیت، اردو قطعہ نمبر، شمارہ نمبر ۳۵، ۳۶، ممبئی: ساحر پبلیشنگ ہاوس، مارچ ۱۹۹۵ء، ص۱۱۶

۸۰۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص۱۰۴

۸۱۔ ایضاً ص۸۷

۸۲۔ ایضاً ص۱۱۶

۸۳۔ ماہنامہ شیرازہ، شوریدہؔ کاشمیری نمبر، جلد۶۲، شمارہ ۱، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لیگویج، ص۶۰

۸۴۔ شیرازہ، معاصر اردو نظم نمبر، جلد۵۳، شمارہ ۸۔۱۰، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، ص۲۹۵

۸۵۔ ایضاً ص۲۹۵

۸۶۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص۱۰۵

۸۷۔ ایضاً ص۹۱

۸۸۔ ایضاً ص۸۹

۸۹۔ ایضاص۸۵

۹۰۔ ایضاً ص۹۵

۹۱۔ ایضاً ص۹۸

۹۲۔ صابر دت، مدیر فن اور شخصیت، اردو قطعہ نمبر، شمارہ نمبر ۳۵، ۳۶، ممبئی: ساحر پبلیشنگ ہاوس، مارچ ۱۹۹۵ء، ص۱۱۶

۹۳۔ ایضاً ص۱۱۴

۹۴۔ ایضاً ص:۱۵۳

۹۵۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص۹۷

۹۶۔ ایضاً ص۷۶

۹۷۔ ایضاً ص۹۰

۹۸۔ ایضاً ص۹۱

۹۹۔ ایضاً ص۱۱۱

۱۰۰۔ ایضاً ص۱۱۱

۱۰۱۔ ایضاً ص۱۰۱

۱۰۲۔ ایضاً ص،۷۷

۱۰۳۔ ایضاً ص،۱۰۸

۱۰۴۔ صابر دت، مدیر فن اور شخصیت، اردو قطعہ نمبر، شمارہ نمبر ۳۵، ۳۶ ممبئ: ساحر پبلیشنگ ہاوس، مارچ ۱۹۹۵ء ص، ۲۳۰

۱۰۵۔ ایضاً ص،۹۹

۱۰۶۔ ایضاً ص،۱۹۶

۱۰۷۔ ایضاً ص،۱۵۳

۱۰۸۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء ص، ۶۱

۱۰۹۔ ایضاً ص،۵۷

۱۱۰۔ ایضاً ص:۱۲

۱۱۱۔ ایضاً ص،۴۷

۱۱۲۔ ساحرؔ شیوی، دوہے کوکن کے، شاشتری نگر جے پور: ادبی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء ص، ۲۳

۱۱۳۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: ما مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء ص، ۲۶

۱۱۴۔ ایضاً ص،۶۰

۱۱۵۔ ایضاً ص،۱۱

۱۱۶۔ ایضاً ص،۳۲

۱۱۷۔ جمیلؔ عظیم آبادی، دوہا سنسار، کراچی: راشد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء ص، ۶۳

۱۱۸۔ ایضاً ص،۶۷

۱۱۹۔ شاہ فیصل، مطالعہ اصناف ادب، دہلی: ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرش، ۲۰۱۰ء ص، ۳۳۱

۱۲۰۔ عابدؔ پشاوری، رحمٰن رنگ، لکھنو: کاکوری پریس، ۲۰۰۹ء ص، ۹۳

۱۲۱۔ جمیلؔ عظیم آبادی، دوہا سنسار، کراچی: راشد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء ص، ۶۳

۱۲۲۔ ساحرؔ شیوی، دوہے کوکن کے، شاشتری نگر جے پور: ادبی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء ص، ۱۷

۱۲۳۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء ص، ۴۶

۱۲۴۔ ایضاً ص،۷۰

۱۲۵۔ ایضاً ص،۹۶

۱۲۶۔ ایضاً ص،۵۹

۱۲۷۔ ایضاً ص،۸۷

۱۲۸۔ ڈاکٹر شاہد میرؔ، دوہے عالمگیر، بھوپال: منموہن آفسیٹ، ۲۰۱۱ء، ص،۲۷

۱۲۹۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء، ص،۴۷

۱۳۰۔ ایضاً ص،۱۸

۱۳۱۔ ایضاً ص،۲۶

۱۳۲۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، دلی: دیکشا پرنٹرز، ۲۰۱۵ء، ص،۲۰۵

۱۳۳۔ شاہ فیصل، مطالعہ اصناف ادب، دہلی: ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرش، ۲۰۱۰ء، ص،۳۳۰

۱۳۴۔ ایضاً ص:۳۳۲

۱۳۵۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء، ص،۲۷

۱۳۶۔ ایضاً ص:۱۱

۱۳۷۔ ڈاکٹر شاہد میرؔ، دوہے عالمگیر، بھوپال: منموہن آفسیٹ، ۲۰۱۱ء، ص،۲۲۹

۱۳۸۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء، ص،۲۳

۱۳۹۔ ایضاً ص،۱۵

۱۴۰۔ ساحرؔ شیوی، دوہے کوکن کے، شاشتری نگر جے پور: ادبی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص،۲۲

۱۴۱۔ شاہد جمیل، مناظر عاشق ہرگانوی، دوہارنگ، نئی دہلی: ایم آر آفسیٹ پرنٹرز، ب۔ت، ص،۴۷

۱۴۲۔ ڈاکٹر شاہد میرؔ، دوہے عالمگیر، بھوپال: منموہن آفسیٹ، ۲۰۱۱ ص،ء۲۷

۱۴۳۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء، ص،۱۱

۱۴۴۔ ایضاً ص،۴۹

۱۴۵۔ عابدؔ پشاوری، رحمٰن رنگ، لکھنو: کاکوری پریس، ۲۰۰۹ء، ص،۶۸

۱۴۶۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء، ص،۴۴

۱۴۷۔ ایضاً ص،۴۴

۱۴۸۔ ایضاً ص،۳۴

۱۴۹۔ ایضاً ص،۸۰

۱۵۰۔ ایضاً ص،۱۰۳

۱۵۱۔ ایضاً ص،۹۱

۱۵۲۔ ایضاً ص،۴۹

۱۵۳۔ ایضاً ص،۱۳

۱۵۴۔ ڈاکٹر شاہد میرؔ، دوہے عالمگیر، بھوپال: منموہن آفسیٹ، ۲۰۱۱ء، ص، ۲۳۹

۱۵۵۔ ایضاً ص،۲۵۹

۱۵۶۔ ایضاً ص،۲۷۲

۱۵۷۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء، ص، ۳۰

۱۵۸۔ ایضاً ص،۶۳

۱۵۹۔ ایضاً ص،۴۰

۱۶۰۔ ایضاً ص،۹۷

۱۶۱۔ ایضاً ص،۳۱

۱۶۲۔ ایضاً ص،۲۱

۱۶۳۔ ایضاً ص،۸۴

۱۶۴۔ ایضاً ص،۱۰۴

۱۶۵۔ عابدؔ پشاوری، رحمٰن رنگ، لکھنو: کاکوری پریس، ۲۰۰۹ء، ص، ۳۰۲

۱۶۶۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء، ص، ۱۰۴

۱۶۷۔ ایضاً ص،۴۷

۱۶۸۔ ایضاً ص،۱۰۲

۱۶۹۔ ایضاً ص،۱۰۷

۱۷۰۔ ایضاً ص،۱۰۱

۱۷۱۔ عابدؔ پشاوری، رحمٰن رنگ، لکھنو: کاکوری پریس، ۲۰۰۹ء، ص،، ۳۳۱

۱۷۲۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء، ص، ۲۰

۱۷۳۔ ایضاً ص۳۴

۱۷۴۔ ایضاً ص،۱۰۳

۱۷۵۔ ایضاً ص،۱۲

۱۷۶۔ ڈاکٹر شاہد میرؔ، دوہے عالمگیر، بھوپال: منموہن آفسیٹ، ۲۰۱۱ء، ص، ۱۱۵

۱۷۷۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء، ص، ۹۰
۱۷۸۔ ایضاً ص، ۱۰۵
۱۷۹۔ ایضاً ص، ۹۳
۱۸۰۔ ایضاً ص، ۲۴
۱۸۱۔ ایضاً ص، ۹۹
۱۸۲۔ ایضاً ص، ۹۸
۱۸۳۔ ایضاً ص، ۹۷
۱۸۴۔ ایضاً ص، ۱۷
۱۸۵۔ ایضاً ص، ۲۴
۱۸۶۔ ظہیرؔ غازی پوری، اردو دوہے ایک تنقیدی جائزہ، نئی دہلی: وجے گرافکس، ستمبر ۲۰۰۵ء، ص، ۳۷
۱۸۷: ڈاکٹر شاہد میرؔ، دوہے عالمگیر، بھوپال: منموہن آفسیٹ، ۲۰۱۱ء، ص، ۷۰
۱۸۸۔ ظفر انصاری ظفرؔ، روٹی جیسا چاند، پٹنہ: علمی مجلس بہار، ۲۰۰۴ء، ص، ۹۷
۱۸۹۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۹ء، ص، ۶۸
۱۹۰۔ ایضاً ص، ۱۶
۱۹۱۔ ایضاً ص، ۴۸

☆☆☆

باب سوم

عرشؔ صہبائی کی نظم نگاری میں انحراف کی نوعیت

عرشؔ صہبائی بیسویں صدی کے بعض دوسرے شعراء کے خلاف منتخبات کے شاعر نہیں تھے۔انہوں نے اپنی شاعری کو ترقی پسندی اور جدیدیت کے خانے میں محدود نہیں کیا۔حالاں کہ وہ دورِ جدید ہی کے ایک ممتاز شاعر تھے لیکن جدیدیت سے دور ابہام اور الجھاؤ کے اشارے ان کے کلام میں نہیں ملتے۔وہ ایک سلیقہ پسند شاعر تھے اور ان کے کلام میں ان کا سلیقہ اظہار نظر بھی آتا ہے۔انہوں نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ان کی شعری تخلیقات میں غزلیں،نظمیں،دوہے،قطعات شامل ہیں۔مضامین کے اعتبار سے ان کے کلام میں کافی تنوع ہے۔وہ ایک حساس اور فطری شاعر تھے۔وہ اپنے آس پاس رونما ہونے والے واقعات اور اپنے ذہنی محسوسات کو شعری سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ان کے کلام میں تاثر کا سب سے بڑا سبب جذبات کا خلوص اور صداقت ہے۔ان کے حسن بیان کی دلاویزی نے اس میں اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔ان کے اشعار کے مصروں کی چستی اور روانی اور ہم آہنگی پڑھنے والوں پر ایک خاص خوشگوار اثر چھوڑ جاتی ہے۔

عرشؔ کہنے کو غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کے فن اور قدرت کلام کا اظہار ان کی نظموں میں بھی نظر آتا ہے۔ نظموں میں وہ رمز وایما،استعارات وعلائم کا اس خوبی سے کام لیتے ہیں کہ ایک خاص فضا قائم ہوجاتی ہے،جسے نئی امیجری بھی کہا جاسکتا ہے۔ان کی بیشتر نظمیں انفرادی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی تمام نظمیں طبع زاد ہیں۔ان کی نظموں میں احساس کی پرتیں ہوتی ہیں جن کے حصار میں ماضی،حال اور مستقبل تینوں زمانے آتے ہیں۔اگر احساس کی خورد بینی ترکیب پر غور کیا جائے تو اس کے عوامل میں غم اور خوشی،کرب والم،رنج ونشاط،مایوسی وبے یقینی،روشنی وتاریکی،خیروشر،ظلم وانصاف،سب شامل ہیں۔یہ سب عوامل انسانی تہذیب کا حصہ بنتے ہیں۔ان میں کچھ مری (بہت کم) کچھ غیر مری ہوتے ہیں۔عرشؔ کی شاعری میں ان کے ذاتی تجربات ومشاہدات کا ذکر زیادہ ہے۔اگرچہ انہیں یہ احساس ہے کہ آج کے صنعتی دور میں انسانی رشتوں کا پاس کسی کو نہیں رہا لیکن پھر بھی ان کی شاعری میں ان کا سماجی شعور اور ان کے انسانی رشتوں کا درد بڑی آب وتاب

سے نظر آتا ہے۔

عرشؔ بنیادی طور پر اگر چہ غزل کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے شاعری کی دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ یہاں ایک بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ ان کی شاعری کی کوئی صنف بھی ہو اس میں ان کی فنی مہارت اور مشاقی کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کی بیشتر شاعری زندگی کی آئینہ دار ہے۔ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ انہیں شاعری کے فن پر مکمل عبور حاصل ہے۔ وہ شعر کہتے نہیں بلکہ شعر اپنے آپ کو ان سے کہلوا لیتے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب میں خصوصاً اردو شاعری میں بہت کثیر تعداد میں ادبی سرمایہ چھوڑا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں آمد ہے ورنہ آورد کی بنیاد کر اتنا کثیر اور بہترین ادبی سرمایہ تخلیق کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اس باب میں ہم ان کی نظم نگاری، دوہا اور قطعہ نگاری کے انفرادی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ عرشؔ صہبائی چاہے کسی بات کو شاعری میں بیان کریں یا نثر میں اس کی بنیاد حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہے۔ عرشؔ صہبائی کے کلام کی مقبولیت کی وجہ بھی یہی ہے ان کے کلام میں حقائق زیادہ ہوتے ہیں اور تخیل کم بلکہ بہت کم اور پھر ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے خیالات میں نیا پن ہوتا ہے جو زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ یہ خیالات ہر آدمی سے مربوط ہوتے ہیں۔

ان کی نظم نگاری میں ان کی نظموں کے علاوہ قطعات اور اردو دوہے شامل ہیں۔ ان کے اردو دوہوں پر مشتمل ''تجھ بن چین کہاں'' کے نام سے ایک مکمل مجموعہ شائع ہوا ہے۔ جب کہ ان کے شعری مجموعہ ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' میں نظموں کے علاوہ ان کے قطعات بھی شامل ہیں۔ انہوں نے ایک بار دوران ملاقات اس بات کا اظہار کیا تھا کہ جب انہوں نے نظمیں کہیں تو مجموعہ مکمل ہونے کے بعد مزید نظمیں نہیں ہو سکیں۔ یہی حال ان کے دوہوں کا ہے۔ ان کے قطعات بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ان کے حسن بیان کی بھی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ زبان نہایت سادہ اور پر کشش ہے۔ ان کی شاعری کی مقبولیت کی بھی یہی وجہ ہے۔

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اب عرشؔ صہبائی کے نام کے بغیر اردو ادب کی تاریخ خصوصاً جموں کشمیر کی ادبی تاریخ مرتب کرنا دشوار ہوگا۔ ان کا کلام اردو ادب کی اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی نظمیں، قطعات اور اردو دوہوں کی تعداد اگر چہ کم ہے لیکن ان کے کلام میں روایت اور انفرادیت دونوں عنصر پائے جاتے ہیں۔ ان کی تمام نظمیں موضوع اور فکر کے اعتبار سے اہم ہیں اور ان میں بعض سماجی، تہذیبی اور انسانی مسائل کے محور پر گھومتی

نظر آتی ہیں۔ ''سقراۃ'' ان کی ایک بہترین نظم ہے جسے اردو ادب میں اضافہ ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ نظم موضوع اور فکر دونوں اعتبار سے انفرادیت کی حامل ہے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ نظم ترقی پسند و جدید نظموں میں ہی نہیں بلکہ اردو کی عمدہ نظموں میں شمار ہونے کے قابل ہے ۔۔ قارین کو اردو ادب میں ''سقراۃ'' جیسی نظم کہیں نہیں ملے گی۔ نظم کا ایک ایک مصرعہ دل میں اُتر جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

میں ہوں اس دور کا سقراط مجھے قتل کرو
زہر کا کوئی اثر مجھ پہ نہیں ہوسکتا
رنج اُٹھاتا ہوں نہیں اظہارِ حقیقت کیلئے
میرے سینے میں ہیں رستے ہوئے زخموں کے نشاں
زخم بھی وہ کہ جنہیں دیکھ کے صرف ایک نظر
دل کا مذکور ہی کیا روح لرز جاتی ہے(۱)

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ''سقراط'' کے پس منظر سے میں ذتی طور پر واقف نہیں تھا۔ ان سے معلوم ہوا کہ سقراط ایک حق پرست اور صاف گو یونانی فلاسفی تھے۔ اس وقت کے حکمران انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ چونکہ وہ اَنا زدہ تھے اس لئے ایسی کوئی بات بھی سننا پسند نہیں کرتے تھے جو انہیں پسند نہ ہو، آخر ایک دن سقراط (ان کا نام'' ساقرٹ'' تھا جسے فارسی میں سقراط کہتے ہیں) کو وقت کے بادشاہ کے محل میں طلب کیا گیا اور ایک کمرہ میں بٹھا کر ان کے سامنے زہر کا جام رکھا گیا اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ پئیں۔ سقراط کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے بعد انہیں کمرے میں ٹہلنے کے لئے کہا گیا تاکہ زہر ان کی رگ رگ میں چلا جائے۔ اس کے ردعمل کے طور پر کچھ ہی دیر کے بعد سقراط موت کی آغوش میں سوگئے۔ عرشؔ صہبائی بتاتے ہیں کہ ان کے ذہن میں یہ بات ابھری کہ سقراط بڑا تھا یا آج کا آدمی یعنی سقراط نے زہر پیا اور موت کے آغوش میں چلا گیا اور آج کا انسان قدم قدم پر زہر پی رہا ہے اور زندہ ہے۔ بس اس خیال کے پس منظر میں یہ نظم لکھ دی۔ ذہن میں خود بخود اشعار اترتے چلے گئے۔ مجھے سوچنے کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یہاں ان کے ذہنی ساخت کی بھی تعریف کرنا پڑتی ہے:

میرے احساس یہ ہیں غم کی خراشیں کتنی
میرے گفتار پہ ہیں ضبط کے پہرے کب سے
میرے ماحول کی ہیں دین یہ نادر تحفے
مہرباں مجھ پہ عجیب رنگ سے ہے میرا سماج

لیکن اس پر بھی جو کہتا ہے مجھے میرا ضمیر
بے دھڑک ہو کے سر بزم وہ کہہ دیتا ہوں
جانتا ہوں کہ سزا اس کی کڑی ہوتی ہے
کم سے کم اس میں دل و جاں کا زیاں ہوتا ہے
اپنی فطرت سے مگر بے بس و مجبور ہوں میں
غیر ممکن ہے کہ حق گوئی سے ہو مجھ کو گریز
ہم نوا جب کوئی ملتا نہیں دنیا میں مجھے
بے طرح ایسے میں ڈستا ہے مجھے میرا شعور
مصلحت چیز ہے کیا اور خوشامد کیا ہے
ایسے الفاظ کا مفہوم نہیں مجھ پہ عیاں
ایسے رستوں سے کبھی ہوتا نہیں میرا گزر
منزل دار و رسن ہے مجھے مرغوب بہت
ہم سفر اور کوئی اس میں کہاں ملتا ہے
لطف دے جاتی ہے کچھ تنہا خرامی مجھ کو
میری آنکھوں میں عجیب نشہ عجب عالم ہے
میری رگ رگ میں ہے زہراب الم کی مستی
میں ترس جاتا ہوں اے کاش کوئی مجھ کو ملے (۲)

مذکورہ نظم کے ہر بند میں خود اعتمادی کا جذبہ بھی ہے اور شدتِ احساس بھی۔ اس نظم کا جائزہ لینے کے لئے طویل وقت درکار ہے کئی صفحات پر تفسیر کرنے کے بعد بھی وہ جائزہ نامکمل رہے گا ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ''سقراط'' اردو ادب میں اپنی نوعیت کی واحد نظم ہے۔ بے شک اس نظم کا تعلق سقراط سے ہے لیکن یہ آج کے انسان سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ اس نظم میں اس کے خالق نے اپنی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ جن حالات میں عرشؔ صہبائی نے زندگی بسر کی ہے۔ وہ ان کا حوصلہ ہے، اور اس کے باوجود ادب کو انھوں نے بہت کچھ دیا ہے اور دے رہے ہیں، نظم ''سقراط'' کے کس کس بند کی تعریف کی جائے۔ وہ جس سماج کے رکن ہیں انہوں نے بے باکی کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی ہے۔ انسان کو اس سماج سے کیا کیا حاصل ہے چند الفاظ میں اس کی تفصیل بیان کئی گئی ہے۔ جب یہ مصرعہ نظر سے گزرتا ہے:

''کم سے کم اس میں دل وجاں کا زیاں ہوتا ہے'' (۳)

''کم سے کم'' اور ''دل وجاں کا زیاں'' کی کہاں تک تعریف کی جائے۔ ایسے خیالات شاعر کو سوچنے نہیں پڑے بلکہ خود بخود اس کے ذہن میں آ گئے ہیں اور جب یہ کہا جاتا ہے:

''اپنی فطرت سے مگر بے بس ومجبور ہوں میں'' (۴)

یہاں لفظ ''فطرت'' اپنے اندر کس قدر وسعت سمیٹے ہوئے ہے۔

اس نظم میں ہر مصرعہ ایک کوزے کی طرح اپنے اندر دریا نہیں بلکہ سمندر سمیٹے ہوئے ہے:

''منزل دار ورسن ہے مجھے مرغوب بہت'' (۵)

مندرجہ بالا مصرعہ میں بذات خود ایک نظم ہے پھر یہ مصرعہ دیکھیے:

''میری رگ رگ میں ہے زہراب الم کی مستی'' (٦)

اس میں ''زہر'' کو ''زہراب'' نظم کیا گیا ہے۔ہم کس دور سے گزر رہے ہیں یہ کسی سے پنہاں نہیں، اگر سقراط کے وقت حق گوئی کو گوارا نہیں کیا جاتا تھا تو آج اس سے بھی بدتر صورت ہے۔شاید اس حقیقت کے پیش نظر یہ کہا گیا ہے:

دبے الفاظ میں اس بات کی تصدیق کرے
آج کے دور میں نایاب نہیں حق گوئی
آج کے دور کا سقراط ابھی زندہ ہے (۷)

یہ نظم ذہن ودل کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔اس میں حقیقت بیانی بھی عروج پر ہے نظم میں جو اندازِ بیاں ہے وہ شاعر کی فنی اہلیت کا غماز ہے۔ ''مصلحت چیز ہے کیا اور خوشامد کیا ہے'' کہہ کر شاعر نے بتا دیا ہے کہ وہ کس نوعیت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسی باعث وہ اتنی بڑی نظم کہہ سکا ہے نظم کا ہر مصرعہ ایک نشتر کی طرح کام کرتا ہے۔سقراط اور آج کے آدمی میں جو فرق ہے وہ کس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔آج کا انسان کن مراحل سے گزر رہا ہے اور ان سے کس طرح نبرد آزما ہے اس کی پوری تفصیل دو مصرعوں میں ظاہر ہے:

آج کے دور میں نایاب نہیں حق گوئی
آج کے دور کا سقراط ابھی زندہ ہے (۸)

جناب خورشید کاظمی نظم ''سقراط'' کے متعلق اپنی کتاب ''مغنئ حیات عرش صہبائی'' میں یوں رقمطراز ہیں:

موجودہ حالات کی ترجمان، بامقصد اور اہم نظم ہے یہ جس میں اپنی فطرت کے مطابق عرشؔ حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتے بلکہ للکارتے ہوئے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی کرلو میں اور مجھ جیسے کئی سچ کہتے رہیں گے باوجود اس کے کہ کتنے ہی خطرات کا سامنا کرنا کیوں نہ کرنا پڑے۔عرشؔ نے اپنے آپ کو سقراط کہہ کر حق گوئی کا حق ادا کیا ہے۔عرشؔ کے کلام میں کئی جگہ اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ایسا نہیں کہ انہوں نے محض لفاظی کہی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حق گوئی اور صاف گوئی ان کی خصلت میں شامل ہے۔وہ اس سے چھٹکارا نہیں پاسکتے باوجود اس کے کہ اپنی عادت کے سبب وہ بہت سے دشمن بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔(۹)

نظم ''سقراط'' انداز بیان ہی نہیں بلکہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی اردو نظم نگاری کی روایت میں انفرادی رنگ کی حامل ہے۔اردو کی شعری روایت میں اس موضوع پر کوئی شعری تخلیق نہیں ملتی ہے۔اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عرشؔ صہبائی کی شاعری میں انفرادیت کا پہلو نمایاں ہے۔نظم کی ساخت اور ردھم ہی کو دیکھئے کہ شاعر نے کس قدر باریک بینی کا مشاہدہ اختیار کیا ہے اور نظم کے ہر مصرعے کو ایسے موتی کی لڑی کی مانند پرویا ہے کہ جس کی کوئی دوسری مثال ملنا مشکل ہے۔نظم کے ہر بند سے شاعر کا کردار نمایاں ہوتا ہے۔اگر ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' میں صرف ''سقراط'' نظم ہی شامل ہو پھر بھی یہ مجموعہ مکمل ہے لیکن اس میں بے شمار نظمیں ہیں جنہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔اکثر نظموں کے موضوعات نئے ہیں اور ہماری روزمرہ کی زندگی کا اہم حصہ ہیں لیکن ان پر پہلے کسی نے قلم نہیں اٹھایا ہے۔

عرشؔ کا تعلق ریاست جموں کشمیر سے ہے اور ریاست جموں وکشمیر کی شعری روایت میں کوئی ایسا شاعر اب تک میری نظروں سے نہیں گزرجس نے ان موغوعات پر باقاعدہ قلم اٹھایا ہو۔اگر کسی موضوع پر کسی شاعر نے پہلے قلم اُٹھایا بھی تو اس کے کسی ایک پہلو کو ہی اُجاگر کیا ہے۔عرشؔ صہبائی نے ان ہی نئے موضوعات کے ہر ہر گوشے کو بڑی باریک بینی سے شعری قالب میں ڈھال کر اپنی انفرادیت کو سب پر نمایاں کیا ہے۔اس سے یہ ظاہر ہے کہ عرشؔ صہبائی کتنے حساس دل تھے اور ان کی نظر کتنی گہری تھی۔ان کا کلام طویل مدت سے اچھے اور معیاری رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ان کے کلام میں جہاں تک روایت کا سوال ہے وہ صرف فن تک محدود ہے۔موصوف فنی بے راہ روی کو کسی حال میں برداشت نہیں کرتے تھے۔عرشؔ بعض ایسی نظمیں بھی ہیں جن میں نئے موضوع ہیں اردو میں پہلی بار ایسی نظمیں نظر سے گزری ہیں۔اس بیان کے حوالے سے نظم ''ایک سوال'' حاضر ہے اس نظم میں جو تعمیری نظریہ ہے وہ شاید ہی کہیں نظر آئے تعمیری نظریہ کے علاوہ نظم بھی نئی ہے۔نظم ''ایک سوال''

موضوع اپنی روانی، حسن بیان اور الفاظ کے رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے عرشؔ کی بہترین تخلیق ہے۔ نظم کا موضوع جس واقعہ پر منحصر ہے اس قسم کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں لیکن جس طرح شاعر نے اس نظم کا اختتام کیا ہے وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس نظم میں جو تعمیری نظریہ ہے وہ شاید ہی کہیں نظر آئے۔ تعمیری نظریہ کے علاوہ نظم بھی نئی ہے۔ نظم کی روانی اور حسن بیان کا آپ از خود مشاہدہ کریں:

گلی کے موڑ پر اک ریشمی چادر کے ٹکڑے میں
پڑا ہے ایک نوزائیدہ بچہ ساکن و ساکت
عجب انداز سے کتنے ہی رہ رو دیکھ کر اس کو
گزر جاتے ہیں جیسے ان کو فرصت ہی نہیں مطلق
کہ یہ دم بھر کو ٹھہریں اور پوچھیں ماجرا کیا ہے؟
گماں ہوتا یہ جیسے یہ بھی اس سازش میں شامل ہیں
کہیں تو کیا کہیں آخر یہ کس کے پاپ کا پھل ہے
نہ جانے کون سی مریم کسی شیطان کے ہاتھوں
لٹی کچھ اس طرح جیسے کوئی طوفان گھر آئے
بہا لے جائے اپنے ساتھ کتنی بستیاں لیکن
کسی کو یہ خبر تک بھی نہ ہو کچھ حادثہ گزرا
ادھر کچھ لوگ شغلاً رک گئے ہیں میرے پاس آ کر
کسی کے لب پہ یہ فقرہ ''محبت کی نشانی'' ہے
کوئی یہ طنز کرتا ہے ''نئی تہذیب'' ہے صاحب
کوئی کہتا ہے ''ایک دوشیزہ'' نے غربت سے تنگ آ کر
''فقط دو روٹیوں کے واسطے عصمت کو بیچا ہے''
یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
محبت شدت جذبات میں بہہ کر بھٹک جائے
فسانہ مختصر یہ جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہیں
مگر اک بات میرے ذہن پر اب تک مسلط ہے
میرے دل میں ابھرتا ہے یہ رہ رہ کر سوال آخر

کہ ہم میں کون ہے ایسا جو اس بچے کو اپنائے (۱۰)

یہ حقیقت ہے کہ کسی نظر سے ایسی نظم نہیں گزری ہوگی اس میں جو فنی خوبیاں ہیں ان کی کیا تعریف کی جائے سب سے اہم اس کا موضوع ہے اس نظم کو ہم جدید نظم کہہ سکتے ہیں جو مربوط بھی ہے اور بامعنی بھی قاری کو یہ نہیں سوچنا پڑتا کہ نظم میں کیا کہا گیا ہے بلکہ پڑھتے ہی سارا منظر عیاں ہو جاتا ہے۔نظم کا انداز بیان بھی نہایت خوب ہے۔ یہ نظم ذہن میں ہی نہیں دل میں اتر جانے کا مادہ رکھتی ہے اور اس فرض کے لئے ابھارتی ہے جو انسان پر لازم ہے۔اس نظم میں عرشؔ نے آج کی نئی تہذیب کو بے نقاب کیا ہے۔اس میں انہوں نے ایک نا معلوم نو زائید بچے کو موضوع بنایا ہے جسے کوئی گلی کے موڑ پر لاوارث چھوڑ گیا ہوتا ہے۔اس بچے کے ماں ماپ اور اس کی پیدایش کے متعلق لوگ بس تبصروں میں مصروف ہوتے ہیں، کوئی اسے ''محبت کی نشانی'' بتاتا ہے اور کوئی طنزیہ لہجے میں کہتا ہے ''نئی تہذیب ہے صاحب'' لیکن شاعر کے لئے دل میں یہ سوال اُبھرتا ہے ''کہ ہم میں کون ہے ایسا جو اس بچے کو اپنائے'' اسی پر موصوف نے نظم کا اختتام کیا ہے۔نظم کا انداز بیان بھی نہایت خوب ہے۔ یہ نظم ذہن میں ہی نہیں دل میں اتر جانے کا مادہ رکھتی ہے اور اس فرض کے لئے ابھارتی ہے جو انسان پر لازم ہے۔اس نظم کے کئی خوبصورت پہلو ہیں۔ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ نظم بھی ہے اور نثر بھی کیوں کہ نظم میں اتنا بہاؤ اور اتنی روانی ہے جو قاری کے ذہن و دل کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔نظم کا آخری شعر زندگی کا تعمیری نظریہ لیے ہوئے ہے بلکہ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ ایک مصرعے میں تمام نظم بند ہو کر رہ گئی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ چوں کہ آج کا دور شاعری کی محنت کا دور ہے اس لئے آج کے دور میں ایسی سوچ اور جذبات سے لیس شاعری ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر خود اس واقعہ سے کتنا متاثر ہوا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضع کر دی جائے کہ عرشؔ صہبائی کا اردو شاعری میں اپنا منفرد مقام ہے۔انہوں نے شاعری میں کبھی تقلید کو اہمیت نہیں دی۔ یہاں ایک طرف اردو غزل کو انہوں نے نئی زمینیں اور نئے اشعار دئے وہیں اردو نظم کو انہوں نے نئے موضوعات دے کر اس کا دائرہ وسیع کیا ہے۔اگر چہ ان کے شعر کہنے کا اپنا الگ انداز ہے لیکن ان کا انداز بیان کہیں کہیں روایتی بھی نظر آتا ہے۔عملی طور پر یہ مشکل نظر آتا ہے کہ زیر نظر مجموعہ میں شامل تمام نظموں پر تبصرہ کیا جائے لیکن ان کی اکثر نظمیں ایسی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

عرشؔ کے شعری مجموعہ ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' کا نام جس نظم کی بدولت تجویز ہوا ہے اس نظم کا موضوع بھی بالکل نیا ہے۔عرشؔ کی اس نظم کا موضوع جھونپڑوں میں رہنے والے ان لوگوں کی کہانی بیان کرتا ہے جو وقتاً

فو قتاً نئی نئی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنے کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں ۔یہ وہ لوگ ہیں جو جھونپڑوں پیدا ضرور ہوتے ہیں لیکن اپنی ذہانت اور قابلیت کی بدولت ایسے کارنامے انجام دیتے ہیں کہ آنے والی نسلیں ان کی مثالیں بیان کرتی ہیں۔اس نظم کے پس منظر میں تاریخ کی بے شمار ہستیاں آتی ہیں جنھوں نے ابتدائی زندگی جھونپڑوں میں گزاری لیکن مستقبل میں انقلاب لانے والوں میں وہی لوگ سرِ فہرست ہیں۔اس میں کوئی نہیں کہ عرشؔ کی یہ نظم ایسی حقیقت کو اپنی دامن میں سیٹے ہوئے ہے کہ جس کی صداقت قیامت تک آنے والی نسلیں بیان کرتی رہیں گی۔نظم پیش ہے:

یہ جھونپڑے بھی عجب ہیں کہ جن میں شام وسحر
خوشی کا ذکر نہیں، راحتوں کا نام نہیں
بڑا کثیف اندھیرا ہے ان کی قسمت میں
کوئی بھی دن نہیں ایسا جو مثلِ شام نہیں
یہ بے بسی، یہ نحوست، یہ یاسیت کا یہاں
عروس سرخوشی آتے ہوئے جھجکتی ہے
عجب گھٹن ہے عجب ذہر ہے فضاؤں میں
حیات اپنے مقدر پہ ہاتھ ملتی ہے
قریب و دور ہے پھیلا ہوا اجل کا سکوت
نگاہ جس طرف اٹھتی ہے غم کے سائے ہیں
یہ حادثہ بھی ہوا ہے یہاں بسا اوقات
کہ گفتگو کے لیے ہونٹ کپکپائے ہیں
یہ رینگتے ہوئے تاریک جھونپڑوں کے مکیں
یہاں کے لوگ ہیں یا چلتی پھرتی لاشیں ہیں
ہر ایک دل پہ کئی زخم ہیں تمنا کے
ہر ایک روح پہ غم کی کئی خراشیں ہیں
ہیں دل شکستہ بہت وقت کے ظالم سے
مگر یہ صابر و شاکر ہیں فاقہ مستی میں
کہاں سے لائے کوئی ان کے حوصلے کا جواب

گلہ زباں پہ نہیں کوئی تنگدستی ہیں
مگر کبھی کبھی اک برق کوند جاتی ہے
فضا میں چارسو ہوتی ہے سرگوشی
پگھلنے لگتا ہے ماحول اک حرارت سے
لرزنے لگتی ہے روزِ ازل سے خاموشی
کہیں کہیں کوئی آوازِ حق ابھرتی ہے
کہیں کہیں کوئی مدھم چراغ جلتا ہے
مری نگاہ میں یہ جھونپڑے عظیم ہیں عرشؔ
یہ وہ جگہ ہیں جہاں انقلاب پلتا ہے (۱۱)

نظم ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' کے بارے میں عرشؔ صہبائی کے عزیز شاگرد جناب غلام جیلانیؔ، یہ رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے جو ان کی مرتب کردہ کتاب ''عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی'' کے صفحہ 181/پر درج ہے وہ لکھتے ہیں:

''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' ان کی شاہکار نظم کہی جاسکتی ہے جو سات بند پر مشتمل ہے یہ ان دنوں کی بات ہے جب عرشؔ صہبائی لال قلعہ کا مشاعرہ پڑھنے کے لئے دہلی تشریف لے گئے تو دہلی ریلوے اسٹیشن پر اترتے ہی داہنی طرف ان لوگوں کے جھونپڑے ہیں جو تنگ دستی کی زندگی گزارنے کے باوجود زبان پر کوئی شکوہ نہیں لاتے۔ مایوسی اور بے روزگاری ان کا مقدر بن چکی ہے ان کی زندگی میں روزازل سے راحت نام کی کوئی چیز نہیں ان کے لئے دن مثل شام ہے۔ خوشی نام کی چیز نے کبھی بھی ان کے جھونپڑوں پر دستک نہیں دی ان سب حالات کے پیش نظر یہ نظم وجود میں آنے کا سبب بنی۔ انہوں نے اس نظم میں غریبوں، بے کسوں اور مظلوموں کی زندگی کی خوبصورت اور کامیاب تصویر کشی کی ہے، اس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح وہ دن رات محنت کر کے دو وقت کی روٹی حاصل کرتے ہیں ان کی زندگیاں اپنے مقدر پہ ہاتھ ملتی ہیں ان کے چہروں پر نظر دوڑائیں تو مایوسی ان کے نیم مردہ چہروں سے صاف عیاں ہے ان کے چہرے اس بات کی گواہی پیش کرتے ہیں کہ ان کے دلوں میں کئی خراشیں ہیں اور ان کے دل شکستہ نہیں لیکن اس کے باوجود بھی ان کے حوصلے کا جواب کوئی کہاں سے لائے گا۔ یہ گلہ تک نہیں کرتے وقت کی ستم ظریفی کے سامنے یہ لوگ گھٹنے تک نہیں ٹیکتے بلکہ ان میں جہد مسلسل ہے۔ فاقہ کشی کے باوجود صابر وشاکر ہیں۔ حق گوئی ان کا شیوہ ہے۔ (۱۲)

مندرجہ بالا تحریر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عرشؔ صہبائی کتنے حساس دل تھے۔ موصوف دوسروں کے درد

کو اپنا درد سمجھتے ہیں۔حق گوئی اور صاف گوئی ان کے والد جناب مادھورام اپرول کی دین ہے جس پر عرشؔ آج تک عمل پیرا ہیں۔ان کے بزرگوں نے جو باتیں انہیں بتائیں ہیں انہوں نے صرف انہیں سنا نہیں ہے بلکہ ان پر عمل بھی کیا ہے۔ان باتوں کا ردِعمل تکلیف دہ ضرور ثابت ہوا لیکن انہیں حق گوئی پر ہمیشہ فخر رہا۔ یہاں اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ عرشؔ صہبائی کا شعر کہنے کا اپنا الگ انداز ہے۔نظم کا ایسا ماحول ہے کہ اسے پڑھنے والا اس میں کھو جاتا ہے۔نظم کا ہر بند ایک دوسرے کے ساتھ سے مربوط ہے۔اس نظم کے آخری بند میں عرشؔ صہبائی لکھتے ہیں کہ میری نظر میں یہ جھونپڑے عظیم ہیں کیونکہ انقلاب ان جگہوں میں پلتا ہے۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کیونکہ کا مارکس کے فلسفے کی بنیاد بھی یہی لوگ ہیں جس پر آگے چل کر ترقی پسندی کی تحریک جنم لیتی ہے۔

عرشؔ صہبائی بہت سے شاعروں سے متاثر ہوئے ہیں لیکن کسی بھی شاعر کی تقلید نہیں کہ بلکہ اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے۔اردو شاعروں کا ایک کارواں ایسا ہے کہ جنہوں نے اپنی شاعری میں جذباتِ عشق سے زیادہ کیفیاتِ عشق کی تصویر کشی پر زیادہ توجہ دی ہے۔اس سلسلے میں فراقؔ اور ناصرؔ کاظمی کا کلام دیکھا جاسکتا ہے جنہوں جذباتِ عشق کے ساتھ ساتھ انسانی وجود کی صورت حال اور اپنے عہد کے سیاسی وسماجی حالات کو داخلی رنگ میں پیش کیا ہے۔عرشؔ کا کلام ان سے بالکل برعکس ہے کیونکہ انہوں سیاسی وسماجی حالات کو داخلی رنگ کچھ حد تک ضرر دیا ہے لیکن کیفیاتِ عشق سے زیادہ جذباتِ عشق کی تصور کشی پر زیادہ توجہ دی ہے۔یہ بھی عرشؔ کی خوبی ہے کہ انہوں نے اپنے سچے تجربات کو نہایت پُرخلوص جذبے کے ساتھ اپنی ان نظموں میں پیش کیا ہے۔انہوں نے نظمیں کم کہی ہیں لیکن جتنی بھی کہی ہیں ان میں بھی اپنی فنکاری کا مکمل ثبوت پیش کیا ہے۔ان سے گفتگو کے دوران کئی مرتبہ یہ بات سامنے آئی کہ وہ نثری نظم کو فنکاری نہیں گردانتے تھے اس لئے انہوں نے کوئی نثری نظم نہیں کہی۔البتہ وہ نظم نگاری میں تجربوں کے قائل رہے ہیں۔انہوں نے اردو شعری ادب کو پابند نظموں کے ساتھ ساتھ اچھی آزاد نظمیں بھی دی ہیں۔قارئین کی اطلاع کے لئے ہم اتنا عرض کردیں کہ عرشؔ صہبائی نے ''سانیٹ'' کی صنف پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور بقول عبدالقادر سروری: ''عرشؔ نے سانٹ کی صنف پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور قدرت اظہار نے اس کو بھی اچھا نمونہ بنادیا ہے۔''(۱۳)

ان کی نظموں میں ایک سانیٹ جو 'یاد' کے عنوان سے ہے وہ ان کے جذباتِ عشق کی عکاسی کرتا ہے۔ نظم پیش ہے:

زندگی آج یہ کس موڑ پہ لے آئی ہے

دل میں اب تیری محبت کا تلاطم بھی نہیں
لب افسردہ پر اک موج تبسم بھی نہیں
ایک مری ذات ہے یا عالم تنہائی ہے
چاند نکلا ہے مگر چاندنی مغموم سی ہے
کتنے رنگین نظارے ہیں مگر کچھ بھی نہیں
مست موسم کے اشارے ہیں مگر کچھ بھی نہیں
دل پریشان سا ہے زندگی مغموم سی ہے
تیری محفل سے بہت دور نکل آیا ہوں
اب پلٹ جاؤں یہاں سے کوئی امکان نہیں
دل کو آرام میسر ہو یہ آسان نہیں
ایک طوفان حوادث کا اٹھا لایا ہوں
کوئی عالم ہو مگر یاد تیری آئے گی
دل کو ہر حال میں ہر رنگ میں تڑپائے گی (۱۴)

سرورؔی صاحب کے مطابق عرشؔ شعر میں اظہار اور آہنگ کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں اور صوت تکرار سے ان کے یہاں باہمی خصوصیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس نظم میں عرشؔ نے اختصار سے کام ضرور لیا ہے لیکن نظم میں روانی اور تکرار کا بہترین نمونہ بن گئی ہے۔ عرشؔ نے درد جدائی اور تنہائی میں محبوب کی یاد کا بہترین نقشہ اس نظم میں کھینچا ہے۔ نظم ''یاد'' کو نظم کے علاوہ سوز و گداز کا نغمہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی نظم میں الفاظ کا انتخاب بھی لاجواب ہے:

''چاند نکلا ہے مگر چاندنی مغموم سی ہے''
''دل پریشان سا ہے زندگی مغموم سی ہے'' (۱۵)

لفظ ''مغموم'' کو عرشؔ نے دوبار استعمال کیا اور دونوں دفعہ الگ مضمون کو واضع کیا ہے جو ان کا مشاقی اور بزرگی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ ''یاد'' کے بعد ایک اور سانیٹ پر نظر ڈالتے ہیں جو ''دل'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے اس کا خیال اس لئے بھی آ گیا کہ یہ دونوں سانیٹ آپس میں ایک گہرا ربط رکھتے ہیں:

دل ہے یا شہر خموشاں کا شکستہ سا مزار
دفن جس میں محبت بھرے ارمان کئی

جس سے لپٹے ہوئے ہیں حشر کے سامان کئی
اب تو اس بستی کی ہر چیز ہے اڑتا سا غبار
کتنے ہنگاموں کا مرکز یہ ہوا کرتا تھا
کتنے ارمان پلا کرتے تھے اس محفل میں
کتنے طوفان پلا کرتے تھے اس محفل میں
اک ستم گر کی محبت کا یہ دم بھرتا تھا
اُلفت وشوق کے رنگین فسانے نہ رہے
اب تو ہر چیز پر اک مردہ دل چھائی ہے
محفل زیست میں ویرانی ہے وتنہائی ہے
وہ محبت نہ رہی اب وہ زمانے نہ رہے
پھر بھی دل ہے کہ غم و درد سے بھر آتا ہے
جب بھی لبریز ہو پیمانہ چھلک جاتا ہے(۱۶)

اگر چہ سانیٹ غیر اردو صنف ہے لیکن عرشؔ صہبائی نے اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ جیسے یہ اردو شاعری کی صنف ہو اس سے تصدیق ہوتی ہے کہ موصوف جس صنف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں اسے ایک معیار پر پہنچا دیتے ہیں۔اردو کے بیشتر قد آور شعرائے کرام کی یہ رائے ہے کہ ان کا اپنا الگ انداز ہے۔مندرجہ بالا سانیٹ کے مصرعہ ''محفل زیست میں ویرانی وتنہائی ہے'' کو اگر ہم یوں تحریر کریں ''محفل زیست میں ویرانی ہے تنہائی ہے'' تو یہ کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے۔دونوں مذکورہ سانیٹ درد کا مجسمہ ہیں۔اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کہنے والے کی اپنی زندگی سے وابستہ ہیں اور وہ خود ان حالات سے گزرا ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے۔

سانٹ شاعری کی اہم صنف شاعری ہے جس میں اعلیٰ توازن درکار ہوتا ہے۔اس کا ثبوت ان کا کلام پڑھنے سے واضح ہو جاتا ہے۔عرشؔ کے یہ دونوں سانٹ پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اس صنف کا حق ادا کیا ہے۔نظم ''یاد'' ہو یا ''دل'' دونوں میں الفاظ کا بہترین انتخاب، روانی، نغمگی اور غضب کا توازن و تناسب پایا جاتا ہے۔نظم کے چودہ مصروں میں سے ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں جس میں کسی قسم کا جھول موجود ہو۔ہر مصرعے میں غنائیت و موسیقی اور ترنم و روانی اس قدر ہے کہ شاعر کی نازک مجازی کا احساس ہوتا ہے۔عرشؔ نے دونوں نظموں میں انسانی نفسیات کے ایسے باریک پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے کہ جن پر پہلے کسی

شاعر کی اگر نظر گزری بھی ہے تو وہ اسے شعری جامہ پہنانے سے قاصر رہا ہے۔

عرشؔ کی نظمیں موضوعات اور ان کی پیش کش کے اعتبار سے ایک خاص ادبی معیار کی حامل ہیں۔ انہوں نے انہیں موضوعات کو اہمیت دی ہے جن پر پہلے بہت کم کہا گیا ہے۔ان کی نظموں اس لیے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ انہوں کسی بھی خشک اور غیر دلچسپ موضوع کو اپنی نظموں کا موضوع نہیں بنایا ہے۔عرشؔ کی نظموں میں انحراف کی ایک بڑی اور اہم صورت یہ ہے کہ ان کی نظمیں شعریت سے لبریز ہیں جبکہ ان اکثر و بیشتر معاصرین میں اکثر کی نظمیں شعریت سے خالی ہیں اور اکثر ایسے ہیں جن کی نظمیں نثر سے الگ نہیں ہیں۔نظم ایک شعری صنف ہے اس میں شعریت ایک لازمی جز کی حیثیت رکھتی ہے۔عرشؔ شعر میں شعریت کو اہمیت دینے والے بڑے شاعر تھے۔سلاست اور سادگی عرشؔ کی نظمیوں کی خصوصیت ہے اور اس خصوصیت نے ان میں روانی پیدا کر دی ہے اور جس مقصد سے یہ نظمیں کہی گئی ہیں اس میں شاعر کامیاب نظر آتا ہے۔عرشؔ کی فنکاری اور قادرالکلامی کی سطح بلند تر ہے۔ان کی نظموں کو ان کے طنزیہ اسلوب نے نہ صرف سنوارا بلکہ الچسپ بنا دیا ہے۔بقول پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انورؔ ''جناب عرشؔ صہبائی کے کلام میں افکار کی طرفگی کے ساتھ بیان کی دل آویزی بھی پائی جاتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی کہ جناب عرشؔ صہبائی اصول فن اور صحت زبان کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور فرسودہ مضامین نظم کرنے کے بجائے نئے نئے خیالات کو عمدہ الفاظ کو دلکش لباس میں جلوہ کر دیتے ہیں۔دنیائے اردو کو ان کی ذات بڑی توقعات رکھنی چاہئیں۔'' (۱۷)

عرشؔ کی بعض ایسی نظمیں ہیں جو تلخ حقائق سے وابستہ ہیں۔ان میں ''نعمت مخصوص'' ایسی نظم ہے جو انسان کے ذہن کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ یہ سیاسی حالات کی پیدوار ہے اور اسے پڑھتے ہی قاری پر یہ حقیقت واضح ہوجاتی کہ اس کا واسطہ کس ماحول سے اور کن سیاست دانوں سے ہے۔مجموعہ ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' میں جہاں نظم درج کی گئی ہے اس کے نیچے لکھا گیا ہے (ماضی کا ایک ورق) نظم پڑھنے سے تمام صورتحال واضح ہوجاتی ہے کہ موصوف نے نظم میں دورِ ماضی کی سیاست کا خوبصورت اور تلخ آمیز نقشہ کھینچا ہے۔نظم ''نعمت مخصوص'' اپنے انداز بیان کی حیثیت سے بالکل نئی نظم ہے۔25 جون 1975 کی شام ڈھلتے ڈھلتے جب دہلی کی رام لیلا میدان میں جئے پرکاش نارائن نے رام داری سنگھ دِگر کی انقلابی نظموں پڑھا تو لوگوں میں جوش کے پھوہارے اُمڈ پڑے۔اس کے نتیجے میں اس وقت کی وزیر اعظم نے ملک میں ایمرجنسی لگا کر ایسا قدم اٹھایا جو آزادی کے بعد ہندوستان بھر کے لئے تاریخ کا سب سے بڑا کالا دن مانا جاتا ہے۔انہیں وجوہات کی بنیاد پر ہندوستان کے مختلف شعراء نے

اپنے انداز میں اس پر ردعمل ظاہر کیا۔عرشؔ کی یہ نظم انہیں حالات کی پیداوار ہے۔نظم اس طرح ہے:

ہر چیز پہ غالب ہیں جو ہیں جاہل و نادار
جو عاقل و دانا ہیں تذبذب میں پڑے ہیں
وہ رنگ دکھایا ہے سیاست نے وطن میں
ہم آج تباہی کے دہانے پہ کھڑے ہیں
یہ بات گراں گزرے گی کچھ لوگوں کو لیکن
بگڑے گی یقیناً ابھی جینے کی فضا اور
بے معنی سے ہو جائیں گے الفاظ صداقت
مقبول یہاں ہوں گے ابھی مکر وریا اور
ماحول میں پھیلے گا عجب زہر بہ ہر سو
جب بات کوئی ہوگی تو ہر سانس رکے گی
کیا علم تھا منظر یہ ہمیں دیکھنا ہوگا
جب حق کی جبیں سجدۂ باطل میں جھکے گی
اعجاز سیاست ہے کہ اعجاز جہالت
اس نقطہ سے ہم اب بھی خبردار نہیں ہیں
ہر چیز کے حقدار ہیں ٹھہرائے گے وہ
جو لوگ کسی چیز کے حقدار نہیں ہیں
کیا طرفہ تماشہ ہے، ریاکار ہیں جو لوگ
ان لوگوں کی ہوتی ہے یہاں پشت پناہی
جو لوگ دل و جاں سے وطن پر ہیں نچھاور
ان لوگوں کا والی ہے زمانے میں خدا ہی
اظہارِ حقیقت کے لئے جو بھی سزا ہو
ہم خندہ دلی سے اسے لبیک کہیں گے
افسردہ و غمگین ہیں مگر جان حزیں پر
جو ظلم بھی ٹوٹے گا وہ ہنس ہنس کے سہیں گے
اے اہل سیاست ہمیں سولی پہ چڑھا دو

اس نعمت مخصوص کے حقدار ہیں ہم لوگ
بے خوف اٹھاتے ہیں حقائق سے جو پردے
وہ اہل نظر ہم ہیں وہ فنکار ہیں ہم لوگ (۱۸)

یہ نظم انہوں نے 1975ء میں کہی تھی لیکن یہ آج کے ہندوستان کے حالات پر بھی صادق آتی ہے۔عرشؔ نے اس نظم میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جو عاقل اور دانا ہیں وہ سب پریشان ہیں وہ زمانے کے گھڑیال میں پھنسے ہوئے ہیں اور جن کے سر پر مکروفریب کا تاج ہے ایسے لوگوں کی ہی مقبولیت ہو رہی ہے۔ عرشؔ بڑے تلخ لہجے میں کہتے ہیں کہ ملک میں غلط سیاسی رہنماؤں کی بدولت ملک تباہی کی ڈگر پر ہے۔نظم کے آخری بند میں کہتے ہیں کہ جو حق گو ہیں ان کو اہل سیاست سولی پر چڑھا دیتے ہیں کیوں کہ حق بات کہنے سے کبھی گریز نہیں کرتے اور یہی بات سیاست سے اپنی روٹیاں سیکنے والوں کو برداشت نہیں ہوتی۔عرشؔ کہتے ہیں کہ ہم ہیں اس نعمت مخصوص سے پردہ اٹھانے والے اس لئے ہمیں سولی پر چڑھا دو کیوں کہ ہم فنکاروں کی یہی خوبی ہے ہم حق بات پر قایم رہتے ہیں۔

عرشؔ کے اس طرح طنزیہ پیرائے اظہار کی بدولت ہی ان کی نظمیں زمانہ حال پر بھی صادق آتی ہیں۔ ہر معاشرے میں کچھ خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں جو عام لوگوں کے مشاہدے میں نہیں آتی جبکہ ادیب وشعراء حضرات بڑی باریکی سے ان کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں اور اس پر اپنا ردعمل بھی ظاہر کرتے ہیں۔عرشؔ کی نظموں میں جو طنزیہ عنصر ہے وہ ان کے اپنے معاشرے کی دین ہے۔وہ اپنے اردگرد کے سیاسی اور ادبی ماحول سے مکمل باخبر ہی نہیں بلکہ اس میں جو کچھ خامیاں ان کو نظر آئیں ان کو شعری قالب دے کر ان کے خلاف آواز بلند کی تا کہ ان کو ختم کیا جا سکے یعنی سماج کی دکھتی رگھوں پر نشتر چلائے گئے ہیں۔ پروفیسر ایس،اے، قاضی۔شآذ شرقی نے اپنی کتاب ''عرشؔ صہبائی شخصیت اور شاعری'' میں عرشؔ کے متعلق یوں لکھا ہے کہ ''عرشؔ کے کلام میں طنز و مزاح بھی ہے جو ایک زبردست اخلاقی قوت ہے۔جو معاشرے کی اصلاح کا بڑا ذریعہ ہے۔عرشؔ کے طنزومزاح نے اردو ظرافت کو ایک شُشتہ ذہن اور شائستہ لہجہ دیا ہے،ان کے مزاض کو خالص ادبی مزاج کہا جا سکتا ہے کس میں شعروادب کی صدیوں کی صدائے بازگشت ملتی ہے،مرقع نگاری اور انتقیدی مزاج بھی'' (۱۹)

عرشؔ کی مذاقِ شعری میں رچاؤ اور بالیدگی ملتی ہے۔وہ لفظوں کے انتخاب میں بھی اسی رچے ہوئے شعور کا ثبوت دیتے ہیں۔ان کی نظمیں حواس کے تاروں کو چھیڑتی ہیں اور روح پر سرخوشی بن کر چھاتی ہیں۔ان کی شاعری

جذبات کی دل آویز موسیقی ہے۔وہ اپنی نظموں میں انسانی جذبات واحساسات کی مصوری کے قائل ہیں۔ باہمی رواداری اوراخلاقی بیداری آپ کی نظموں کا ایک خاص موضوع ہے۔ان کی نظمیں ہیئت اوراسلوب کے لحاظ سے زور اور صفائی رکھتی ہیں ۔ان کی تمام نظمیں شعریت سے لبریز ہیں جبکہ ان کے معاصرین کے ہاں ایسا نہیں ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی کچھ نظمیں موضوعاتی بنیاد پر روایتی ہیں لیکن ان میں انداز بیان ان کا اپنا ایجاد کردہ ہے۔یہی وصف ان کی انفرادیت کو واضح کرتا ہے۔ان سے پہلے بھی کئی شعراء ایسے گزرے ہیں جنھوں نے انسان دوستی،قومی یکجہتی اور وطن پرستی کے موضوع پر بے انتہا کہا ہے اور بہترین کہا ہے لیکن ہر شاعر کا اپنا ایک دائرہ کار ہوتا ہے،ایک مخصوص انداز بیان ہوتا ہے جو اسے دوسرے قلمکاروں سے جدا کرتا ہے۔

عرشؔ کی نظموں کا لہجہ ایک نئی فکری بصیرت اور فنی آراستگی لئے ہوئے نظر آتا ہے۔آپ کلاسیکی اور جدید ادبی روایات سے پوری طرح آشنا ہیں اور ایک نئی حسیت اور فکری بصیرت سے آراستہ ہیں۔آپ جہاں روایت کی پاسداری کرتے ہیں وہیں ایک نئی جمالیاتی بصیرت کو بھی کام میں لاتے ہیں۔آپ نے زیادہ طویل نظمیں نہیں کہیں لیکن اپنی مختصر نظموں سے بھی لازوال درس فراہم کیا ہے۔آپ کے کلام میں جہاں اخلاقی اقدار کی پاسداری ملتی ہے وہیں سیاسی اور سماجی بے راہ روی پر گہرا طنز دیکھنے کو ملتا ہے۔عرشؔ کی نظموں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں اکثر ایسے جذبے کی پیش کش ملتی ہے جو ان سے پہلے اردو نظم میں جاذب توجہ نہ ہوسکا۔ان کی بعض ایسی نظمیں ایسی ہیں جن میں عصری حسیت اور آفاقی معنویت پوشیدہ ہے۔ان کی وطن پرستی کے جذبے پر کہی گئی اکثر نظمیں اسی نوعیت کی ہیں۔ان کی نظموں میں غنایت اور نغمگی کا عنصر موجود ہے۔وہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اپنے وطن کی ترقی اور خوشحالی کے لئے مضطرب نظر آتے ہیں۔

نظم ''قطعہ'' عرشؔ کی حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ایک بہترین اور نئی نظم ہے جس میں انہوں نے انسانی نفسیات کو جھنجوڑنے کی کوشش کی ہے۔یہ نظم وطن پرستی کے جذبہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے لیکن یہ انسانی شعور کو بیدار کرتے ہوئے وطن پرستی کی حقیقی جذنے کا اظہار کرتی ہے۔نظم ''قطعہ'' کے مندرجہ والا شعر کے مطلق جناب علام جیلانیؔ اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں کہ ''اس میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ خاردار راہوں سے گھبرانے کی ضرورت نہیں انہیں کانٹوں میں پھول بھی نمودار ہوتے ہیں یعنی مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ہے۔یہ شعر قرآن کریم کے تیسواں پارے کی سورہ الم نشرح کی ایک آیت کی عکاسی کرتا ہے۔اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا بیشک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔''(۲۰)

اس نظم میں کل پانچ اشعار ہیں لیکن یہ چھوٹی ہونے کے باوجود بھی وسیع معنوی حیثیت رکھتی ہے۔نظم کے چند اشعار پیش ہیں:

یہی ہے زندگی میری یہی ہے اس کا حاصل بھی
وطن کے واسطے یہ جان بھی حاضر ہے یہ دل بھی
تلاطم خیز موجوں مین سفینہ ڈال دے اپنا
تلاطم خیز موجوں سے اُبھرآتا ہے ساحل بھی
نہیں ہے جس بشر کے دل میں کچھ احساسِ خودداری
وطن کے واسطے وہ ذہر بھی ہے تیغ قاتل بھی (۲۱)

درج ذیل اشعار سے موصوف کے جذبہ حب الوطنی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔عرشؔ انسان دوستی، پیار اورمحبت کے نقیب ہیں وہ جہاں کہیں اس کے برعکس دیکھتے یامحسوس کرتے ہیں تو ان کے اندر کا انسان اور شاعر تڑپ اُٹھتا ہے اور وہ اپنے احساسات کو الفاظ کی شکل دے کر اپنی ناپسندیدگی کو ظاہر کرتے ہیں۔نظم ''قطعہ'' فنی لوازمات کی مکمل پاسداری کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس میں بعض نصیحت آموز نکات بھی دیکھے جاسکتے ہیں:

ترے دل میں فقط عزم مُصّمم کی ضرورت ہے
تیرے قابو میں پھر موجِ طوفاں بھی ساحل بھی
نہ ہو مایوس اتنا دیکھ کر پُر پیچ راہوں کو
انہیں راہوں پر نہاں ہے تیری منزل بھی (۲۲)

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ آج چند دیر کے لئے نعرہ بازی کرنے والوں کو ہی مُحب وطن مانا جاتا ہے اگرچہ انسان انسانیت سے کتنا دور کیوں نہ ہو۔ایسے ہی نامساعد حالات شاعروں کو قلم بلند کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔عرشؔ نے اپنی نظم ''قطعہ'' میں وطن پرستی کا حقیقی جذبہ رکھنے والوں کی نشانی دلیل کے ساتھ پیش کی ہے۔نظم کا آخری شعر یوں ہے:

جنہیں اپنے وطن کی آبرو کا پاس ہوتا ہے
ہتھیلی پہ لئے پھرتے ہیں اپنی جان بھی دل بھی (۲۳)

عرشؔ بہت سی نظمیں ایسی کہی ہیں جو موضوع اور فکر دونوں اعتبار سے روایتی نظموں سے بہت حد تک مختلف ہیں۔ان نظموں میں ''نہیں ایسا نہیں ہوگا'' ایک ایسی نظم ہے جوان کے شعری مجموعہ ''ریزہ ریزہ وجود''

میں شامل ہے۔ یہ نظم اُنیس اشعار پر مشتمل ایک جامع نظم ہے جس میں عرشؔ اپنے ہم وطن لوگوں کو ایک ہی دھرم اپنانے کی تلقین کرتے ہیں جسے وہ انسانیت کا نام دیتے ہیں۔ ان کی نظم ''نہیں ایسا نہیں ہوگا'' کے متعلق جناب خورشیدؔ کاظمی کی یہ رائے خصوصی اہمیت کی حامل ہے:

عرشؔ پیار او محبت کے نقیب ہیں۔ جہاں کہیں وہ اس کے برعکس دیکھتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں تو ان کے اندر کا انسان اور شاعر تڑپ اٹھتا ہے اور اپنے احساسات کو الفاظ کی شکل دے کر اپنی ناپسندیدگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ نظم 'نہیں ایس نہیں ہوگا' میں عرشؔ اہل وطن ہی کو نہیں بلکہ ایک عالم کو قومی یکجہتی کا پیغام دیتے ہیں۔ وہ مذہب کی بنا پر آئے دن ہو رہے اختلافات اور ان سے پیدا شدہ حالات کو شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہر کسی کو مذہبی تعصب سے دور رہنے کا سبق بھی دیتے ہیں۔ (۲۴)

عرشؔ صہبائی نے یہ نظم ۱۳ جنوری 1989ء میں وقوع پزیر ہونے والے ایک تاریخی واقعہ سے متاثر ہو کر تخلیق کی ہے۔ اس واقعہ کو تاریخ جموں و کشمیر میں ''جموں اینٹی سکھ فسادات 1989ء'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں لیکن عرشؔ کی نظم کے مطالعہ سے اس وقت کا حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ نظم صرف اسی ایک واقعہ تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ اس ماحول میں زندہ رہنے والے تمام لوگوں کے دل میں ابھرنے والے جذبات و کیفیات کا مکمل اثاثہ پیش کرتی ہے۔ اس نظم کے مطالعہ پر عرشؔ کو بھی اگر جوشؔ کی طرح شاعر انقلاب کا خطاب دوں تو بے جا نہ ہوگا۔ عرشؔ اپنے وطن کی عوام کے لئے نیک جذبات رکھتے تھے اور وہ اپنے ملک کی عوام کو بیدار دیکھنے کے آرزومند تھے۔ انہوں نے اپنے ملک کے لوگوں کو عبرت دلانے کے لئے لاکھوں جتن کئے۔ کبھی وہ بڑی عاجزانہ گذارش سے کام لیتے تھے لیکن کبھی کبھی ان کی طنز بہت تیز ہو جایا کرتی تھی۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

بزرگو، نوجوانو، ہم جلیسو اور ہم وطن والو
جنوں کے دائروں کو توڑ کر باہر نکل آؤ
تمہیں گھیرے ہوئے ہے آہنی دیوار ظلمت کی
دلوں میں نفرت و کینہ، نگاہوں میں حقارت سی
تعصب رچ چکا ہے بے طرح نس نس میں یہ سچ ہے
نہ جانے اس فضا میں کس طرح تم سانس لیتے ہو
مجھے حیرت ہے اس ماحول میں تم کیسے زندہ ہو
نہیں معلوم تم کو زندگی ہے تیز رو کتنی!

زمانہ کونسی منزل پہ ہے تم راہ میں گُم ہو
نہ جانے کس لئے تم بٹ گئے ہو چند فرقوں میں
نہ جانے کس طرح تم کو سکوں ملتا ہے وحشت میں
بہاتے ہو لہو تم دوسروں کا یہ بھی سوچا ہے
تمھارے جسم کے حصے ہیں جن کو کاٹتے ہو تم
تمھارا ہی لہو ہے یہ جس کو چاٹتے ہو تم (۲۵)

عرشؔ کی یہ نظم حقیقت نگاری کا سر چشمہ ہے۔ ان کی یہ نظم ہمیں حقارت ،تعصب ،نفرت اور ظلمت کی دیواروں سے باہر نکل کر دنیا کو دیکھنے کی تحریک بخشتی ہے کیوں جس حقارت ،نفرت اور کدورت کے سبب ہم ردعمل پیش کرتے ہیں اس ناجائز فائدہ ہمارے سیاست دان اٹھاتے ہیں اور ہمیں آپس میں ہندو مسلمان کے نام پر بانٹ کر فسادات کرواتے ہیں۔ عرشؔ نے ہمارے سماج میں پھیلی اسی برائی کو محسوس کیا اور اپنے وطن کے لوگوں کی آنکھ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم میں ''وطن'' سے مراد ہمارا وطن عزیز ہندوستان نہیں ہے بلکہ ریاست جموں وکشمیر ہے جو تقریباً پچھلے پچاس سالوں سے نامساعد حالات سے دوچار ہے، جہاں ہر سمت ظلمت کے پہرے ہیں اور انسان خود اپنے آپ سے دور بہت دور نظر آتا ہے۔ انہیں حالات میں سے ایک واقعہ سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی گئی ہے جس میں عرشؔ اپنے ہم وطنوں کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ دنیا ترقی کی منزلوں کی جانب گامزن ہے اور تم خود کو فرقوں میں بانٹ کر اپنے ہی بھائیوں کا خون بہانے کے قائل ہو جبکہ جن کا تم خون بہاتے ہو وہ تم سے الگ نہیں بلکہ تمارے ہی بھائی ہیں۔ عرشؔ اپنی شعلہ بیانی کے جوہر دیکھا رہے ہیں مگر پھر بھی عوام کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ وہ سوئی ہوئی غفلت اور ظلمت کی شکار عوام سے پھر یوں خطاب کرتے ہیں:

اٹھو ان پستیوں سے اور اس مذہب کو اپناؤ
جسے انسانیت کہتے ہیں جو سب سے مقدس ہے
سبھی کا ایک خالق ہے سبھی کا ایک مالک ہے
نہ جانے کس لئے تکرار ہے بے معنی باتوں پر
شعور و آگہی سے کام لو اس زندگی میں تم
بنا لو دین و ایماں زندگی میں حق پرستی کو
نہیں بڑھ کر عبادت اور کوئی حق پرستی سے

یہی ہے حاصل دنیا یہی معراج انسان کی
سکوں بھی ہے اسی میں اور تسکینِ دل وجان بھی
یہی اک راستہ ہے جانب منزل جو جاتا ہے
یہی انسان کو انسان کے نزدیک لاتا ہے(۲۶)

عرشؔ کی نظموں کی یہی خوبی انہیں ان کے معاصرین سے جدا کرتی ہے کہ ان کی نظمیں نہایت سادہ اور عام فہم زبان کے ساتھ غضب کی روانی رکھتی ہیں۔انہیں اپنی بات کو بہترین ڈھنگ سے قاری کے سامنے رکھنے کا سلیقہ حاصل ہے۔ان کا تمام کلام شعریت سے لبریز ہے۔ان کی خود اعتمادی ،قوت عمل اور جوش ویقین ان کی نظموں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔یہ ان نوجوانوں کو عمل کی تلقین کرتا ہے جو خواب غفلت کی نیند سوئے ہوتے ہیں۔عرشؔ مزید اس نظم میں تلقین کرتے ہیں:

چلو یہ عہد کرلیں حق کے رستے پر چلیں گے ہم
ہوا ہے آج تک جو اس کو یکسر بھول جائیں گے
نئی نسلوں کی خاطر ہم یہ ورثہ چھوڑ جائیں گے
ہمارے دامنوں پر جو پڑے ہیں خون کے دھبے
ہم اپنی زندگی میں ایسے دھبے صاف کر ڈالیں
کہیں ایسا نہ ہو جو آنے والی ہیں نئی نسلیں
ہمارے کاناموں سے وہ شرمندہ ہوں دنیا میں
کہیں ایسا نہ سوچیں یہ بھی پتھر کا زمانہ تھا
نہیں ایسا نہیں ہوگا کسی صورت نہیں ہوگا(۲۷)

جب ہم عرشؔ صہبائی کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو قدرتی طور پر ان کے کلام میں وہاں کے حالات کا عکس نظر آتا ہے۔عرشؔ عالمی سطح کے حالات کا بھی تجزیہ کرتے ہیں لیکن وہ جس ماحول میں رہتے ہیں اسے کسی صورت میں نظرانداز نہیں کرتے ، کیونکہ وہ ماحول ان کی زندگی میں جذب ہے اسے کسی صورت بھی وہ فراموش نہیں کرسکتے۔اس وقت جن حالات سے ہم دوچار ہیں اس میں امن وآماں دور دور تک کہیں دیکھائی نہیں دیتا۔یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی قیمت پر بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔جہاں امن واماں نہیں ہوگا وہاں قدرتی طور پر انسان کی زندگی گرد راہ کی صورت ہوگی۔اس بات کی وضاحت کی قطاً ضرورت نہیں کہ امن

پرستی اور وطن پرستی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔جو کوئی بھی وطن پرست ہوگا وہ وطن میں امن واماں کے خواب دیکھے گا۔اور امن واماں کے ماحول میں زندگی بسر کرنا چاہے گا۔ایسا انسان انسانیت پرست بھی ہوگا یعنی امن و اماں ،وطن پرستی اور انسان دوستی کے جذبے کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر تینوں کی کوئی اہمیت نہیں۔آج سے کئی برس پہلے وادی میں ہی کیا پوری ریاست میں یہ صورت حال نہیں تھی۔اس سے ظاہر ہے کہ اس دور میں جس شاعر نے بھی وطن پرستی کے گن گائے ہوں گے یا ان کی قدروں کو سراہا ہوگا اس کا طرز بیان اور ہوگا کیونکہ اس وقت شاعر ذہنی خلل کا شکار نہیں تھا۔اس کی زندگی کسی حد تک پرسکون تھی،اس کی ہر بات میں ٹھہراو تھا،اس میں سنجیدگی تھی اس کا کلام زندگی کی اعلیٰ قدروں کا عکاس تھا۔

اس میں دورائے نہیں کہ وطن پرستی کے جذبہ کے ساتھ ساتھ امن وا یکتا بھی اہم ہے۔بالخصوص اس دور میں جبکہ سیاسی دبوں کی وجہ سے ہر جگہ عوام بٹے ہوئے ہیں۔جس سے ہر دل میں ایک دوسرے کے لیے نفرت اور کدورت کا جذبہ موجزن ہے۔اس جذبہ نے نفرت اور کدورت کو عروج پر پہنچا دیا ہے۔جس کے ردِعمل کے طور پر وطن کا پورا ڈانچہ بکھر کر رہ گیا ہے۔اس صورت کے پیش نظر بھی اس وقت ایکتا کی بے حد ضرورت ہے وہ کشمیر ہو یا کوئی اور جگہ،اسے صرف عرشؔ صہبائی نے ہی نہیں بلکہ ملک کے ہر باشندے نے محسوس کیا ہے۔جب ایکتا ہوگی تو وطن پرستی کے جذبہ کو فروغ ملے گا۔ہر دل میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ یہ وطن ہمارا ہے ہم نے اس میں رنگِ بہار بھرنا ہے۔اس گلستاں کو ایکتا کے پھولوں سے سجانا ہے۔ہر شاعر وادیب اپنے دور میں اپنے عوام کا رہنما رہوتا ہے۔اس صورت میں عرشؔ صہبائی کی نظم ''ایکتا'' کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جسے کہہ کر انہوں نے بطور شاعر ایک رہنما کا فرض ادا کیا ہے۔نظم میں وہ کہتے ہیں:

زندگی کی راحتوں کا کارواں ہے ایکتا
ہر تمنا رقص کرتی ہے جہاں ہے ایکتا
کون کہتا ہے حیاتِ جاوداں ہوتی ہے
میں بتاتا ہوں حیات جاوداں ہے ایکتا(۲۸)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے حیات فانی کو حیات جاوداں ثابت کر دکھایا ہے۔اس نظم میں عرشؔ کا انداز بیان بہت دلکش ہے اور نظم مضمون ہو کر بھی یہ نظم روایتی نہیں ہے۔اس کا ہر ایک شعر قومی اتحاد کو پکارتا ہی نہیں بلکہ اتحاد قائم کرتا ہے۔اس نظم کے کس کس شعر کی داد دی جائے ان دوار روایتی شعار

کے ساتھ نظم ختم ہوتی ہے۔ بہر حال یہ اشعار دیکھیں:

جس کے پھولوں کی مہک سے دل کو ملتا ہے سکوں
زندگی کا ایک ایسا گلستاں ہے ایکتا
اس سے قائم ہے جہاں میں زندہ قوموں کا وقار
زندہ قوموں کی سنہری داستاں ہے ایکتا
جس سے مٹ جاتی ہے یکسر نفرتوں کی ظلمتیں
دور تک پھیلی ہوئی وہ کہکشاں ہے ایکتا
عرشؔ حاصل ہیں انہیں زندگی کی راحتیں
لوگ وہ خوشحال رہتے ہیں جہاں ہے ایکتا(۲۹)

ایکتا کی اس سے بہتر اور کیا تفسیر ہوسکتی ہے۔ ہر شعر میں ایک سے ایک نیا مفہوم بھی ہے اور انداز بیاں بھی۔ مضمون کی طوالت کو دھیان میں رکھتے ہوئے نظم کے باقی اشعار کو جہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ عرشؔ صہبائی کے ماضی میں لکھے گئے کلام سے اب ہم حال کی جانب رُخ کرتے ہیں لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ عرشؔ صہبائی نے ریاست میں امن واماں کی صورت بگڑنے سے پہلے صرف دو نظمیں کہی ہیں۔ ان کا بے شمار ایسا کلام ہے جو امن واماں، وطن پرستی اور انسانیت سے جڑا ہوا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کلام کا رنگ موجودہ دور کے کلام سے قدرے مختلف ہے۔

عرشؔ کی غزلیں جہاں ہر طرح کے مختلف موضوعات کا سمیٹے ہوئے ہیں وہیں نظموں میں بھی انہوں نے کئی نئے موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ البتہ انہوں نے ایسے موضوعات کو بھی برتا ہے جن پر پہلے بھی کئی شعراء نے قلم اٹھایا ہے لیکن عرشؔ نے انہیں ایسے برتا ہے کہ وہ بھی نئے معلوم پڑتے ہیں۔ جس طرح عرشؔ کی نظم ''ایکتا'' حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہے اسی طرح ''نڈر اور بہادر ہندوستانی سپاہیوں کے نام'' بھی اسی جذبہ میں ڈوبی ہوئی ہے۔۔ عرشؔ کی غزلیہ شاعری پر بے شمار آرائیں مل جاتی ہیں کیوں کہ ان کا غزلیہ کلام بہت زیادہ ہے ان کے نظمیہ کلام کے متعلق جنات خورشیدؔ کاظمی لکھتے ہیں کہ ''ان کی نظمیہ شاعری میں صرف درد وکرب ہی جلوہ افروز نہیں بلکہ ان میں اپنے وطن اور وطن کی خاطر جان وتن قربان کرنے والے سورماؤں اور بہادروں کا بھی تذکرہ موجود ہے اور آج بھی نوجوانوں کو اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ وطن سے پیار اور اس کی حفاظت ان کا فرض ہے اور اس کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے''(۳۰)

اس میں کوئی شک نہیں کہ حب الوطنی بھی عرشؔ کی نظموں کا ایک اہم جز ہے۔ ان کے ہاں ’’سرزمین وطن‘‘، ’’اے میرے وطن! میرے حسین خوابوں کی تعبیر‘‘، ’’جھنڈ‘‘ اور ’’قطعہ‘‘ ایسی نظمیں ہیں جو روایتی انداز بیان اور روایتی طرز اظہار کی حامل ہیں لیکن نظم ’’نڈر اور بہادر ہندوستانی سپاہیوں کے نام‘‘ عرشؔ کی ایک منفرد نوعیت کی نظم ہے جو اہل وطن کے اندر وطن پر جان فدا کرنے کے جذبے کو ابھارتی ہے اور بلا تحقیق مذہب و ملت شہدان وطن کو خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔ یہاں نظم ’’نڈر اور بہادر ہندوستانی سپاہیوں کے نام‘‘ کے صرف بند ملاحظہ فرمائیں جس سے آپ شاعر کی خوبی بیان کا اندازہ لگا سکتے ہیں البتہ یہ پوری نظم وطن پرستی کے جذبے کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے:

وطن کے جاں نثارو ! شمع آزادی کے پر وانو
وطن کے سر فروشو ! حق پر ستو اور فرزانو
وطن نازاں ہے تم پر آج اے بھارت کے دیوانو
سلیقہ زندگی کا قوم کو زندگی کا سمجھا دیا تم نے
رگِ ہر مرد و زن میں خون نو دوڑا دیا تم نے

وطن والے قیامت تک تمہارے گیت گائیں گے
تمہارا نام لے کر بے خودی میں جھوم جائیں گے
تمہارے حوصلے ہر اک بشر سے داد پائیں گے
مورخ جب کبھی تاریخ کا خاکہ بنائے گا
بڑے رنگین لفظوں میں تمہار نام آئے گا(۳۱)

یہاں وطن پرستی کی جو تشریح کی گئی ہے اس کی جس قدر داد دی جائے کم ہے اور یہ حقیقت ہے کہ وطن پر مٹنے والے دنیا کی انجمن کے لئے ایک چراغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ جذبہ کسی صورت میں بھی محدود نہیں ہوتا کیوں کہ انھوں نے دنیا کی انجمن کے لئے چراغ کہہ کر اس جذبہ کو عالمی سطح پر حاوی کر دیا ہے۔ ان کی اس نظم سے وطن پرستی کے جذبہ کو عظمت ملتی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ عرشؔ صہبائی چاہے کسی بات کو شاعری میں بیان کریں یا نثر میں اس کی بنیاد حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہے۔ عرشؔ صہبائی کے کلام کی مقبولیت کی وجہ بھی یہی ہے ان کے کلام میں حقائق زیادہ ہوتے ہیں اور تخیل کم بلکہ بہت کم اور پھر ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے خیالات میں نیا پن ہوتا ہے جو زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔

عرشؔ کا شعری زمانہ طویل عرصے پر محیط ہے اس لئے انہیں اپنی تخلیقات کے پیش نظر کئی سماجی و سیاسی تبدیلیوں سے گزرنا پڑا۔ ان کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے جس ان کی شاعرانہ شخصیت کو متاثر کرتی رہی۔ انہوں نے زندگی اور اس کی ناہمواریوں اور تضادوں کا گہرے طور پر سامنا کیا اور خالص شخصی طور پر خارجی حالات کا اثر قبول کیا ہے۔ ان کا شعری شعور ان کی زندگی کے بدلتے حالات سے گہرے طور پر متاثر ہے۔ عرشؔ کے ہاں دل کو چھو جانے والی ایسی نظمیں موجود ہیں کہ ہر پڑھنے والے کو یہ نظمیں کم اپنے دل کے جذبات معلوم زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسی ہی ایک نظم بہ عنوان ''احساس'' ہے۔ جب ہم ''احساس''، نظم پر نظر ڈالتے ہیں تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شاعر دل شکن ہو کر بھی باحوصلہ ہے، ایسے عالم میں بھی وہ دوسروں کا ذہنی توازن قائم ہی نہیں رکھتا بلکہ اسے صحت مند نظریہ عطا کرتا ہے۔ دیکھئے عرشؔ صہبائی نے کس انداز سے یہ فرض ادا کیا ہے:

احساس

تو نے پوچھا ہے مرے خاموش رہنے کا سبب
تو ابھی شاید مرے حالات سے واقف نہیں
مجھ کو جس ماحول سے ہے واسطہ شام وسحر
تو ابھی اس کی کسی بھی بات سے واقف نہیں
بے بسی، افسردگی، بے چارگی، اُفتادگی
ظلمتوں کے درمیاں رہ کر بھی تابندہ ہوں میں
ہیں مرے پیش نظر نظارہ ہائے دل شکن
میری ہمت ہے کہ ان حالات میں زندہ ہوں میں
تو میری مجبوریاں ہرگز سمجھ سکتی نہیں
ناروا کو بھی روا کہنا پڑے تو کیا کروں
کاش سمجھا دے مجھے کوئی فقط اتنی سی بات
آدمی کو جب خدا کہنا پڑے تو کیا کروں
بس غم و افکار ہی میں غرق رہنا صبح و شام
یہ اگر ہے زندگی تو زندگی اک جرم ہے
سوچتا ہوں کیوں نہ کرلوں ارتکاب خودکشی
پھر خیال آتا ہے دل میں خودکشی اک جرم ہے

اب اسی احساس سے قائم ہے میرا حوصلہ
مضمحل رہنا غم دل کا مداوا تو نہیں
درد میں آرام کی صورت بھی پنہاں ہے ضرور
زیست کا حاصل فقط خون تمنا تو نہیں (۳۲)

میں عرشؔ صہبائی کا ذاتی طور پر شناسا ساں ہوں اور مجھے اس بات پر بے حد فخر بھی ہے لیکن اس نظم کی اگر بات کی جائے تو یہ دنیا کی اس حقیقت کو واضع کرتی ہے جس کا احساس صرف حق پرست لوگ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔عرشؔ نے ایک خوشگوار ادبی وسماجی ماحول میں جنم لیا تھا لیکن وہ ماحول انہیں زیادہ دیر تک نصیب نہیں رہا اور اس کا اظہار انہوں نے بارہا کیا ہے۔اس کے نظم کے شروع سے ہی آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عرشؔ حالات کے کس قدر ستائے ہوئے ہیں۔عرشؔ نظم کی تخلیق کے وقت جس بے بسی، بے چارگی، افسردگی، افتادگی اور ظلمت سے گزر رہے تھے اس کا تذکرہ نظم میں دیکھنے کو ملتا ہے۔سارے انسانی نظام پر نظم کا یہ ایک مصرعہ بھی گہری ضرب لگا رہا ہے:

''آدمی کو جب خدا کہنا پڑے تو کیا کروں''(۳۳)

عرشؔ حوصلہ منداور بہادر انسان تھے لیکن پھر بھی وہ حالات سے کتنے متاثر تھے اس شعر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

سوچتا ہوں کیوں نہ کرلوں ارتکاب خود کشی
پھر خیال آتا ہے دل میں خودکشی اک جرم ہے(۳۴)

عرشؔ کی شعری دنیا محض خیالی دنیا نہیں ہے۔وہ خوابوں کی پرچھائیوں میں حقیقت کا نور دیکھ لیتے ہیں۔انہوں نے ابتدا میں کہیں کہیں اردو کے رومانی شعراء کا اثر قبول کیا ہے۔یہی سبب ہے جس کی بدولت ان کی شاعری میں رومانیت کا جذبہ بھی موجود ہے۔عرشؔ کا مزاج رومانی ضرور تھا لیکن انہوں نے صرف رومانیت نہیں بلکہ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ان کے یہاں وفور جذبات، حسن فطرت، حسن پرستی اور خواب آفرینی کا عمل ملتا ہے۔اپنے ابتدائی دور میں وہ رومانی رجحان سے وابستہ ہو کر اپنے جذبات واحساسات کو اہمیت دیتے رہے لیکن جب خارجی حقایق پر ان کی نظر پڑی تو ان کی شاعری نے حقیقت نگاری کا نیا موڑ اختیار کیا۔عرشؔ نے صرف ہندوستان اور پاکستان کے نغمے نہیں الاپے

ہیں۔ان کی شاعری میں ایک تہذیب ہے اور وہ آفاقی اور انسانی تہذیب ہے۔وہ بس دکھے دلوں کی عکاسی کرتے ہیں ۔اگرانھوں نے اپنی شاعری کو نری جذباتیت اور نام نہاد ترقی پسندی کے مفروضات سے بچایا نہ ہوتا تو ان کی شاعری بھی کہیں گم نامی کا شکار ہو چکی ہوتی۔

عرشؔ صہبائی کی کسی بھی نظم کو ہم نظرانداز نہیں کر سکتے لیکن اگر ہم نے عرشؔ صہبائی کی بعض نظموں کے جائزے سے گریز کیا ہے تو اس کی بڑی وجہ مضمون کی طوالت ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ ان کی خوبیوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔اسی خیال کے پیش نظر ان کا سرسری طور پر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ان میں ’’کھو کھلے جسم بے تاب روحیں‘‘ کے علاوہ اور بہت سی نظمیں شامل ہیں ۔اس نظم میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو کینسر کے مریض ہیں اور موت کے منتظر ہیں ۔زندگی کے یہ لمحات تلخ ہیں لیکن یہ مریض ناامیدی کے عالم میں بھی جی رہے ہیں۔نظم کے چند مصرعے پیش نظر ہیں:

موت کی راہ کے راہی ہیں یہ کینسر کے مریض
اپنے تابوت لئے کب سے ہیں بستر پہ دراز
ان کے دل میں کسی فردا کا تصور ہی نہیں
ان کے چہرے سے عیاں صبح خزاں کی زردی
ان کی آنکھوں سے نمایاں ہے اُداسی کا سماں
ان کے جذبات ہیں یا برف ہے کہساروں پہ
لاکھ سورج کی تپش ہو جو پگھلتی ہی نہیں (۳۵)

عرشؔ نے نظم ’’کھوکھلے جسم بے تاب روحیں‘‘ میں کینسر کی بیماری میں مبتلا ان لاچار اور بے بس لوگوں کی داستان بیان کی ہے جو آج زندگی سے ناامید ہیں لیکن ان کی بھی ایک ماضی تھا۔ان کے دل میں بھی کئی ارمان تھے جنہیں وہ ساکار نہیں کر پائے۔آج جن کی زندگی خزاں کے مانند ہے اس میں کبھی بہار بھی تھی ۔یہ حقیقت ہے کہ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔نظم میں اس کے خوب اشارے ملتے ہیں:

دیکھتے دیکھتے مسمار ہوئے رنگ محل
وقت بھی کتنا ستمگر ہے گزر جاتا ہے
قافلہ وقت کا رکتا نہیں روکے سے کبھی
سلسلہ روزِ ازل سے یہ چلا آتا ہے

اب یہ ماحول ہے جس میں نہیں حرکت کوئی
ہر طرف عالم وحشت ہے جدھر بھی دیکھو
منتظر موت کا ہر کوئی نظر آتا ہے(۳۶)

عرشؔ کی اس نظم کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک بات واضع ہو جاتی ہے کہ عرشؔ حق گو انسان تھے۔ان کی حق گوئی کا ثبوت ان کی یہ نظم فراہم کرتی ہے۔آج کے اس مادہ پرستی کے دور میں انسان کو صرف اپنی فکر لاحق ہوتی ہے اسے دوسروں سے کبھی کوئی سروکار نہیں ہوتا لیکن عرشؔ انہیں انسانوں کی بھیڑ میں ایک حساس دل انسان تھے جنہوں نے موت سے لڑنے والے بہادر کینسر کے مریضوں کی کہانی کو اپنی نظم میں بیاں کیا ہے۔یہ نظم آج کے ماحول میں ایک تحریک کی حیثیت رکھتی ہے۔اس نوعیت کی نظمیں شاید ہی اردو کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں دستیاب ہوں۔نظم کا اختتام عرشؔ نہایت عالمانہ انداز میں یوں کرتے ہیں:

کھوکھلے جسم ہیں جو کرب میں ہیں ڈوبے ہوئے
اور بے تاب ہیں روحیں کہ ملے ان کو نجات
کاٹے کٹتے ہی نہیں قید کے لمحات حزیں
تلخ ہے زہر مگر پھر بھی پیۓ جاتے ہیں
نا اُمیدی میں بھی یہ لوگ جیۓ جاتے ہیں(۳۷)

عرشؔ صہبائی کی اکثر نظمیں انسانوں کو ایک نیا حوصلہ اور عزم عطا کرتی ہیں۔امید انسان کی شخصیت میں ایک ایسا جوہر ہوتا ہے جس سے انسان زندگی میں اعلیٰ کارنامے انجام دیتا ہے،ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بسا اوقات بہت سی مصیبتیں راہ میں حائل ہو جاتی ہیں ایسے میں امید ہی ایک ایسی روشنی بن کر نمودار ہوتی ہے کہ جس سے انسان ناموافق حالات کو موافق بناتا ہے۔اگر یہ امید اور حوصلہ نہ ہو تو زندگی جمود کا شکار ہو جائے۔نظم ''مشورہ'' بھی عرشؔ کی اسی نوعیت کی نظم ہے جس میں ایک بے بس انسان کو حوصلہ سے کام لینے کا مشورہ دیا گیا ہے۔نظم اس قدر رواں ہے کہ قاری کو اس کے اصل مفہوم تک پہنچنے میں کسی تشریح کی ضروری ہی محسوس نہیں ہوتی:

یہ آنسو جو تری نازک سی پلکوں پر لرزتے ہیں
زمانے میں کوئی کیا خاک سمجھے گا زباں ان کی
شعور اتنا کسے حاصل ہے جو مفہوم غم سمجھے

نظرانداز ہی ہوتی رہے گی داستاں ان کی
یہ خاموشی کے پہرے اور پھر رسم زباں بندی
بہت مشکل ہے جینا اس طرح بے رحم دنیا میں
سراسر غیر ممکن ہے کہ منزل تک رسائی ہو
ہزاروں خار ہائے غم ہوں جب راہ تمنا میں
اسے میں مصلحت سمجھوں کہ تیرے دل کی مجبوری
ستم ہائے مسلسل پر یہ تیری خامشی کب تک
کبھی تو نے یہ پوچھا بھی ہے چشم یاس وحسرت سے
چھپانے سے چھپائی جا سکے گی بے بسی کب تک (۳۸)

عرش زمانے کی روِیش کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ زمانہ اس بات کا اہل نہیں کہ کسی آنکھ سے بہتے ہوئے درد کی زباں کو سمجھے اور کچھ مداوا کرے بلکہ آنسوؤں کی داستاں کو نہ سمجھ نظرانداز کرتے ہیں کیوں کہ وہ انہیں سمجھنے کا شعور ہی نہیں رکھتے ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اس ظالم ماحول میں زندگی گزارنا دشوار ہے جہاں ہر طرف خاموشی کے پہرے ہیں کسی کو کچھ بھی کلام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ بہرکیف نظم روانی، سادگی، حقیقت اور جوش وغیرہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے نظم میں فصیح الفاظ موقعے کی نزاکت کے مطابق جڑے ہوئے ہیں جو قابل داد ہیں۔ نظم کے شروع میں جہاں شاعر انسان کی مجبوری لاچاری اور غفلت کو بیان کرتا ہے وہیں آخر میں ان کے جذبوں کو نئی اڑان بھی فراہم کرتا ہے:

کہاں تک اس طرح بوجھل رہیں گی یہ حسیں پلکیں!
تکلف چھوڑ، نظم زندگی زیروزبر کر دے
جن اشکوں نے کبھی نخل ستم کی آبیاری کی
خدا کے واسطے اب ان میں تو برق وشرر بھر دے (۳۹)

ہر دور میں شاعری انسان کے تمدنی، تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی معاملات میں تاثیر رساں اور بکار آمد ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی کی سمت سازی اور ذہن انسانی پر اخلاقی عوامل کی چھاپ جتنی آسانی سے شاعری کے زریعہ پڑتی ہے اُتنا شاید ہی کوئی دوسرا طریقہ عمل اس قدر سریع الاثر ہوسکتا ہو۔ شاعری کبھی کھل کر اور کبھی خاموشی سے انسانی کردار پر اثرانداز ہوتی ہے۔ عرش صہبائی پندوموعظمت کی اہمیت وافادیت کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کی نظموں

کے محرکات میں سماجی اور تہذیبی عوامل کا ہاتھ رہا ہے۔آپسی محبت کی ترغیب، ہمت اور محنت سے کام کرنے کا جذبہ، صبر واستقلال، عفوودرگزر، پندونصیحت اور قدرت کی نعمتوں کا ذکر عرشؔ کی نظموں کے اجزا ہیں اور ان سب کا کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ طور پر تہذیبی وتمدنی رویوں کے فروغ اور ارتقاء میں رول ہوتا ہے۔

عرشؔ کی بعض ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جس میں ہمیں ان کی اپنی ذات کا عکس دیکھائی دیتا ہے۔وہ بظاہر کو تو نظم کہتے ہیں لیکن نظم سے زیادہ ان کی آپ بیتی معلوم پڑتی ہے۔ان کی ایسی ہی ایک خوبصورت اور اہم نظم ''انجام'' ہے جو ان کے شعری مجموعہ یہ جھونپڑے میں شامل ہے۔جس میں ایک ایسے شخص کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے جس اپنے مستقبل کا خواب تو کچھ اور تصور کیا ہوتا ہے لیکن اسے اس کے خواب اور امیدوٗں کے مطابق کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔نظم کے کچھ بند بطور خاص:

میں بھی جینا چاہا تھا
میں نے بھی کچھ خواب بنے تھے
میں نے بھی اپنے دامن میں
امیدوں کے کچھ پھول چنے تھے
میں نے بھی دل میں چاہا تھا
میری بھی اپنی دینا ہو
مجھ کو بھی کوئی اپنائے
میرا بھی کوئی اپنا ہو(۴۰)

عرشؔ کی یہ نظم ان کی اپنی زندگی کی کہانی ہے کیوں کہ وہ خود اپنے زندگی میں ایسے حالات سے گزرے ہیں جہاں ان کی امیدیں جس چیز سے وابستہ تھیں وہ اپنی حیات میں عمر بھر ان سے محروم ہی رہے۔میں نے بارہا ان کی زبان سے یہ بات از خود سماعت فرمائی ہے کہ انہیں تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا لیکن زندگی کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ وہ چاہ کر وہ بھی وہ نہ کر پائے جو چاہتے تھے۔اسی طرح ریاست جموں وکشمیر میں جتنا کام اردو زبان وادب کی آبیاری کے لئے انہوں نے کیا ہے اتنا شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے کیا ہوگا لیکن باوجود اس کے وہ عالمی سطح پر اپنے کام کی بدولت ایک مقام رکھتے ہیں لیکن ریاستی سطح پر انہیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے۔اس نظم کے ایک ایسے پُر امید انسان کے جذبات کی عکاسی ملتی ہے جو دنیا کو تو راس آیا لیکن دنیا اسے راس نہیں آئی۔بقول عرشؔ:

غم نے کیا کیا رنگ دکھائے

راحت دل کے پاس نہ آئی

میں دنیا کو راس نہ آیا

دنیا مجھ کو راس نہ آئی (۴۱)

عرشؔ کی اچھی اور انفرادی نوعیت کی نظموں میں ان کی ایک نظم اہم نظم ''میں بنگلہ دیش ہوں ٹیگور کے نغموں کی دھرتی'' بھی شامل ہے۔ یہ ایک انقلابی نظم ہے جسے موصوف نے سن 1971ء بنگلہ دیش لبریشن جنگ سے متاثر ہو کر تحریر کیا ہے۔ عرشؔ کی یہ نظم بنگلہ دیش قوم پرست بنگالی شہریوں، طلبا، دانشوروں، مذہبی اقلیتوں اور مسلح اہلکاروں پر ہوئے ظلم و ستم کا ردعمل ہے۔ بنگلہ دیش پر پاکستان نے جو قہر ڈھایا تھا وہ سب پر ظاہر ہے اس نظم کا ہر بند دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ بقول غلام جیلانی:

نظم ''میں بنگلہ دیش ہوں ٹیگور کے نغموں کی دھرتی ہوں'' میں انھوں نے بنگلہ دیش پر ہوئے ظلم و ستم کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ مصور رنگوں سے ایسی تصویر بنانے سے قاصر نظر آتا ہے۔ پورا ماحول اور فضا آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے نظم وحدت تاثر کا عصر نمایاں ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور کچھ دیر کے لئے انسان ایک ایسی فضا میں چلا جاتا ہے کہ انسانی ذہین کو فکر لاحق ہو جاتی ہے اور دیر تک اس کے ذہن میں نقش پا چھوڑ جاتی ہے۔ (۴۲)

اس نظم میں تصویر کشی اور تسلسل کی خوبصورت مثالیں مل جاتی ہیں۔ کچھ بند درج ذیل ہیں:

ستم راتوں کے ہر سو خون کی ندیاں بہائی ہیں

جہاں تھے کھیت دھانوں کے وہاں قبریں بنائی ہیں

کیوں یہ راز کس سے مجھ پہ وہ گھڑیاں بھی آئی ہیں

جہاں احساس کے عالم کی سانسیں لڑکھڑائی ہیں

تمنا تھی بھری دنیا کہے گی اک دلہن مجھ کو

مگر افسوس پہنایا گیا خونی کفن مجھ کو

میں بنگلہ دیش میں ٹیگور کے نغموں کے دھرتی ہوں

رگ احساس پر نشتر کہیں آرے چلا ڈالے

جہاں انسان بستے تھے وہ ویرانے بنا ڈالے

تشدد وہ کیا معصوم بچے تک جلا ڈالے

یہ کب چاہا تھا میں نے کوئی مجھ کو یوں مٹا ڈالے
جفا و جور کی آندھیاں آئیں کہ بس توبہ
فضائے زندگی پر اس طرح چھائیں کہ بس توبہ
میں بنگلہ دیش ہوں ٹیگور کے نغموں کی دھرتی ہوں
مرے دانشوروں کو موت کے منہ میں دھکیلا ہے
نہ پوچھو ظالموں نے کس بلا کا کھیل کھیلا ہے
جو دھرتی زرفشاں تھی آج وہ مٹی کا ڈھیلا ہے
یہ قدرت کا نہیں انسان کی وحشت کا ریلا ہے
تھے جتنے عالم و فاضل انہیں چن کر مٹا ڈالا
چراغ آدمیت آدمی نے یوں بجھا ڈالا
میں بنگلہ دیش ہوں ٹیگور کے نغموں کی دھرتی ہوں
مرا عزم مصمم ہے مجھے آزاد ہونا ہے
اگر میں آج ہوں ناشاد تو کل شاد ہونا ہے
مجھے آباد ہونے کی طرح آباد ہونا ہے
مجھے آزاد ہونا ہے مجھے آزاد ہونا ہے
مجھے جمہوریت کی صبح نو سے بات کرنی ہے
سحر کی آرزو میں اب بس ہر رات کرنی ہے
میں بنگلہ دیش ہوں ٹیگور کے نغموں کی دھرتی ہوں (۴۳)

یہ نظم پڑھ کر قاری کے ذہن و دل کانپ جاتے ہیں آپ اندازہ کیجئے کہ ان پر کیا گزری ہوگی جو اس عالم سے گزرے ہوں گے۔ نظم کے کچھ بند نقل نہیں کئے گئے وہ بھی اسی انداز کی ہیں۔ یہاں پھر وہی مسئلہ درپیش ہے کہ کس نظم کو بہتر قرار دیا جائے کوئی نظم بھی ایسی نہیں جو کم توجہ چاہتی ہو۔ عرشؔ صہبائی کی دیگر نظمیں میں ''تجدید محبت''، ''خواب نغمہ''، یادرفتہ'' او''روراثت'' بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان نظموں کی خوبیوں کو بھی ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان نظموں میں بھی عرشؔ کی دیگر نظموں کی طرح روانی، سادگی اور غضب کی معنی آفرینی ہے جو قاری کی دلچسپی کا باعث بنتی ہے۔

عرشؔ کی نظم آزاد''وراثت''ایک جدید طرز کی بہترین اور بالکل نئی نظم ہے جو ان کی انفرادیت کی دلیل بھی

ہے۔ یہ عرشؔ صہبائی کی تمام نظموں میں سب سے طویل نظم ہے جو تقریباً 62 مصروں پر مشتمل ہے۔ جب ہم اس نظم کا مطالعہ کرتے ہیں تو حب الوطنی کا ضربہ شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے وطن کے ساتھ کتنی محبت کرتا ہے جس کے لئے وہ جان بھی نچھاور کرسکتا ہے۔ اس نظم کے پس منظر میں عرشؔ صہبائی نے جموں وکشمیر کے خوشگوار ماحول، امن وامان میں رہنے والی وادیاں اور دلکش اور دلنشیں ندیوں، نالوں، جھرنوں کے نغمے گویا اہل کشمیر کے ہر کوشے کو اپنی نظم کا حصہ بنایا ہے جو تباہی و زوال کا شکار ہو گیا ہے۔ عرشؔ نے یہ نظم کشمیر کی بدحالی کو پیش نظر رکھ کر ہی کہی ہے۔ ریاست جموں وکشمیر اپنے ماضی میں دہشت گردی کے چنگل میں آکر ایسے حالات سے گزری ہے کہ اس کی بربادی کی داستان سناتے ہوئے شاعر بہت غمگیں نظر آتا ہے۔ شاعر نے ایسے پرجوش انداز میں نظم کہی ہے کہ قاری مطالعہ کرتے کرتے اسی ماحول میں پہنچ کر از خود ان مناظر کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ عرشؔ جس ماحول میں پروان چڑھے ہیں وہ نہایت ہی خوشگوار تھا اس ماحول کی آب وہوا میں وہ بات تھی جسے عرشؔ نے اس نظم آغاز میں بیان کیا ہے۔ بہر حال نظم کا کچھ حصہ پیش خدمت ہے:

وہ منزل اور منزل کی حسیں پگڈنڈیاں جن پر
بکھرتے تھے ہزاروں قہقہے نغموں کی صورت میں
فضائیں رقص کرتی تھیں ہوائیں گنگناتی تھیں
تمنائیں دلوں میں رنگ بھرتی تھیں محبت کا
ہوا کے نرم جھونکے آرزو کو گدگداتے تھے
یقین ہوتا تھا اکثر کے ہم جنت کے باسی ہیں
حیات افروز تھا ماحول وہ یہ کل کی بات تھی
وہ کل جو اپنے دامن کو بچا کر کٹ گیا ہم سے (۴۴)

عرشؔ کی شاعری کا ایک اہم پہلو درس وتدریس ہے یعنی نصیحت آموز نقاط اور اتحاد واتفاق ہے۔ نصیحت اور بھائی چارے کا درس ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔ ان کی نظمیں ان کی نظم نگاری میں تو ضرور ملتی ہیں۔ عرشؔ نظم کے اس حصے میں اپنے ماضی کا مختصر اور خوبصورت نقشہ پیش کرتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے ماضی کی عظیمت بیان کرتے ہیں وہیں وہ کشمیر کی تباہی و بربادی کو بھی بیان کرتے ہیں:

وہی پگڈنڈیاں ویران ہیں سنسان ہیں ایسے

کہ آثار قدیمہ میں ہیں شامل رونقیں ان کی

کہاں نغموں کی وہ بارش کہاں جذبات کی نڈیاں

جمود مستقبل چھایا ہوا ہے آج ہر جانب

فضا خاموش ہے کیسا سکوتِ بیکراں ٹھہرا

کناروں تک نہیں آتیں کبھی اب جھیل کی لہریں

خود اپنے آپ میں گم سی ہیں کچھ کھوئی کھوئی سی

کوئی چھیڑے اگر ان کو کئی نغمے بکھر جائی (۴۶)

عرشؔ کی زبان دانی اور روانی کلام کی جتنی تعریف کی جائے اتنی کم ہے۔انہوں نے جموں کشمیر میں امن و آمان کا وہ ماحول دیکھا ہے جہاں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی و دیگر تمام مذہبوں کے لوگ ایک چٹان کی طرح رہتے تھے لیکن اب یہاں کی عوام میں وہ پہلا سا بھروسہ اور آپسی اتفاق بہت حد تک کم ہو گیا ہے۔تمام عالم انسان جب کہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں گویا خونی رشتے کے بھائی بھائی ہیں باوجود اس کے ان میں وہ جذبہ انسانیت بہت حد تک مٹ سا گیا ہے۔اب کشمیر میں وہ امن و آمان کی صورت بھی بہت کم نظر آتی ہے جس کی بدولت اسے امن و آمان کی وادی کا خطاب حاصل تھا۔عرشؔ اس نظم کے آخر میں آپسی انتشار و اختلاف میں ڈوبی پسماندہ عوام سے جو خطاب کرتے ہیں وہ قابل احترام ہے جو ان کی صاف دلی اور جذبہ حب الوطنی کو ظاہر کرتا ہے۔عرشؔ کی شخصیت میں رجائیت کا عنصر حاوی ہے۔ان کی نظر ہمیشہ روشن مستقبل پر رہتی ہے۔لہٰذا اس نظم کے آخر میں وہ فرماتے ہیں کہ اب چاہے ہمیں خود کو مٹانا کیوں نہ پڑ جائے لیکن ہم اس گلستان کو اجڑنے نہیں دیں گے۔وہ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ یہ جذبہ ہمیں بزرگوں سے وراثت میں ملا ہے:

سبھی اہل وطن ہیں ہم لگالیں سب کو سینے سے

سبھی اپنے ہیں سب سے زندگی بھر کا ہے ای رشتہ

جدا ہوتا نہیں ہے مانس چاہو لاکھ ناخن سے

مذاہب جس قدر بھی ہوں ہے لازم احترام ان کا

سبھی انسان ہیں انسانیت کا ہے مقام اونچا

ہزاروں آندھیاں آئیں کئی طوفان بھی اٹھیں

یہ شمع بجھ نہیں سکتی یہ عظمت مٹ نہیں سکتی

یہی بزرگوں سے ملی ہم کو وراثت میں
وراثت اک امانت ہے امانت ہی رہے گی یہ
امانت میں کسی صورت خیانت نہیں ہو سکتی!(۴۶)

عرش صہبائی کو انسانی رشتوں اور جذبوں سے محبت ہے۔انہیں کھوکھلی سیاست سے زیادہ آپسی بھائی چارے اور مذہبی افکار سے زیادہ دلچسپی ہے۔غریب، نادار، مزدور، بچے، بوڑھے، امیر، غریب، یتیم، بیوہ بلکہ انسانی جذبات سے جڑے تمام مسائل انھیں زیادہ عزیز ہیں۔ریاست جموں کشمیر کی اردو شاعری کی روایت اگر ہم بات کریں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی ہمدردی اور فقر و مستی کو عرش صہبائی نے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ پیش کیا ہے۔زندگی اور زندگی کے مختلف گوشوں کے متعلق جس قدر عرش نے اپنے کلام میں بیان کیا ہے وہی ان کی انفرادیت کو واضع کرنے کے لئے کافی ہے۔آج بظاہر دنیا بہت ترقی کر رہی ہے اور ہندوستان بھی اس دوڑ میں شامل ہے۔نئی تہذیب کی ترقی اور نئی ایجادات کے باوجود تنگ دست وافلاس زدہ لوگوں کی تعداد میں کمی نہیں ہو رہی ہے۔آج بھی ہندوستان میں تقریباً آٹھ ہزار بچے روزانہ بھوک سے مرتے ہیں۔

عرش صہبائی کی دیگر نظموں میں ''تجدیت محبت''، ''خواب''، ''نغمہ'' اور ''یادرفتہ'' بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ان نظموں کی خوبیوں کو بھی ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔عرش نے یہاں انسان اور انسان کی زندگی کے تعلق رکھنے والے دیگر معاملات و مسائل پر عمدہ نظمیں کہی ہیں وہیں ان کی عشقیہ نظمیں بھی خصوصی اہمت کی حامل ہیں۔بہر کیف ان کی نظم ''تجدید محبت'' بھی ایک اچھی اور نئی طرز کی عشقیہ نظم ہے جس میں شاعر اپنے حالات کے پیش نظر محبوب کی تجدید محبت کی پیش کش سے انکار کا قائل ہے اور اپنے محبوب سے مخاطب ہیں کہ جس غرض سے تم محبت میں مبتلا ہو میں اس کی حقیقت سے بالکل جدا ہوں، میری زندگی مصیبتوں اور پریشانیوں کے طوفانوں سے گیری ہوئی ہے میں تمہیں وہ ہر وہ آسائش دینے سے قاصر ہوں جس کے تم طالب ہو۔نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

باعث تسکیں ہے تجدید محبت کا پیام
کیا کروں اس پیشکش کو میں بہت معذور ہوں
تو ادھر اپنے دل مضطر کے ہاتھوں بے قرار
میں ادھر اپنی بے مہری ایام سے مجبور ہوں
میرا فن، میری محبت اور میری شاعری

گردش رنج ومصائب دور کر سکتے نہیں
ایسی تجدید محبت سے ہے پھر کیا فائدہ
جب میرے اشعار تیرا پیٹ بھر سکتے نہیں
زندگی کی کشمکش میں، یاس کے طوفان میں
تیری کشتی جس کی طالب ہے میں وہ ساحل نہیں
آج تجھ پر کر رہا ہوں یہ حقیقت آشکار
میں فقط اک جادہ پُر خار ہوں منزل نہیں (۴۷)

اس میں کوئی شک نہیں کی محبت کی شدت خاص کر آغازی شدت میں اور محبت کے تیز دکھ میں عاشق کے لئے پھیلی ہوئی کائنات وحیات ایک بے معنی بلکہ تکلیف دہ حد تک بے معنی چیز نظر آتی ہے۔نفسیات جنسات کی یہ کیفیت حیات وشعور میں ایک سکڑن پیدا کر دیتی ہے زندگی جنسیت کے مرکز پر سمٹ آتی ہے چشم تنگ کثرت نظارہ کی تاب کھو بیٹھتی ہے اور وا ہونے سے انکار کر بیٹھتی ہے۔ان سب باتوں کا علم رکھنے باوجود شاعر محبوب کو رسوا کرنے پر مجبور ہے۔عرشؔ نہایت سادہ طبیعت تھے،ان کی نظم ''تجدید محبت'' ان کی سادگی کا مظاہرہ ہے۔عرشؔ کی نظم ''خواب'' بھی بالکل اسی طرح کی نظم ہے۔اس میں بھی شاعر اپنی مختلف قسم کی مجبوریوں کا ذکر کرتا ہے۔وہ اعتراف کرتا ہے کہ اس کے محبوب کو شاعری سے دلچسپی سہی لیکن شاعری سے زندگی نہیں گزر سکتی۔ زندگی گزارنے کے لئے کچھ سرمایہ ہونا لازمی ہے:

میں سمجھتا ہوں تیرے دل میں امنگیں ہیں کئی
تو بھی جرات اظہار کرے یا نہ کرے
تو نے آنکھوں میں کئی خواب سجا رکھے ہیں
مجھ سے اس بات کا اقرار کرے یا نہ کرے
تجھ کو رغبت ہے مرے شعر وسخن سے لیکن
تو مری گردش تقدیر سے آگاہ نہیں
میں تو اک شاعر مفلس ہوں کوئی شہنشاہ نہیں (۴۸)

عرشؔ صہبائی کی شاعری محض واقعہ نگاری نہیں بلکہ حقیقی احساسات پر مبنی ہے۔انہوں بڑی جد وجہد بھری اور صاف ستھری زندگی گذاری ہے۔ان کے ارد گرد کا ماحول چاہے کیسا بھی ہو میں نے ہمیشہ ان کے اظہار میں

عاجزی وانکساری ہی دیکھی ہے۔ان کا لہجہ کبھی بھی ترش نہیں ہوتا تھا۔وہ ہر بات کے اظہار میں شیریں اور نرمی کا اختیار کرتے تھے۔چوں کہ وہ خود ایک منکرالمزاج اور سادہ دل انسان تھے اس لئے سادہ لوحی کو وہ انسانیت کی معراج تصور کرتے تھے۔نظم ''شکوہ'' بھی عرشؔ کی ایک اچھی عشقیہ نظم ہے جس میں وہ اپنے محبوب سے شکوہ و شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔انسان عشق و محبت کا قائل نہ بھی ہو لیکن عشقیہ جذبات واحساسات کا اثر اس پر بھی ہوتا ہے۔اس نظم میں ان کی دوسری نظمیں ''تجدید محبت'' اور ''خواب'' کے شاعر پر دل پر ہونے والے اثرات کا رنگ موجود ہے۔چند اشعار پیش ہیں:

مجھ کو شکوہ ہے کہ تم روز میرے خوابوں میں
رقص کرتی ہوئی ،گاتی ہوئی آجاتی ہو
گنگناتی ہوئی پازیب کی جھنکار سے
میری خوابیدہ امنگوں کو جگا جاتی ہو

میرے ارمان بھی بے تاب ہو اٹھتے ہیں
میں بھی انسان ہوں انسان سے بڑھ کر تو نہیں
مجھ پہ بھی مست نگاہوں کا اثر ہو تا ہے
میرے پہلو میں بھی دل ہے کوئی پتھر تو نہیں

اپنے جلوؤں کو ابھی رہنے دو پابندِ نقاب
میری نظروں کو ابھی دید کی فرصت ہی نہیں
میں گرفتار ابھی اور ہی افکار میں ہوں
مجھ کو اس لطف عنائت کی ضرورت نہیں(۴۹)

نظم کے شروع کے اشعار میں عاشق کے دل پر معشوق کی اداؤں کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں لیکن آخر میں عاشق باوجود اس کے عشق سے کنارہ کرنے کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔عرشؔ کے اسی اظہار خیال کے سبب ان کی نظمیں اردو ادب کی دیگر عشقیہ نظموں سے الگ حیثیت رکھتی ہیں۔عرشؔ کے ان خیالات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ جتنے اچھے انسان تھے اتنے ہی سچے عاشق صفت بھی تھے۔ان کی شخصیت پر فراقؔ

کا شعر صادق آتا ہے:

محبت ہی نہیں جس میں وہ کیا درس عمل دے گا
محبت ترک کردینا بھی عاشق ہی کو آتا ہے (۵۰)

عرشؔ کی نظم ''نغمہ'' بھی اسی نوعیت کی نظم ہے۔اس میں بھی شاعر نے اپنی مجبوری حالات کی تفصیل بیان کی ہے۔ان کی دیگر نظموں کی طرح اس میں شدت جذبات کا اظہار ملتا ہے۔یہ نظم اس کے نام کی مشاہبت پرمبنی ہے یعنی نظم کم نغمہ زیادہ معلوم پڑتی ہے۔عرشؔ اس نظم اپنی دیگر عشقیہ نظموں کی طرح اس میں بھی اپنے معشوق سے مخاطب ہے اور اپنی مجبوریوں کا اظہار یوں کردتیا ہے:

اپنی دھن میں رواں ہیں جو دھارے ہیں ہم
جو نہ مل پائیں وہ دو کنارے ہیں ہم
کیا بتایں دل کتنا رنجور ہے
میں بھی مجبور ہوں تو بھی مجبور ہے
اب سنور جائیں حالات ممکن نہیں
اس جنم میں ملاقات ممکن نہیں
ناامیدی کا عالم بدستور ہے
میں بھی مجبور ہوں تو بھی مجبور ہے
زندگی میں ہر اک آس چھوڑ دیں
کیوں نہ اب دل کے رشتے کو توڑ دیں
یہ محبت کی دنیا کا دستور ہے
میں بھی مجبور ہوں تو بھی مجبور ہے(۵۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ عرشؔ کی عشقیہ نظمیں بھی ایک متلاطم ترنم رکھتی ہیں اور امڈے ہوئے جذبات کا دریا بہا دیتی ہیں جو نہایت رنگیں وادیوں اور گھٹاؤں سے گزرتے ہوئے چاند تاروں اور فضاؤں کو منعکس کرتے ہوئے زندگی اور فطرت کے سینکڑوں رنگا رنگ نکہتوں سے معطر منازل کو خیر مقدم اور خیر آباد کہتے ہوئے عالم غیب میں جا کر نگاہوں سے محو ہو جاتے ہیں۔عرشؔ نے ان جذبات کو نہایت دلکش و دلفریب انداز میں اپنے ہاں پیش کیا ہے۔عرشؔ کی نظم نگاری میں جدید اردو نظم نگاری کے واضح اور مستحکم نقوش ملتے ہیں۔انہوں نے اپنے زمانے کے سیاسی اتھل پتھل، اصلاحی و تعلیمی نظام اور سماجی و تہذیبی تبدیلیوں غرض ہر شعبہ کا بغور مشاہدہ کیا

ہے۔مجموعی طور پر عرشؔ صہبائی نے اپنی نظموں میں زندگی کے ہر پہلو کو پیش کیا ہے۔ان کی تمام نظموں میں تہہ داری اور روانی پائی جاتی ہے۔وحدت تاثر،سادگی،اصلیت،جوش،تشبیہات،واستعارات،تصویر کشی وغیرہ کو انہوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری کی طرح نظمیہ شاعری میں بھی تفصیل کے بجائے ایجاز واختصار کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ان کی نظم نگاری کو کسی قیمت پر بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ان کی نظمیں مختصر ہونے کے باوجود بھی اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتی ہے۔عرشؔ کو ایک عظیم غزل گو شاعر کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے اردو کو اچھی اچھی نظموں سے بھی روشناس کروایا ہے اور تاحال ناقد کے لئے یہ فیصلہ کرنا ازحد مشکل ہوجاتا ہے کہ عرشؔ صہبائی کی اور نظم میں کس کا پلڑا بھاری ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ عرشؔ صہبائی نے شاعری کی جس صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے اسے ایک ایسے مقام پر لاکر کھڑا کر دیا جہاں اس کی انفرادیت سے کوئی انکار نہیں کرسکا۔بے شک اردو ادب میں عرش صہبائی کو اہم شاعروں میں گنا جاتا ہے اس کے باوجود شاعری میں ان کا اپنا ایک الگ انداز ہے،الگ طرز بیان ہے۔شاعری میں ان کی لگن جنون کی حدود سے آگے نظر آتی ہے۔یہ ان کے جنون کا ہی ردعمل ہے کہ انہوں نے اردو شاعری میں بعض نئے اشعار کا اضافہ کیا ہے۔بے شک ہم تنگ دلی اور تنگ نظری کی وجہ سے اس کا اعتراف نہ کریں لیکن حقیقت حقیقت ہے اسے کسی صورت میں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔انہوں نے اگر اردو نظم نگاری کی ایک الگ دنیا قائم کی ہے تو جو قطعات کہے ہیں ان میں بھی انفرادیت ہے۔عرشؔ صہبائی نے اردو شاعری کی جن اصناف میں کام کیا ہے ان میں ''قطعات'' اور بھی شامل ہیں جو پڑھتے ہی دل ودماغ پر نقش ہوجاتے ہیں۔بیشتر قطعات میں نئے مضامین ہیں اور پھر ان کے انداز بیان نے ان میں اور خوبی پیدا کردی ہے۔عرشؔ اپنے کلام میں اتنی صاف ستھری زبان استعمال کرتے ہیں جسے پڑھ کر رشک آتا ہے۔ان کے کلام میں جو خوبیاں ہیں وہ خداداد ہیں لیکن اس میں ان کی ریاضت بھی شامل ہے۔ان کی تعمیری سوچ بھی شامل ہے ان کی شاعری کے کئی پہلو ہیں کس کس پر روشنی ڈالی جائے۔اگر ان کے کلام میں فنی قدریں شامل ہیں تو ان کی زندگی میں انسانی قدریں موجود ہیں۔ان کی قطعہ نگاری کا جائزہ ہم اس قطعہ سے شروع کرتے ہیں یہ قطعہ بے حد مقبول اور مشہور ہے یہ جہاں بھی پڑھا گیا ہے وہاں ایک نیا ماحول بن گیا ہے۔اردو قطعہ نگاری کے سرمائے میں یہ اضافے کی حیثیت رکھتا ہے:

بہر پرسش اگر چلے آتے
اس بہانے سے دید ہو جاتی
آپ کا اس میں کیا بگڑ جاتا
ہم غریبوں کی عید ہو جاتی (۵۲)

یہ قطعہ کئی پہلو لئے ہوئے ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک زندگی بخش خیال کو پیش کرنے میں اتنی سادہ زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے بھی یہ قطعہ قاری یا سامع کے دل میں اتر جاتا ہے اور پھر ''عید'' کے استعمال نے اسے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس میں پاکیزگی کا عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ جس سے اس کی عظمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر شعر نہیں کہہ رہا بلکہ باتیں کر رہا ہے۔ اسے پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی یہ قطعہ نہیں بلکہ اس نوعیت کے اور بھی کئی قطعات کہہ سکتے ہیں لیکن علمی طور پر ایسا ممکن نہیں۔ سادہ شعر دیکھنے میں جتنا آسان لگتا ہے کہنے میں یہ اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہ خوبی عرشؔ صہبائی کے تمام قطعات میں نظر آئے گی۔

عرشؔ صہبائی اپنے گرد و پیش کسی چیز کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اس کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے وہ پہلو ابھارتے ہیں جن سے بچنے کی ضرورت ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے کلام کی بنیاد حق پر ہوتی ہے۔ ہمارے سماج کو سب سے زیادہ نقصان اس کے کہنہ رسم و رواج سے پہنچا ہے۔ اور پہنچ رہا ہے۔ ملک میں تعلیم کے پھیلاؤ کے باوجود یہ رسمیں سماج پر چھائی ہوئی ہیں۔ ان میں کمی آنے کے بجائے برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس طرح یہ ایک قتل گاہ کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ یہ بات کتنے مئوثر ڈھنگ سے کہی گئی ہے آپ اس قطعہ سے اندازہ لگا سکتے ہیں ہماری اردو کی شاعری میں ان کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے جبکہ ان پر توجہ دینے کی ہی ضرورت نہیں بلکہ انہیں ہٹانے کی ضرورت ہے قطعہ ملاحظہ کیجئے:

کہنہ رسم و رواج کے پہرے ہر قدم ساتھ ساتھ رہتے ہیں
قتل گاہِ حیات ہے اے عرش لوگ جس کو سماج کہتے ہیں (۵۳)

اس قتل گاہ حیات کی ترکیب کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ ایک کہنہ مشق شاعر ہی یہ کہہ سکتا ہے۔ سماج کو قتل گاہِ حیات قرار کرنا ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں جبکہ وہ خود اس سماج کا ایک رُکن ہے اور اسی زندگی بسر کر رہا ہے یہ قطعہ شاعر نے ان کہنہ رسموں کی گہرائی میں اتر کر کہا ہے یہاں شاعر ایک رہنما کا کردار ادا کر رہے

ہیں اب آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ایک قطعہ کتنے پہلو لئے ہوئے ہے۔عرشؔ صہبائی کے ہر قطعہ میں ایک نیا پن ہے۔تعمیری سوچ ہے جس سے خیال میں تازگی محسوس ہوتی ہے۔اگر قطعہ میں دیر وکعبہ کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کے تقدس کو برقرار رکھا ہے اس میں ایک ایک مصرعہ بے پناہ، شعریت لئے ہوئے ہے:

کیوں بھٹکتا ہے دیر وکعبہ میں　　آبتاؤں تجھے خوشی کا راز
جان اُسے خضر جادۂ منزل　　جو ہے میرے ضمیر کا آواز(۵۴)

یہاں ہر مصرعہ دادطلب ہے اور جو خوشی کے راز کی بنیاد بتائی گئی ہے اس کی کہاں تک تعریف کی جائے۔ دیر وکعبہ کی عظمت اپنی جگہ مسلم لیکن ضمیر کی آواز اس سے سبقت لے جاتی ہے اور حق بات بھی یہی ہے کہ انسان کی زندگی میں سب کچھ ضمیر ہے۔اور انسان کی زندگی اس محور کے گرد گھومتی ہے۔زندگی کی رہنمائی اس سے بہتر کون کرسکتا ہے۔اگر انسان اس کی آواز نہ سنے تو الگ بات ہے۔ورنہ اس کی زندگی سے اس سے بڑھ کر اور کوئی رہنما نہیں۔اگر اسے حرف آخر بھی کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔عرشؔ کے بعض قطعات ایسے ہیں کہ انہیں فن کے سانچے میں بالکل نئے انداز میں ڈھالا گیا ہے جو ایک مشاق شاعر ہی کرسکتا ہے جو عرشؔ نے کیا ہے۔دنیا میں وہ کونسی چیز ہے جس پر عرش صہباؔئی کی گہری نظر نہیں۔بعض قطعات پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عرشؔ کتنے دوربین ہیں۔ان کی نظر کہاں کہاں سے جاتی ہے۔ہم جس دور میں گزر رہے ہیں اس کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

ایک چیچک زدہ سے چہرے پر　　بدنما اہتمام غازہ ہو
کیا کہیں آج کی نئی تہذیب　　جس طرح بے کفن جنازہ ہو(۵۵)

یہاں ہر مصرعہ اپنی جگہ ایک مکمل خیال ہے چاروں مصرعے جس طرح آپس میں مربوط ہیں اس کی کہاں تک تعریف کی جائے۔قطعہ پڑھ کر ایک منظر سامنے آتا ہے جو حقائق پر مبنی ہے۔انسان پریشان ہوجاتا ہے کہ وہ کس موحول میں زندگی گزار رہا ہے۔یہاں ''بے کفن جنازہ'' نے احسان میں شدت پیدا کردی ہے۔''بدنما اہتمام'' نے قطعے کو زوردار بنادیا ہے۔یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی بدولت ان پر مضامین لکھنے والوں نے انہیں استاد قرار دیا ہے۔اس بات کے ثبوت ان کے کلام میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔''بدنما اہتمام غازہ'' کو''بے کفن جنازہ'' سے تشبیہ دنیا اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعری میں ان کی ریاضت اپنے جوہر دکھاتی ہے۔لفظ جنازہ کا استعمال اس قطعہ میں بھی دیکھئے اور سر دھنئے:

اس طرح آرزو مٹی کوئی　　دل میں اک حشر کا سا عالم ہو
جس طرح اک جنازہ اُٹھنے پر　　چار سو گھر میں شور ماتم ہو(۵۶)

اس قطعہ میں منظر نگاری بھی قابل توجہ ہے قارئین کی توجہ اس اہم خوبی کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو بہت کم شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے۔عرشؔ نے لفظ جنازہ کے علاوہ بھی کئی ایسے ہی غریب اور پست الفاظ کو اپنے یہاں استعمال کیا ہے جنہیں اردو کے دوسرے شعراء استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔عرش نے ان الفاظ کو ایسی فن کاری سے استعمال کیا ہے کہ قطعات کے مطالعے سے ان میں ترنم اور نغمگی سے محسوس ہوتی ہے ۔حیرت کا مقام ہے کہ موصوف مشاعروں میں اپنا کلام تحت اللفظ پڑھتے ہیں پھر بھی مشاعرہ پر چھا جاتے ہیں۔ ان کی نظر میں ترنم اچھے شعر میں موجود ہوتا ہے۔اب ترنم کا ذکر چلا ہے تو یہ قطعہ بھی دیکھئے جس میں وہ موجودہ شعراء کی طنز پر مامور ہیں:

شعر سُر تال میں جو پڑھتے ہیں داد وتحسین انہیں کی باندی ہے
فن سے یکسر وہ بے نیاز سہی آج انہیں شاعروں کی چاندی ہے(۵۷)

بعض اوقات یہ سرتال چیخوں میں بدل جاتے ہیں ایسے شاعروں کی نظر میں چیخ چیخ کر کلام پڑھنا ہی شاعری ہے مشاعرے میں ایسے شاعروں کے ناز وادا بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔اس فن میں شاعرات سب سے آگے ہوتی ہیں مشاعروں پر اس کا افسوس ناک ردعمل یہ ہو رہا ہے کہ مشاعرے ''سرکس کا شو'' بن کر رہ گئے ہیں۔اس سے سامعین کا مذاق بھی پست ہو گیا ہے۔مجموعی طور پر اردو زبان کو اس سے نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہ سلسلہ کسی صورت بھی رُکنے والا نہیں، جہاں تک آج کے اردو مشاعروں کا تعلق ہے۔ یہ تفریح کا سامان بن کر رہ گئے ہیں۔وہ دور ختم ہو گیا جب اردو مشاعرے ذہنی پرورش کا باعث ہوا کرتے تھے۔اوران نو آموز شاعروں کو ان سے شعر کہنے کی مزید تحریک ملتی تھی۔مشاعروں میں اب سامعین کی نظر شاعرات کی اداؤں پر ہوتی ہے۔ وہ مشاعرے سے پہلے بناؤ سنگار پر کافی وقت صرف کرتی ہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ واقعی آج ایسے شاعروں کی ہی چاندی ہے یہاں قوافی بھی ،توجہ طلب ہیں۔

بات وہیں ختم ہوتی ہے کہ عرش صہبائی کو شعر کہنے کا فن آتا ہے۔عرشؔ صہبائی بھی انسان ہیں ایک ایسے انسان جن کے دل میں محبت ہے۔محبت زندگی کی بنیاد ہوتی ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان اس کا اظہار نہ کرے۔ یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قطعہ کن جذبات میں بہہ کر کہا گیا ہے کیوں کہ عرش صہبائی نے ٹی۔ وی کے ایک انٹرویو میں جب ان سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ کسی سے محبت کرتے ہیں تو انہوں نے ''اعتراف کیا تھا کہ وہ زندگی سے محبت کرتے ہیں اور یہ حق بھی ہے بہر حال قطعہ غور طلب ہی نہیں قابل تعریف بھی ہے:

یہ شبِ ماہ اور یہ خنکی دل کو کچھ اور بھی جلاتی ہے

آپ تنہا نہ اس طرح گھومیں چاندنی آگ بھی لگاتی ہے(۵۸)

یہ قطعہ بھی ایک بہترین پہلو لئے ہے۔الفاظ کی نشست و برخاست دیکھئے اور یہ ثابت کرنا کہ چاندنی آگ بھی لگاتی ہے انہیں کا کام ہے تنہا گھومنا اس قطعہ کی بنیاد کہے۔اس خیال کا محرک ہی لفظ تنہا ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شاعر کا زندگی کے بارے میں بڑا گہرا مطالعہ ہے اور غیر سطحی یہ بات بڑی آسانی کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ نباض محبت بھی ہیں اور محبت کا جب بھی اظہار کرتے ہیں اس میں خیال کی پاکیزگی کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں ان کے کلام میں کہیں بھی خیال کی پستی اور بازاری پن نظر نہیں آئے گا اس وجہ سے بھی ان کا خیال اپنی انفرادیت کا حامل ہے۔آج کے دور میں جہاں بھی جایئے عریانی کے مناظر خیر مقدم کرتے ہیں۔نیم عریانی کا دور زیادہ دیر نہیں رہا۔عریانی کسی خاص جگہ تک محدود نہیں اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ ایسے نوجوان یا لڑکیاں اس پر فخر کرتی ہیں اگر راہ چلتے لوگوں کی بری نظریں ان پر پڑیں تو ہرگز بھی حیرت نہیں ہوتی بلکہ عریانی کی خاطر بری نظروں کو خود دعوت دینے کا سلسلہ عام ہے۔اب یہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ ایسے بچوں کے والدین خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتے رہتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ ایسے بچوں کو کسی قسم کی نصیحت کرنا ان کے بس کی بات نہیں،عرش صہبائی کی دور بین نظر اس وبا کا ذکر اس طرح کرتی ہے:

اہل مغرب بھی ہم کو مان گئے اب ہمارا کوئی نہیں ثانی

رنگ لائی ہے یہ نئی تہذیب عام ہے شوق نیم عریانی(۵۹)

جب عرشؔ صہبائی نے یہ قطعہ کہا ہوگا اس وقت ہم نیم عریانی کے دور سے گزر رہے تھے اب یہ نیم عریانی عریان میں بدل چکی ہے۔یہ دین مغرب کی تہذیب کی ہے۔ستم تو یہ ہے کہ اہل مغرب میں جو خوبیاں ہیں انہیں ہم نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن جو برائیاں ہیں انہیں اپنانے میں ہم ذرا بھی دیر نہیں کرتے۔ان برائیوں کو وہی ابھارے گا جو محسوس کرے گا۔عرشؔ صہبائی کی زندگی سے کئی پہلو ہیں ان میں ایک پہلو یہ بھی ہے وہ ایک مہذب زندگی پسند کرتے ہیں۔اگر اہل مغرب کی نظر میں عریانی کوئی معنی نہیں رکھتی تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اہل مشرق بھی ان کی پیروی کریں۔

عرشؔ کے نہ صرف قطعات بلکہ پوری شاعری نیچرل ہو یا وطنی، میں ان کو جذباتی شاعری سے تعبیر کروں گا کیوں کہ ان کے اشعار جذبات اور طنز دونوں ملتے ہیں۔عرشؔ صہبائی کے قطعات کی تعداد اگر چہ تھوڑی ہے

لیکن انھوں نے اپنے قطعوں میں کون سا ایسا مضمون ہے جو نہیں باندھا، جذبۂ وطن پرستی بھی ایک اہم موضوع ہے۔حق بات تو یہ ہے کہ انسان کے لئے وطن پرستی سے بڑھ کر کوئی فرض نہیں۔ یہ احساس صرف اس کو ہوتا ہے جس کے دل میں اپنے وطن کے لئے محبت ہو۔ جو اپنے وطن کی عظمت کے لئے ہر طرح کی قربانی دینا جانتا ہو۔ ہم اپنے وطن کی ہی بات کرتے ہیں جب ہندوستان آزاد ہوا تو کن کن وطن پرستوں نے اس پر اپنی جانیں نثار کیں، ان میں ہر فرقے کے لوگ شامل تھے ان کا مذہب صرف وطن پرستی تھا۔اس لئے ان کے نام گنوانے سے گریز کیا جارہا ہے۔ وہ نہ ہندو تھے نہ مسلمان صرف انسان تھے اور انسان بھی ایسے جنہیں وطن پیارا تھا۔ جو آزادی کے قیمت سمجھتے تھے۔انہوں نے غلامی کا داغ مٹانے کے لئے ہر قسم کی قربانی دی۔ زندگی کا بیشتر حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارا بعض نے پھانسی بھی جھولی۔صرف اتنی سی بات کے لئے کہ ان کا وطن ان کا پیارا ہندوستان غلامی سے آزاد ہو۔اس کی دیکھ بھال وہ خود کریں ان سب باتوں کو عرش صہبائی نے کس خوبی کے ساتھ قطعہ میں ڈھالا ہے کیونکہ وہ بھی بنیادی طور پر ہندوستانی ہیں اور آزادی کی قیمت کو سمجھتے ہیں:

نقد ہستی کو بھی لٹاتے ہیں　　فرض کرکے اداد کھاتے ہیں
جب وقار وطن پہ آنچ آئے　　لوگ پھانسی بھی جھول جاتے ہیں(۶۰)

اسی طرز کا ایک اور قطعات دیکھیں:

ہم نہیں موج بلا خیز سے ڈرنے والے
اپنی کشتی کو تلاطم میں بھی کھے سکتے ہیں
اور اگر جان بھی دینے کی گھڑی آجائے
مسکراتے ہوئے ہم جان بھی دے سکتے ہیں(۶۱)

ناموافق ہوں لاکھ وہ لیکن　　پھر بھی حالات سے نہیں ڈرتے
حق پرستی ہے اپنا شیوہ عرشؔ　　ہم کسی بات سے نہیں ڈرتے (۶۲)

عرشؔ صہبائی کے کئی ایسے ہی قطعات ہیں جو دوسروں کے اندر جذبہ خوداری کو بے دار کرتے ہیں جو انہیں کسی بھی بڑے سے بڑے تلاطم سے ٹکرانے کی ہمت دیتے ہیں۔عرشؔ صہبائی کے بیشتر قطعے پڑھ کر انسان کی سوچ کا دھارا بدل جاتا ہے۔اگرچہ ان کی تمام زندگی مشکلات کی زد میں رہی ہے اور انہوں نے طرح طرح

کے مصائب میں وقت گزرا ہے۔ یہ قطعات پڑھ کران کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے۔ وہ قطعات کے ذریعہ دوسروں کو رہنمائی کرتے ہیں زندگی کرنے کا راستہ سمجھاتے ہیں۔ یہاں وہ شاعر نہیں بلکہ ایک رہنما نظر آتے ہیں۔قطعات دیکھئے:

اب کس طور بھی چل سکتی نہیں بادِسموم
رونق فصل بہاراں کے محافظ ہم ہیں
کس کی جرات کو بری آنکھ سے دیکھے اس کو
آج خود اپنے گلستاں کے محافظ ہم ہیں(۶۳)

عرشؔ صہبائی کے قطعات فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے نظر آتے ہیں اور قطعے کے حسن کو ملحوظ خاطر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔اگرچہ عرشؔ صہبائی کی زندگی آلام ومصائب کے درمیاں گزری ہے اس کے باوجود انہیں یہ بے حد عزیز تھے۔اس قطعہ میں اس کے خالق کی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے اگر ایسا ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ زندگی میں کبھی کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں جو باحوصلہ شخص کو بھی توڑ کے رکھ دیتے ہیں بے شک وقتی طور پر ہی سہی انسان کی زندگی مختلف مراحل سے گزرتی رہتی ہے۔ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ شاعر دوسرے کی صورت حال سے متاثر ہوا ہو اور اس نے اسے اپنی صورتِ حال سمجھ کر یہ قطعہ کہا ہو۔بہر حال قطعہ خوب ہے اور دل میں اتر جاتا ہے:

اب نہیں پہلا سا وہ جوش وخروش　　اک سکوتِ مرگ ہے چھایا ہوا
جیسے صحرا میں کوئی خانہ بہ دوش(۶۴)　　اس طرح ہے دل میں تیری آرزو

یہاں سکوت مرگ کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ کسی اور بات کی محتاج نہیں عرشؔ صہبائی الفاظ سے کھیلتے نظر آتے ہیں۔قطعہ میں جو الفاظ عد آئے ہیں ان سے عجیب منظر پیدا ہوتا ہے۔جب وہ صحرا میں کوئی خانہ بد دوش کہتے ہیں تو اس سے پہلے ہی اس بات کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ وہ پہلا سا جوش وخروش نہیں رہا۔مختلف الفاظ کا ایک دوسرے سے کس قدر گہرا تعلق ہے۔یہ سلسلہ قائم رکھنا مشاقی کا ثبوت ہے کہ شاعر کو الفاظ پر گرفت حاصل ہے۔اس سے اس بات کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ شاعر کی ذہنی نشوونما کس صحت مند ماحول میں ہوئی ہے۔اس کا اندازہ ہی نہیں ثبوت سامنے ہے ان سب باتوں کے باوجود قطعہ شعریت سے بھرپور ہے۔اور اس نغمگی ٹپکتی ہے۔

عرشؔ صہبائی کا شماران لوگوں میں ہوتا ہے جو جدوجہد سے تعبیر کرتے ہیں۔جب ہم سنجیدگی سے غور

کریں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ جد و جہد کے بغیر یہ زندگی کچھ بھی نہیں اسکے بغیر زندگی ایک زندہ لاش ہے۔ اس خیال اور اس حقیقت کی بنیاد پر یہ کہنا لازمی ہو جاتا ہے کہ اس میں غم جاناں اور غم دوران کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ غموں کے سبب زندگی حرکت میں رہے گی اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تگ و دو کرے گی یہی تگ و دو ہی اصل میں زندگی ہے۔ عرشؔ صہبائی جیسے لوگ کہاں ملیں گے جو زندگی میں حادثوں کو خود دعوت دیتے ہوں۔ اس خیال کو انتہائی خوبصورت طریقے سے اس قطعہ میں بیان کیا گیا ہے:

حادثوں سے ہی لطف ہے اس میں ورنہ یہ زندگی ادھوری ہے
غم جاناں ہو یا غم دوراں اک نہ اک حادثہ ضروری ہے (٦٥)

عرشؔ صہبائی کے کئی نئے اشعار کی طرح یہ قطعہ بھی ایک نیا قطعہ ہے۔ یہاں شاعر کے حوصلے کی بھی داد دینا پڑتی ہے جس کی بنیاد پر اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا ہے اور جس نے زندگی کرنے کا ایک نیا مفہوم قاری کو دیا ہے۔ موصوف کو زندگی ہی محبوب نہیں بلکہ وہ موت کو بھی زندگی کی طرح تصور کرتے تھے۔ یہ قطعہ دیکھیں:

راہ حق میں چلا تو ہے لیکن آزمائش کڑی ہوگی
سوچ لے پھر یہ سوچ لے ناداں ہر قدم پر قضا کھڑی ہوگی(٦٦)

اس بنا پر کہنا پڑے گا کہ عرشؔ صہبائی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ حادثوں سے دور رہنے کی بجائے انہیں خود دعوت دیتے ہیں۔ ورنہ عام آدمی تو حادثوں کے نام سے ہی لرز جاتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہر شخص کو اتنی توفیق دے، ایسی سوچ عطا کرے جس سے زندگی پر وقار ہو سکے اور سوچ میں ایک توانائی پیدا ہو جائے۔ عرشؔ ادب برائے ادب کے نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ انہوں نے اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انہوں نے قدم قدم پر زندگی کے پیچ وخم کو محسوس کیا ہے بلکہ ان کی زندگی انہیں پر پیچ حالات میں گزری ہے۔ یہی معاملات و مسائل ان کی شاعری کا بہترین حصہ ہیں۔ وہ کبھی قارین کے سامنے زندگی کی بے ثباتی کا راز فاش کیا ہے تو کبھی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ شرون کمار ورما اپنے ایک مضمون میں عرشؔ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

...اس نے زندگی کو ایک متحرک، مجسم، تبسم، معتبر اکائی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عرشؔ نے زندگی سے عشق کیا ہے۔ یہی کمبخت اس کی محبوبہ ہے۔ اس کا ہر رنگ اس نے دیکھا ہے۔ زندگی نے انہیں چرکے بھی دئے ہیں اور جھٹکے بھی

،روشنی بھی دی ہے اور اندھیرا بھی، اپنے حسن کا جادو بھی جگایا ہے، اپنی کثافت کا شکار ابھی، لطافت سے اس کی جھولی بھی بھری ہے اور تلخیاں بھی دی ہیں۔عرشؔ نے اس کے ہر غمزہ، ما ہر ادا، ہر وار کو برداشت کیا ہے لیکن اس نے اپنے عشق میں کمی نہیں آنے دی۔(۶۷)

عرشؔ صہبائی کے کلام میں رجائیت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے یہ خوبی ان کی عام بول چال میں بھی ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ اپنی زندگی میں مختلف اقسام کے غم و آلام سے دو چار نہیں بلکہ مختصر طور پر ان کی زندگی غم و آلام کا مرقع ہے لیکن اس پر مسکراہٹوں کا غازہ ہے جو غم و آلام سے متاثر نہیں بلکہ غم و آلام اس سے متاثر ہیں اسی باعث ان کی زندگی پر ایک دائمی مسکراہٹ کہیے کہ جو دوسروں کو بھی ایک پر وقار زندگی بسر کرنے کی تحریک دیتی ہے۔جو جذبہ ان کے دل میں ہے وہی کلام سے نمایاں ہے۔اس سلسلے میں ان کا قطعات ملاحظہ کیجئے:

ہائے وہ عالم شباب اپنا　　کیا امنگیں تھیں کیا ارادے تھے
یوں حقارت سے دیکھئے نہ ہمیں　　کبھی ہم بھی رئیس زادے تھے(۶۸)

زندگی کیا ہے دامن صد چاک　　اس کو دن رات سی رہا ہوں میں
یہی مقصد ہے میرے جینے کا　　اسی مقصد سے جی رہا ہوں ہیں(۶۹)

ایسے قطعات سے دوسروں کا حوصلہ بھی بڑھتا ہے اور زندگی میں تعمیری نظریہ بھی پیدا ہوتا ہے۔عرشؔ صہبائی شاعری کے ساتھ ساتھ زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ بھی جانتے تھے۔ان کی زندگی سے جڑے ہوئے کئی ایسے واقعات ہیں کس کس کا ذکر کریں وہ ہزار مشکلات میں رہے ہوں مگر ان کے ماتھے پر کبھی کوئی شکن نظر نہیں آتی تھی۔جبکہ وہ خود اعتراف کرتے تھے کہ انکا سینہ زخموں سے بھرا پڑا ہے اس لحاظ سے ان کے ظاہر و باطن میں فرق ہے ورنہ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں۔موصوف عملی طور پر اس عمل کو اپنائے ہوئے تھے اس کی ایک وجہ ان کی حق پرستی بھی تھی جس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں:

ناموافق ہوں لاکھ وہ لیکن　　پھر بھی حالات سے نہیں ڈرتے
حق پرستی ہے اپنا شیوہ عرشؔ　　ہم کسی بات سے نہیں ڈرتے(۷۰)

عرشؔ ہر قدم پر صاف گوئی سے کام لیتے تھے۔صاف گوئی ان کی طبیعت بلکہ ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ تھی اور اسی راستے پر وہ ہر وقت گامزن رہتے تھے۔انہوں نے اپنی تمام زندگی بڑے باوقار طریقے سے

گزاری ہے۔ وہ دوسروں کو بھی ایسی ہی زندگی گزارنے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کا کلام قاری کے دل کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ عرشؔ نے اختر انصاری کی طرح اپنے قطعات میں تشبیہات سے خوب کام لیا ہے۔ ان کے اکثر قطعات تشبیہوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ تشبیہہ کے ذریعہ ایمائی انداز میں مکمل بات کہہ جاتے ہیں ساتھ ہی ساتھ کسی خیال کی خاص حالت یا کیفیت کی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اُن کے صرف خیالات ہی نہیں بلکہ اندازِ بیاں بھی قاری کو متاثر کرتا ہے۔ ان کی زندگی کی کیفیت کئی قطعات سے نمایاں ہوتی ہے:

دل کی دُنیا ہے اس طرح ویراں　　ہر قدم خار خار ملتے ہیں
جس طرح بستیوں کے باہر عرشؔ　　ٹوٹے پھوٹے مزار ملتے ہیں(۷۱)

حیرت ہے کہ ٹوٹے پھوٹے مزاروں میں زندگی بسر کرنے والا شخص تمام عمر ایک باوقار زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ وہ خزاں کو بھی بہار کا درجہ دیتا تھے۔ ان کے بے شمار ایسے قطعات ہیں جو کوشش کے باوجود بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ یہ واقعات ہر عام آدمی کے ساتھ پیش آتے ہیں:

مٹ گئیں سینکڑوں تمنائیں　　وقت نے اس طرح ستم ڈھائے
جس طرح ریت کے گھروندوں کو　　تیز آندھی اُڑا کے لے جائے(۷۲)

آج کے دور کا جو ماحول ہے اس کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے کم نہیں بلکہ بہت کم ہے۔ ایسا نہیں کہ اس سے صرف ایک شاعر ہی گزرتا ہے بلکہ ہر شخص کو اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شاعر جب شاعری کے ذریعہ اسے بیان کرتا ہے اس کی آواز دور دور تک پہنچتی ہے اور ہر ایک آدمی کا اس سے حوصلہ بڑھتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں اس کی آواز بھی شامل ہے۔ ایسے بہت سے قطعات ہیں جو حقیقت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں جن سے دل کا درد جھلکتا ہے۔ ہم کہنے کو تو جی رہے ہیں لیکن حقیقت یہ کہ وقت کاٹ رہے ہیں۔ اس حقیقت کو شاعر نے کس نفاست اور پر اثر انداز میں بیان کیا:

بحر دنیا میں جس طرح بھی ہو　　ہر کوئی اپنی ناؤ کھتیا ہے
دوسروں سے فریب کھاتا ہے　　دوسروں کو فریب دیتا ہے(۷۳)

یہاں ''بحر دنیا'' کی ترکیب کے ساتھ دوسرے مصرعے میں ''ناؤ'' کا استعمال قابل توجہ اور قابل تعریف ہے۔ ایسے باریک نقطے شاعر کے مشاق ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ عرشؔ نے اپنے قطعات میں کئی نئے نئے مضامین باندھے ہیں۔ خطوط کی اہمیت کے متعلق یہ قطعہ دیکھئے:

یوں اچانک ملا ترا مکتوب کھل اٹھے یک بہ یک چمن کوئی
دشت غربت میں اتفاقاً عرشؔ جیسے ملتا ہے ہم وطن کوئی (۷۴)

یہ قطعہ شدت سے خطوط کی اہمیت کا احساس کرواتا ہے کیوں کہ آج کے دور میں خطوط نویسی کم و بیش ختم ہو چکی ہے۔ ان کے کسی بھی قطعے کو نظر انداز نہیں کیا سکتا۔ یہ قطعہ بھی ملاحظہ کیجئے:

اس طرح ہو چکے ہیں اب تحلیل آرزوؤں میں یاس کے سائے
جس طرح ایک چتا کے بجھنے پر راکھ اُڑ کر ہوا میں مل جائے (۷۵)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان قطعات میں جو منظر بیان کیا گیا ہے۔ وہ پڑھنے والے کی نظروں پر چھا جاتا ہے۔ اسے روز بیاں بھی کہا جا سکتا ہے۔ عرشؔ صہبائی کے قطعات میں یہ بات عام ہے۔ کیوں کہ ان کے دل میں ہر حادثہ چاہے وہ خوشگوار ہو چاہے ناخوشگوار پوری طرح جذب ہے اور حقیقت کا آئینہ ہے۔ جب ہم دوسرے کئی قطعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو روح لرز جاتی ہے یہاں شاعر کے احساس کی تعریف کرنا پڑتی ہے اس میں کتنی شدت ہے وہ قطعہ میں جو منظر بیان کرتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ منظر نظروں کے روبرو ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے تمام تر واقعات کو اپنی شاعری میں جگہ دینے کی کوشش کی ہے لیکن بعض مقامات پر موضوع اور ہیئت دنوں میں انفرادیت ہے اور کہیں کہیں روایتی عنصر بھی ملتا ہے۔ عرشؔ کی انفرادیت کا اندازہ آپ کی شاعری سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ مثلاً ان قطعات کو دیکھئے:

در و دیوار خون روتے ہیں موت پہروں کھڑی لرزتی ہے
جب کوئی نوجوان بیوہ عرشؔ شدت غم میں بین کرتی ہے (۷۶)

ان کے بعض قطعات قاری کو چونکا دیتے ہیں اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاعر زندگی کے فلسفے سے اتنا واقف ہے:

تشنگی پر مدارِ ہستی ہے ورنہ کچھ لذت حیات نہیں
ہجر کا ہے طویل افسانہ زندگانی سہاگ رات نہیں (۷۷)

ہم جیسے جیسے عرشؔ صہبائی کے قطعات کا مطالعہ کرتے جاتے ہیں نئی نئی حیرتوں میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے زندگی اور موت کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہی ہیں اور اس انداز سے کہی ہیں کہ ان کی قابلیت اور اہلیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اور ماننا پڑتا ہے کہ ادب میں ان کے قطعے اضافہ ہیں۔ عرشؔ کی

شاعری میں زندگی کی اس قدر تفصیل ملتی ہے کہ انہیں زندگی کا شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا:

تلخی غم کا ذکر کیا یہ تو مستقل راحتوں کی عادی ہے
ہر گھڑی نت نئے تقاضے ہیں زندگی اک رئیس زادی ہے(۷۸)

ایسا نہیں کہ ان سے پہلے کسی شاعر نے زندگی کو اپنی شاعری میں پیش نہیں کیا لیکن عرشؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے ہر ہر پہلو کو بالکل نئے انداز میں اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ان کا ہر قطعہ انفرادی رنگ اور نیا پہلو لئے ہوئے ہے۔یہ قطعہ دیکھئے:

بارہا تھک کے گر پڑی ہے عرشؔ زندگی آفتوں کی جھولی میں
جیسے مجبور سی کوئی دُلہن بے دلی سے رواں ہو ڈولی میں(۷۹)

عرشؔ صہبائی نے جس طرح سے روزمرہ زندگی میں انسانی شخصیات کو دیکھا ہے اس کی ہو بہو تصویر اپنے قطعات میں پیش کر دی ہے جس طرح وہ بوالہوسی کا شکار رہے اور اس حقیقت کو جس خوبی سے پیش کیا ہے اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔انسانی شخصیت کی یہ فطرت ہے کہ وہ کوئی چیز ملنے کے باوجود بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہے۔عرشؔ کی اس بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ کسی ملک کی پہچان اس کا ادب ہوتا ہے لیکن یہ بدقسمتی کا مقام ہے کہ ہماری پہچان گندی سیاست ہے۔ہمارے سیاست دان عوام کو قدم قدم پر مختلف باتوں پر الجھائے رکھتے ہیں تاکہ ان کا اپنا سیاسی وجود قائم رہے۔اس کا ردعمل یہ بھی ہوا ہے کہ وہ ادیب یا شاعر بے معنی ہو کر رہ گئے جن کی زندگی ادب کے لئے وقف ہے اور انہوں نے ایسا ادب پیدا کیا ہے جس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ہمارے ہاں ایسے فنکاروں کی کمی نہیں لیکن وہ کس حال میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس کا اندازہ اس قطعے سے لگایا جا سکتا ہے:

دیکھئے جو ہماری تخلیقات مثل نقش بہار ہیں گویا
حق کی جو پوچھئے تو ہم فنکار چلتے پھرتے مزار ہیں گویا(۸۰)

اس سے ظاہر ہے کہ مجموعی طور پر یہاں کے فنکار سیاست کی زد میں ہیں۔وہی فنکار منظر عام پر آتے ہیں جن تعلق برسر اقتدار سیاست دانوں اور ادب کے ٹھیکیداروں سے ہے۔برسبیل تذکرہ ہمارے ملک میں سرکاری اعزاز و انعامات ادب کے فنکاروں کو ملتے نہیں کم ہیں لیکن حاصل زیادہ کئے جاتے ہیں۔اس سلسلے میں تعلقات ہونا بہت ضروری ہیں۔غالبؔ کے دور میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔اس کا اندازہ غالبؔ کے اس درد

بھرے شعر سے لگایا جاسکتا ہے:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے شعار میں معنی نہ سہی (۸۱)

حیرت کی بات یہ ہے کہ غالب آج بھی زندہ ہیں اوران درباری لوگوں کا نام ونشان نہیں۔آج ادب کے فروغ کے لئے سرکاری سطح پر جو ادارے قائم کئے گئے ہیں ان سے ادب کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو رہا ہے۔بہر حال عرشؔ کی گہری نظر کو جگہ جگہ سراہنا پڑتا ہے۔اگر چہ ان کی صاف گوئی ان کے لئے نقصان دہ تھی لیکن پھر بھی وہ اس پر قائم رہتے تھےاور زندہ دلی سے اس کا اظہار اپنی شاعری میں کرتے تھے۔وہ کس جرات اور بے باقی کے ساتھ یہ قطعہ پیش کرتے ہیں:

شعر سر تال میں جو پڑھتے ہیں داد و تحسیں انہیں کی باندی ہے
فن سے یکسر وہ بے نیاز سہی آج انہیں شاعروں کی چاندی ہے (۸۲)

یہ حقیقت بھی ہے کیوں کہ آج ہمارے ملک میں گلے باز شاعروں کی ہی چاندی ہے۔ایسے گلے باز شاعر اور شاعرات دوسرے شاعروں کا کلام پڑھنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔اس کا ایک ردعمل یہ بھی ہو کہ سامعین کا شعری ذوق بھی پست ہوتا جا رہا ہے۔اس طرح یہ سطحی شاعری کا دور بن کر رہ گیا ہے۔اس سے اردو زبان کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے لیکن اس کا کوئی حل بھی نظر نہیں آتا اور یہ صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔سرکاری اداروں میں ادب کے فروغ کے لئے کمیٹیاں قائم کی جاتی ہیں اوران میں انہیں لوگوں کو شامل کیا جاتا ہے جن کی رسائی برسر اقتدار لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے اور جو اچھے ادیب و شاعر ہوں وہ یکسر نظر انداز کر دئے جاتے ہیں۔

عرشؔ صہبائی کے ہر قطعے میں کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور ملتی ہے۔انہوں نے قطعات نے اپنی ذاتی زندگی میں رونما ہونے والے مصائب وآلام ودرد و جواز اپنی شاعری کے توسط سے پیش کیا ہے لیکن ان کی شاعری میں جذبے اور احساس کی شدت ہونے کے باوجود بھی ایک ضبط،اعتدال اور ٹھہراؤ ہے۔ان کے ضبط واعتدال کی ایسی کیفیت ان کے ہم عصر شعرا کے کلام میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ان کے قطعات میں انسانی ہمدردی کا جذبہ بڑی شدت سے پایا جاتا ہے۔عرشؔ صہبائی کا کوئی بھی قطعہ ایسا نہیں جو توجہ نہیں چاہتا ہو۔بہر حال عرش صہبائی کے مندرجہ ذیل قطعات کے ساتھ ان کی قطعہ نگاری کا یہ سلسلہ ختم کرتے ہیں:

رشک آتا ہے ان کی قسمت پر کون یہ خوش نصیب آ نکلے

دیر و کعبہ کو ڈھونڈنے والے   مے کدے کے قریب آ نکلے (۸۳)

جن کو اردو زباں نہیں آتی   فن پہ حاصل کوئی عبور نہیں

وہ بھی فضل خدا سے شاعر ہیں   گفتگو کا جنھیں شعور نہیں (۸۴)

عرشؔ صہبائی ایک جدید طرز انداز کے معروف شاعر تھے۔انہوں نے اپنی تمام شعری اصناف میں یہاں اپنے ملک کے طرز زندگی، سماج و ماحول خوبیوں اور خامیوں کی عکاسی کی وہیں اپنے ملک سے باہر کے ممالک میں ہو رہے انسانی استحصال کو بھی اپنی شاعری کے زریعے لوگوں تک پہچایا ہے۔یہ بات کوئی زبانی کلام پر مبنی نہیں بلکہ اس کے کئی ثبوت ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔عرشؔ جس وقت اپنے مذکورہ قطعات تحریر کر رہے تھے تب دنیا کے نقشے میں کئی ایسے ممالک تھے جہاں انسان زندگی ظلمت کا شکار تھی۔اگر چہ ان تمام ممالک میں ہمارا ملک ہندو ستان بھی شامل تھا لیکن ویتنام (جو 1950ء سے قبل فرانس کے ایک پروٹوکٹوریٹ کی حیثیت سے انڈو چائنا کا حصہ تھا) کو ایک الگ ملک بنانے کو خاطر مسلسل جنگی کاروایاں گھوارہ تھا۔ایسے میں عام انسانوں کے لئے کس طرح کے حالات ہونگے یہ اندازہ لگانا بھی محال ہے لیکن بالآخر 1975ء میں یہ جنگ ختم ہوئی اور ویتنام ایک الگ ملک کے طور پر متحد کیا گیا۔عرشؔ نے اپنے ایک قطعہ میں انسان کی زندگی کو ویتنام سے تشبیہ دی ہے کہ جیسے ویتنام میں راحت و مسرت کا نام نہیں ویسے ہی انسان کی زندگی بھی اس سے خالی ہے۔قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

دور تک ہیں مہیب سائے عرشؔ   کوئی دھندلی سی شام ہو جیسے

ہر خوشی پہ غموں کی ہے یلغار   زندگی ویٹ نام ہو جیسے (۸۵)

عرشؔ ایک حساس شاعر کے ساتھ ساتھ ایک زندہ دل انسان بھی تھے۔مذکورہ بالا قطعہ ان کی اسی زندہ دلی کی دلیل ہے۔ان کے متعلق پروفیسر ایس۔اے۔قاضی۔ساذ شرقی کی رائے بھی خاصی اہمیت رکھتی ہے کہ ”عرشؔ کی شخصیت ایک آئینے کی طرح ہے۔پاک اور شفاف اور یہی خوبی ان کے کالم میں بھی عکس ریز ہے۔وہ جس صنف میں بھی شعر کہیں وہ تصنع اور بناوٹ سے پاک ہوتے ہیں اسی لئے وہ قاری کے دل کو چھو لیتے ہیں۔اس بات کی بھی تعریف کرنا پڑے گی کہ عالمی سطح پر جو واقعات ہوتے ہیں عرشؔ ان سے بھی غافل نہیں۔“(۸۶)

قطعہ نگاری کے تعلق سے اردو ادب کی تاریخ میں دیگر اصناف سخن کی نسبت بہت کم ذخیرہ دستیاب

ہے۔وہ اس لئے کہ اس فن میں مشکل پسندی ہونے کے باعث بہت کم شعراء نے اس میدان میں عرق ریزی کی ہے۔لیکن کچھ شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جو مختصر انداز میں بھی اپنے فن کو بام عروج تک پہنچا دیتے ہیں۔ جناب عرشؔ صہبائی کی شخصیت بھی اس قوم کے مشابہ نظر آتی ہے۔ان کی قطعات کی تعداد تو مختصر ہے لیکن وہ حق پرستی، وضع داری، انسان دوستی، کردار سازی، اخلاقی قدروں اور زندگی کی تہہ دار پرتون کو اجاگر کرتے ہیں۔وہ سادہ، سلیس اور عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہیں اور الفاظ کی بناوٹی قدروں اور مشکل پسندی سے موضوع کو بوجھل نہیں ہونے دیتے۔وہ مضامین کے بیان میں سادگی وسلاست ومتانت سے کام لیتے ہیں۔ان کی قطعہ نگاری میں ماضی کا کرب بھی موجود ہے اور حال کے تقاضوں کی بازیافت بھی۔بحیثیت مجموعی عرشؔ ایک زندہ دل شاعر تھے۔وہ حقائق زندگی سے پوری طرح واقف تھے۔ان کی کلام میں اعلیٰ انسانی قدروں کی حلاوت موجود ہے۔حقیقت نگاری، زبان کی سادگی، وسیع النظری، بلند خیالی، فراخ دلی ان کی قطعہ نگاری کی اہم خصوصیات ہیں۔مذکورہ بالا تفصیل سے یہ واضع ہوجاتا ہے کہ عرشؔ صہبائی ایک کامیاب قطعہ نگار ہیں اور ان کی قطعہ نگاری عصر حاضر کے تقاضوں کو بہ طرز احسن پورا کرتی ہے۔

عرشؔ صہبائی دور حاضر کے ایک مقبول شاعر تھے۔ان کی شاعری ملک وقوم کے سیاسی، سماجی، معاشی، علمی وادبی مسائل کی فراوانی ہے۔ان کا مطالعہ وسیع اور ذہن باشعور تھا۔وہ کائنات کے ہر گوشے کا بغور مطالعہ کرتے اور نظریہ فکر سے تاباں کردیتے تھے۔ان کی شاعری میں نئے موضوعات کا انتخاب قابل ذکر ہے جس سے ان کی شاعری میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ان کی نظم اور قطعہ نگاری کے علاوہ دوہا نگاری میں قدیم و جدید رنگ کا امتزاج انفرادی شان وشوکت کے موجود ہے۔وہ نظم وقطعہ نگاری کی طرح اپنی دوہا نگاری میں بھی اپنے مخصوص انداز فکر کی بدولت واحد مقام رکھتے ہیں۔عرشؔ صہبائی نے اگرچہ غزل، نظم، دوہا اور قطعہ وغیرہ کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کے یہاں صنف غزل کے بعد ماسوائے دوہا کے کسی بھی صنف پر کوئی مکمل شعری مجموعہ نہیں ملتا ہے۔ان کے اردو دوہوں کا مجموعہ 2009ء میں منظر عام پر آیا، جس کی بے حد پذیرائی ہوئی، بلکہ بہت کم عرصے میں ان کے دوسرے شعری مجموعے کی طرح کامیاب ہوگیا۔ان کے اردو دوہوں کا مجموعہ ''تجھ بن چین کہاں'' کے نام سے مانوی پرکاشن، پنج تیرتھی، جموں نے شائع کیا جسے ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ نے مرتب کیا تھا۔اگرچہ عرش صہبائی بنیادی طور پر غزل کے شاعر کے طور جانے جاتے ہیں لیکن انھوں نے نظم، قطعات اور دوہا میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔شاعری کی ہر صنف میں بلند ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔یہاں

تک دوہے کہ بات ہے توانہوں نے اس کا مزاج ہی بدل ڈالا ہے اس لئے جوان دوہے پڑھنے سے قاری یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دوہا اردو شاعری کی ہی صنف ہے۔اس بات کو کسی صور بھی نظر انداز نہیں کیا سکتا کہ شاعر کی دوسری اصناف جن میں انہوں نے شاعری کی ہے دوہوں میں بھی فنی لوازمات کے ساتھ ساتھ ان جیسی ہی شعریت ہے۔حق بات یہ ہے کہ ان کے دوہوں پر غزلیت چھوئی ہوئی ہے۔انفرادیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔عرشؔ صہبائی کے دوہوں پر مجنوںؔ گورکھپوری کی مندرجہ ذیل آرا صادق آتی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ ''چھوٹی چھوٹی سادہ اور شگفتہ بحروں میں بجائے خود گداز اور بے ساختہ پن ہوتا ہے جس کا دوسرا نام تغزل ہے.....شگفتگی اور خود گزاشتگی ،انہماک اور محویت، خستگی اور رنجوری سے تغزل کا خمیر ہوا ہے۔آپ ان چیزوں میں جتنی شان نئے انداز، نئے تیور پیدا کر سکتے ہوں، پیدا کیجئے لیکن یہ یاد رکھئے کہ جہاں اس کا فقدان ہوا وہاں تغزل کا فقدان ہوا۔''(۸۷)

اس وقت ہم عرشؔ صہبائی کے اردو دوہوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ان کا بیشتر کلام خواص وعوام میں بے حد مقبول ہے۔اردو کے بیشتر رسائل میں ان کے کلام کا حوالہ مل جاتا ہے۔دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں کی شعری محفلوں میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔اتنی شہرت کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو صرف عرشؔ صہبائی کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ان کی زندگی میں ''انا'' نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔اس بات کا ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ ان کی حیات میں بے شمار شعراء ان کے دامن ادب سے جڑے ہوئے تھے لیکن حیرت کا مقام ہے کہ کبھی اس کا ذکر نہیں کرتے اور دریافت کرنے پر کہتے تھے کہ وہ خود ایک طفل مکتب ہیں۔کئی مشاعروں میں مشاعرہ ختم ہونے کے بعد ان سے دریافت کیا گیا کہ آیا وہ خود عرشؔ صہبائی ہیں یا ان کا کلام پڑھ رہے ہیں۔یہ بات ان کی سادگی کی غماز تھی۔اگرچہ میں اس بات کے حق میں نہیں کہ شاعری میں شاعروں کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا جائے لیکن ایسے مضامین میں یہ عمل ضروری ہو جاتا ہے، ورنہ کسی شاعر کا مقام متعین نہیں ہو سکتا۔موازنہ کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ شاعر کی خوبیاں اور خامیاں دونوں سامنے آتی ہیں۔''تجھ بن چین کہاں'' کے مرتب ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ نے عرض مرتب میں اس بات کا خاص طور سے ذکر کیا ہے کہ ''میں یہ بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ زیر نظر مجموعہ میں شامل جہاں دوہوں میں نئے مضامین ہیں وہاں انداز بیان بھی الگ رنگ لیے ہوئے ہے۔ ان دوہوں میں غزلیت بھی ہے جس نے ان دوہوں کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔''(۸۸)

اس حقیقت کا دل سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے دوہوں میں کئی ایسے پہلو ہیں جو کئی دوسرے

شاعروں کے دوہوں میں نظرنہیں آئیں گے۔اس کے پیشِ نظر ہی ان کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔عرشؔ صہبائی اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ ان کی یہ صلاحیت قدرتی ہے ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب شاعر کی طبیعت میں آمد ہو۔شعراس سے اپنے آپ کہلوالیتا ہے اسے کہنا نہیں پڑتا ورنہ وہ ایسا شاعر کہلائے گا جس کی طبیعت میں آورد ہو۔ایسے شاعروں کی اردوشاعری میں کھوج ہے۔عرشؔ صہبائی اکثر مشاعروں میں یہ بات بڑی دلیری سے کہا کرتے تھے کہ ہے ریاست جموں وکشمیر میں ہی نہیں بلکہ بیرون ریاست میں بھی زیادہ ترشعرا تخلص کے گنہگار رہیں اور یہ حقیقت بھی ہے ایسے گنہگاروں کا آج بول بالا ہے۔یہاں عرشؔ صہبائی شعر میں ''کیا کہا؟'' کے بہ نسبت ''کیسے کہا؟'' کوزیادہ اہمیت ہے۔''کیسے کہا؟'' کووہ فنی لوازمات سے وابستہ کرتے ہیں۔ وہ غزل ہو،نظم ہو،قطعہ ہو یا دوہا۔ان کا یہ خیال ہرجگہ پورا اترتا ہے۔فنی لوازمات شعریت کا باعث بنتے ہیں اور کلام ذہن ودل دونوں پراثر انداز ہوتا ہے۔ورنہ کلام تبلیغی کلام تک محدود ہو کے رہ جاتا ہےاورسوچ کی حد سے باہرنہیں نکل پاتا۔جموں کشمیر کے اردوشعری ادب کی اگر بات کریں تو دور دور عرشؔ صہبائی کے علاوہ کسی ایسے شاعرکا نام نہیں ملتا جس کے ہاں دوہے کا کوئی مجموعہ ملتا ہو۔ان کے علاوہ جوبھی شعراء کے ہاں دوہے ملتے ہیں وہ اکثر ان شعراء کے ہیں جنہوں نے محض اردودوہے کی تاریخ میں اپنا نام درج کرانے کی غرض سے کچھ کچھ دوہے ضرور کہے ہیں لیکن انہیں دوہے کی فنی باریکیوں کے ساتھ اگر پرکھا جائے تو وہ دوہا کم سری چھند، چھپند زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔

دوہا چوں کہ غزل کے مطلع کے مشابہ ایسی صنف ہے جو ہندی ادب کی صنف ہے جس میں ہندی و سنسکرت کی گن گرج دیکھنے کوملتی ہے۔عرشؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دوہوں میں اردواسلوب کے ساتھ ساتھ اردووہندی دونوں زبانوں کے الفاظ کا خوب استعمال کیا ہے۔انہوں نے اسے ایسے انداز میں اپنا ہے کہ جیسے وہ ہندی نہیں بلکہ اردوادب کا حصہ ہے۔ ماضی میں دوہے کی توسیع وفروغ اولیااللہ،شعراءاورسادھو سنتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے لیکن باوجوداس کے اردودوہے وہ وقار حاصل نہیں ہو پایا جودوہے کے علاوہ اردوشعری اصناف کو حاصل ہے۔اردودوہے میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں ہیں۔عصر حاضر میں بھی آج کے دوہا نگاردوہے کوعظمت واپس دلانے کے لئے متحرک،سرگرم عمل اورفعال نظر آتے ہیں۔ جمیل الدین عالیؔ کا نام بالخصوص اس لئے بھی محترم ہے کہ انہوں نے ایسے وقت میں دوہے کہے کہ جب گیت اور دوہے کوگھٹیا سمجھ کر رسائل وجرائد میں شائع بھی نہیں کرتے تھے۔انہوں نے دوہوں کے دومجموعے شائع

کر کے دوہے کو اردو ادب میں روشناس کرایا لیکن ان سے زبردست غلطی یہ سرزد ہوئی کہ وہ اپنے دوہوں میں دوہے کہ بحر و وزن اور ماترائی نظام سے مطابقت پیدا نہ کر سکے۔انہوں نے ۱۳+ ۱۲ کے بجائے ۱۶+۱۱ ماتراؤں میں دوہے تخلیق کئے جب کہ یہ دوہے کے نام پر سرسی چھند کا وزن ہے۔ان کی اسی غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اتباع و تقلید کرنے والے بھی غلط راہ میں پڑ کر دوہے کے نام پر سرشی چھند تخلیق کرنے لگے جب کہ بھگوان داس اعجازؔ، ڈاکٹر فراز حامدیؔ، ظہیرؔ غازی پوری اور عرشؔ صہبائی کہ خوبی یہ ہے کہ انہوں نے دوہے کو دوہے کے حقیقی بحر و وزن اور متعینہ گیارہ ماتراؤں کی مطابقت سے کھرے دوہے تخلیق کئے۔آج انہیں کی وجہ سے کھرے اور صحیح الوزن دوہے تخلیق کرنے والوں کی ایک بھیڑ ہمارے سامنے موجود ہے۔عصر حاضر کے ان دوہا نگاروں کے بہت سے ناموں میں انورؔ شیخ، منورؔ احم کنڈے، اسحاق ساجدؔ، رفیق شاہینؔ، رئیس الدین رئیسؔ، قاضی رئیسؔ، انور شمیم انورؔ، ڈاکٹر نذیرؔ فتح پوری، اسلم حنیفؔ، وزیرؔ آغا، منزلؔ لوہاٹھیری، سراجؔ انور مصطفیٰ آبادی، ڈاکٹر ظفرؔ قدوائی، مختارؔ ٹونکی، علامہ شارقؔ، جمال شارق عدیلؔ اور مناظرؔ عاشق ہرگانوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ بھی کئی ایسے شعراء ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی غرض سے دوہے ہیں۔

عرشؔ صہبائی نے دوہوں کو ایک پہچان دی ہے۔ان میں ان کے دوسرے کلام کی طرح پاکیزگی اور صاف گوئی دونوں وصف موجود ہیں۔کہیں بھی سطحی پن کا احساس نہیں ہوتا۔ان کے دوہے پڑھنے سے قاری کو یہ احساس ہوگا یہ چاہے کوئی بھی خیال یا مضمون ہو عرشؔ اسے بہتر انداز میں کہنے کی مہارت رکھتے ہیں۔چند دوہے ملاحظہ کیجئے:

آنکھوں سے آنسو روا دل بھی ہے مغموم
کیوں اتنا مایوس ہوں مجھے نہیں معلوم(۸۹)

اک پل بھی ان کے بنا دل یہ چین نہ پائے
یوں بھی ہوا ہے وہ برسوں یاد نہ آئے(۹۰)

دل میں جتنے زخم ہیں بہتر ہے نہ کرید
ان زخموں میں بند ہیں آپس کے سو بھید(۹۱)

یہ دوری برحق مگر اتنا رہے خیال
دل کے رشتے ٹوٹ کر ہوتے نہیں بحال(۹۲)

جہاں عرشؔ کے دوہوں میں واردات قلب اور جذبات کی شدت ہے۔انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ان کے دوہوں میں اور نئے نئے مضامین ملیں گے جن کا تعلق براہ راست زندگی سے ہے۔عرشؔ صہبائی بھی ایک عام انسان ہین لیکن زندگی کے بارے میں ان کے تجربات ومشاہدات عام لوگوں سے بہت مختلف ہیں۔موصوف زندگی کے ہر پہلو میں انفرادیت رکھتے ہیں۔مثلاً:

دل میں کوئی آرزو اور نہ کوئی آس
جیسے ہو یہ زندگی برسوں کا بنواس(۹۳)

ہم ہیں شبنم کی طرح جب نکلے گی دھوپ
ہوں گے اور ہی رنگ میں ہوگا اور ہی روپ(۹۴)

عرشؔ صہبائی کے دوہوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ان کی انفرادیت کا اس لئے بھی احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے کامیابی کے ساتھ خالص اردو دوہے تخلیق کیے ہیں اور یہ ثابت کر کے دکھایا ہے کہ دوہے میں اگر ہندی کے ساتھ ساتھ اردو الفاظ بھی شامل کر دئے جائیں تو اس سے نہ تو دوہے کی غنائیت متاثر ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا آہنگ مجروح ہوتا ہے۔انہوں نے جمیل الدین عالؔی اور دیگر شعراء کے طرح محنت سے دوہے نہیں کہے بلکہ ان کے اندر ایک کسک نے ان سے دوہے کہلوئے ہیں۔عرشؔ صہبائی کا نام اردو دوہے کی تاریخ میں ایک اہم نام قرار دیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے دوہے میں تجرباتی اور اختراعی نوعیت کے حیرت انگیز کارنامے انجام دئے ہیں جن سے دوہا نشاۃ ثانیہ کی معراج پر پہنچ گیا ہے۔انہوں نے جموں کشمیر کے اردو ادب میں نہ صرف اردو دوہے کو جنم دیا بلکہ ملکی اور غیر ملکی اصناف سخن میں دوہے کا تصرف کر کے اور اپنی اختراعات اور ایجادات کے بل پر دوہے کو متعدد اصناف کا قالب عطا کر دیا ہے۔عرشؔ صہبائی کے دوہوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں عربی و فارسی کے الفاظ کا استعمال بہت کم ملتا ہے انہوں نے خالص اردو اور ہندی کے الفاظ کے میل جول کے ساتھ اپنے دوہوں میں خوش آہنگی اور نغمگی پیدا کی ہے:

ایک ذرا سی ٹھیس سے ہوجائے مسمار
کہنے کو مضبوط ہے، رشتوں کی دیوار(۹۵)

پیش کروں جذبات کی یہ روشن قندیل
اس سے ملنے کی اگر نکلے کوئی سبیل (۹۶)

دیکھنے والوں کا اگر اعلیٰ ہو معیار
دنیا کی ہر چیز ہے خود میں اک شہکار(۹۷)

عرشؔ کے دوہوں سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ موصوف فن سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی ہر بات دل کو چھوتی ہے کہ انسان کو ذہنی طور پر صحت مند ہونا چاہیے۔ اسی صورت میں تعمیری نظریہ (Constructive attitude) کے تحت خود بھی جی سکتا ہے اور دوسروں کو بھی راہ پر گامزن ہونے کی تحریک دے سکتا ہے۔ جو لوگ ان کے قریب ہیں وہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان کا قول و فعل ایک سا تھا۔ اس میں فنی خوبیاں بھی شامل ہیں اور فنی خامیاں بھی جبکہ آج کے دور میں اکثر بے ہنگم شعر سننے کو ملتے ہیں۔ عمر رسیدہ شعرا بھی فنی خامیوں سے دوچار نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو زبان زوال پذیر ہو رہی ہے۔ ایسے شاعروں کی تعداد بہت کم ہے جو معیاری کلام کہتے ہیں۔ اکثر شعراء ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' کے مصداق اس میدان میں عمل پیرا ہیں۔ اس سے شاعری ہی نہیں متاثر ہو رہی بلکہ زبان بھی متاثر ہو رہی ہے۔ بلکہ عرشؔ صہبائی نے یہاں تک کہہ دیا ہے:

مدھم اس کی روشنی، ڈھلنے لگی ہے شام
اردو کا رہ جائے گا بس دنیا میں نام(۹۸)

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کی اعلیٰ قدریں ختم ہوتی جا رہی ہیں اور ''شعر برائے شعر گفتن'' کا رواج عام ہے۔ عرشؔ صہبائی اپنی راہ کے تنہا مسافر تھے۔ وہ صرف شاعری کی اعلیٰ قدروں کا ہی نہیں بلکہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کا بھی احترام کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اس قول پر قایم تھے کہ اچھا انسان ہی اچھا فنکار بن سکتا ہے۔ عرشؔ صہبائی کی ذاتی زندگی کو ان کی شاعری سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چاہے وہ ان کی کوئی بھی صنف ہو ان کی شاعری میں ان کی زندگی کا عکس ہے۔ دوسرے معنوں میں ان میں شدت احساس ہے۔ کسی شعر میں بھی کسی قسم کی مبالغہ آمیزی نہیں ان کا کلام پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے کہ اس میں اس کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تمام زندگی (اس وقت تک) تلخ حادثوں سے گزری ہے لیکن

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے مسکراتے ہوئے تمام حوادث کا سامنا کیا ہے۔ان کے چہرے پر ایک دائمی مسکراہٹ رقص کرتی رہتی تھی جس سے دوسروں کو بھی زندہ رہنے کی تحریک حاصل ہوتی تھی۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے وہ اسے عبادت تسلیم کرتے تھے۔ مجھے عرشؔ کا شناسا اور ذاتی طور پر واقف کار ہونے پر فخر ہے۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ زیر نظر مضمون صرف ان کے اردو دوہوں تک محدود ہے اس کے باوجود ان میں جو دوسری خوبیاں ہیں ان کا ذکر کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کیونکہ ان کی انسانی خوبیوں کا ان کے کلام پر گہرا اثر ہے۔

جن کا کوئی اصول ہے جو اس کے پابند
ڈھونڈیں تو ڈھونڈیں کہاں ایسے لوگ ہیں چند(۹۹)

اپنے کسی اصول پر کبھی نہ ٹھہرے لوگ
جتنی سادہ صورتیں اتنے گہرے لوگ(۱۰۰)

میری یہ پہچان ہے اتنی سی ہے دلیل
میں اس میں تحلیل ہوں وہ مجھ میں تحلیل(۱۰۱)

کتنی قومیں ہیں یہاں فرقے اس پہ انیک
حیرت ہے اس بات پر لہو کا رنگ ہے ایک(۱۰۲)

عرشؔ صہبائی کے دوہوں کے جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے ان کا انداز بیان مرغوب کرتا ہے۔ وہ دوہا ہو یا غزل، یا نظم یا اور کوئی صنف وہ فن کو ترجیح دیتے تھے۔ان کے کلام میں یہ نمایاں خوبی ہے۔ اس کا اعتراف اردو کے قدآور شعرائے کرام نے بھی کیا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ موصوف اردو شاعری میں ایک استاد شاعر کے طور پر شہرت حاصل کیے ہوئے تھے۔اس کے جواز میں کئی مشہور رسائل و جرائد میں شائع شدہ مضامین وخطوط مل جائیں گے۔لیکن حیرت ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو تمام عمر ایک طالب علم تسلیم کیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروریؔ نے ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بڑی گہری اور حقیقت پر مبنی بات کہی ہے تھی۔ وہ کہتے ہیں ”مثلاً غالبؔ کی طرح جو زندگی کو بند غم جانتے ہوئے بھی ایک عملی مفکر

کی طرح اس کے امکانات سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے اور اسے عدم زندگی پر بہرحال فوقیت دینے پر مجبور تھے۔عرشؔ بھی زندگی میں تلاش راحت وعشرت میں ناکام رہ کر بھی زندگی کے قدردان ہیں۔‘‘(۱۰۳)

سروریؔ صاحب نے چند سطور میں عرشؔ صہبائی کی زندگی کا پورا تجزیہ کر دیا ہے۔ان کے بارے میں کس کس شخصیت کی رائے کا ذکر کیا جائے۔مختصراً الفاظ میں بقول شاذؔ شرقی عرشؔ جتنے اعلیٰ شاعر ہیں اتنے اعلیٰ انسان بھی ہیں۔عرشؔ صہبائی کے قدردانوں کا کس قدر وسیع حلقہ ہے آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔جناب جسٹس آر۔پی سیٹھی (مرحوم) سابق جج سپریم کورٹ آف انڈیا کی اس رائے کو کسی صورت بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔وہ لکھتے ہیں:

عرشؔ صہبائی محض ایک فرد نہیں بلکہ تحریک اردو ادب کے چند سربراہوں میں سے ہیں جن پر نہ صرف ریاست جموں وکشمیر کی عوام فخر کرتے ہیں بلکہ پورا برصغیر ہند و پاک ان کی شاعری سے معطر ہے۔وہ محض ایک عام شاعر نہیں بلکہ وہ آج اردو شاعری کی جان ہیں۔وہ ایک پرخلوص اور مرنجان مرنج ہستی ہونے کے علاوہ آج کے دور کی شاعری کے بے تاج بادشاہ ہیں۔اس کے میر کارواں ہیں۔عرشؔ بلاشبہ ان چند شاعروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں جو آج کے نامساعد حالاتوں اور اردو زبان کی کسمپرسی کے دور میں اردو شاعری کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے بادِمخالف کی پرواہ کیے بغیر شمع ادب اور ثقافت کے پرچم کو بلندیوں کی طرف لے جانے میں گامزن ہیں۔(۱۰۴)

عرشؔ صہبائی بلاشبہ ان چند شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں جو آج کے نامساعد حالات میں اردو زبان کی کسمپرسی کے دور میں بھی اردو شاعری کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے بادمخالفت کی پرواہ کیے بغیر شمع ادب و ثقافت کے پرچم کو بلندیوں کی طرف لے جانے میں گامزن ہیں۔موصوف جدید شاعری کے کٹر مخالف تھے۔اس کے باوجود وہ خود ایک جدید شاعر تھے۔ان کی شاعری کی کوئی صنف ہو اس سے جدت جھلکتی ہے۔جس کا ایک خاص انداز ہے اور ذہن ودل دونوں کو قبول ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ ان کی نظر میں آج کی جو جدت ہے وہ بے معنی اور مضحکہ خیز شاعری ہے۔اس قسم کے اشعار کا حوالہ دینا قیمتی صفحات کو ضائع کرنے والی بات ہوگی۔یہاں ان کے دو عدد دوہے تحریر کیے جاتے ہیں کیونکہ ان کا ذکر جناب ظہیرؔ غازی پوری کے ’’اردو دوہے ایک تنقیدی جائزہ‘‘ میں ملتا ہے۔ظہیرؔ صاحب نے خود بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ مابعد جدید رویے اور نئی حقیقت پسندی کے غماز ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

افشا ہوگا راز یہ جب ہوگی تحقیق
میں اس کی تخلیق ہوں یا وہ میری تخلیق (۱۰۵)

ایک خوبصورت انداز بیان کے علاوہ یہ مضامین بھی شاعری میں پہلی بار آئے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک مہذب طریقے سے یہ دوہے کہے گئے ہیں۔ یہ دوہے پڑھتے یا سنتے ہی ذہن پر نقش ہوجاتے ہیں۔ ان دوہوں کی کن الفاظ میں تعریف کی جائے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دوہوں کی دنیا میں یہ دوہے نئے ہیں۔ ان کے بارے میں ابوالفصاحت قبلہ جوشؔ ملسیانی نے 1958ء میں کہا تھا کہ ''شگفتہ زمینیں تلاش کرنے اور مشکل زمینوں میں بھی اچھے اشعار نکالنے میں ان کی کوشش قابل ستائش ہے۔ کلام میں عریانی بھی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی پاکیزہ طبیعت کا رجحان عریاں مضامین سے کوسوں دور رہتا ہے۔'' (۱۰۶)

ہم جب ان کے مجموعوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے نئی زمینوں کے علاوہ نئے اشعار بھی دیئے ہیں۔ یہی صورت دوسری اصناف سخن پر بھی صادق آتا ہے جس کا ثبوت مندرجہ بالا دوہوں میں عیاں ہے لیکن یہ سلسلہ یہیں تک محدود نہیں ایسے اور کئی دوہے نظروں سے گزریں گے۔

عرشؔ صہبائی نے اپنے دوہوں میں زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی عکاسی بڑی مہارت سے کی ہے۔ وہ سادہ زبان اور عام فہم الفاظ کے ذریعے چونکا دینے والی باتیں بیان کرنے کے ہنر سے خوب آشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوہے تاثر، دلکشی اور معنویت کے اعتبار سے بہترین اور کامیاب ہیں۔ انھوں نے خوبصورت تشبیہات اور دلکش استعارات کے ذریعے اپنے دوہوں کے حسن کو دوبالا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ عرشؔ صہبائی بذات خود سرتاپا محبت کا ایک مجسمہ ہیں۔ ان کے دوہے جذبات نگاری کے چلتے پھرتے نمونے ہیں:

انتظار اس کا عبث ناحق ہے یہ آس
یہی غنیمت جانئے ہم ہیں اپنے پاس (۱۰۷)

ان نظروں کے سامنے وہی ہے صبح و شام
مر جاؤں میں لاج سے لوں جو اس کا نام (۱۰۸)
عرشؔ ضیا افروز ہیں اشکوں کے یہ چراغ
شاید دل کو مل سکے اس کا کوئی سراغ (۱۰۹)

ہم کو کیا اس سے غرض دن ہو وہ یا شام
دل میں اس کی یاد ہے لب پر اس کا نام(۱۱۰)

کون ہے ایسا جو مجھے رکھتا ہے بے حال
اکثر اپنے آپ سے کرتا ہوں یہ سوال(۱۱۱)

اپنے جذبات کے اظہار میں عرشؔ بڑی بے باکی سے کام لیتے تھے اور یہی ان کی خوبی ہے جو انہیں دوسروں سے جدا کرتی تھی ۔ وہ بڑے سے بڑی بات نہایت عاجزی سے کہہ دیتے تھے۔ مثلاً اس دوہے میں جس جذبے کا اظہار انہوں نے کیا ہے وہ کوئی بات نہیں ہے:

کاش کبھی وہ بھیجتے رسماً کوئی سلام
ہم اتنی سی بات پر بک جاتے بے دام(۱۱۲)

موصوف کے بیشتر دوہے تلخ حقائق پر مبنی ہوتے ہیں اور اس کا ذکر صرف ان کے یہاں ملتا ہے:

پینے کو پانی نہیں بجلی کا بحران
اس پر بھی کہتے رہو اپنا دیش مہان(۱۱۳)

کئی دوہوں میں زندگی کی قدروں کا بھی مؤثر ڈھنگ سے ذکر کیا گیا ہے:

بے شک تیری ذات ہے کوئی نہیں امید
اس پر بھی اے زندگی! ہم ہیں ترے مرید(۱۱۴)

تو کہنے سے پیشتر ہر اک بات کو تول
نشتر سے بھی تیز ہیں جو ہیں کڑوے بول(۱۱۵)

عرشؔ صہبائی نے صرف دوہا پر غیر معمولی توجہ دی ہے ۔ان کے دوہوں کو اردو دوہا ہی کہا جائے گا۔ انہوں نے اپنے دوہوں کو اردو دوہے کا مزاج کا مزاج دیا ہے ۔ان کے دوہے دوچھند کے اوزان میں ہیں۔ جس کی وضاحت معروف شاعر و ناقد ڈاکٹر فراز حامدی نے یوں کی ہے:

تیرہ گیارہ ماترا بیچ بیچ وشرام
دو مصروں کی شاعری دوہا جس کا نام (۱۱۶)

عرشؔ نے اپنے اردو دوہوں نہ صر ماتراؤں کا خیال رکھا ہے بلکہ دوہے کے آہنگ پر بھی گہری نظر سے

کام لیا ہے۔ان کے دوہے اوزان اور آہنگ کے لحاظ سے مکمل ہیں۔ یہ دوہے دیکھئے:

جیسے بھی حالات ہیں یہ میرا مقسوم
دل پر جو گزری ہے اسے کہاں معلوم(۱۱۷)

کس سے کہیں ہم اس طرح کیوں رہتے ہیں دور
وہ بھی کچھ مجبور ہیں ، ہم بھی ہیں مجبور(۱۱۸)

بے شک من بے چین ہو بے شک ہو یہ اداس
لیکن اس کو دیکھ کر مٹ جاتی ہے پیاس(۱۱۹)

عرش صہبائی بے شک ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔آپ کو ان کے چہرے پر بڑی افسردگی کی جھلک دکھائی نہیں دے گی۔لیکن ان کے دل کی کیفیت ان کے دوہوں سے ظاہر ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ غم پرست ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ غم کو بھی راحت کے معنوں میں لیتے ہیں۔ان کا یہ دوہا دیکھئے:

راحت سے ہیں دورتر غم کے عین قریب
اپنی فطرت مختلف اپنے شوق عجیب(۱۲۰)

زندگی گزارنے کا ان کا اپنا انداز الگ ہے۔وہ جس ماحول میں رہتے تھے اس کی ترجمانی کرنے سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے۔حق پرستی اور صاف گوئی ان کا شیوہ ہے۔وہ کہتے ہیں:

کوشش کر کے دیکھئے شاید آئے یاد
کل تک راون ایک تھا آج ہے لاتعداد(۱۲۱)

اس سے زیادہ صاف گوئی کی مثال اور کیا ہوگی۔زندگی کرنے کی کوئی صورت ہو لیکن وہ حوصلے سے کام لیتے ہیں:

گزری ساری زندگی پھر بھی آئی نہ راس
ہم اتنی سی بات پر ناحق رہے اداس(۱۲۲)

عرش صہبائی زندگی میں دوسروں کی رہنمائی بھی کرتے نظر آتے ہیں:

دل آمادہ ہو اگر ان سے کرنا پریت
امن، محبت، عاجزی، جیون کا سنگیت(۱۲۳)

یہ دوہا بھی خوب ہے:

کس درجہ دشوار تھی جینے کی ہر راہ
پھر بھی تجھ سے زندگی ہم نے کیا نباہ(۱۲۴)

یہ دوہا بھی حقیقت پر مبنی ہے:

مہر و وفا دو لفظ تھے یہ ہے پرانی بات
ان کی جگہ پر آگئے اب تو دھوکہ گھات(۱۲۵)

موصوف دوہوں میں جو زبان استعمال کرتے ہیں اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ اردو ہو یا ہندی انھیں دونوں پر دسترس حاصل ہے جبکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے پیش نظر اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری چاہے وہ کسی صنف میں ہو سب سے الگ ہے۔ وہ جس حوصلے سے زندگی میں کام لیتے ہیں اس کا اظہار ان کے کلام میں ملتا ہے۔ یہ دوہا توجہ طلب ہے:

ہم اس کا رخ موڑ دیں جس سے بھی ٹکرائیں
ہم کوئی تنکا نہیں ہوامیں جو اڑ جائیں(۱۲۶)

عرشؔ صہبائی کے دوہوں کا جائزہ لیتے وقت ایک بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان میں غزلیت کا رنگ غالب ہے۔ جس کے سبب غزل کی شعریت پیدا ہوگئی ہے جو قاری کے ذہن و دل دونوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور دوہے ازبر ہو جاتے ہیں۔ علامہ نیازؔ فتح پوری نے شاعری کی کامیابی کا ایک سبب تغزل بھی بتایا ہے۔ بقول ان کے: ''چونکہ شعر کی پوری قوت کا اندازہ صرف احساسِ تاثر کے عالم میں ہوسکتا ہے جس کو مادیات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ شرق و غرب ہر جگہ جس صنف کی ترقی ہوئی، جس کی قدر کی گئی وہ وہی ہے جسے تغزل یا عزامی (Anatomy or Exotic) شاعری کہتے ہیں۔''(۱۲۷)

عرشؔ صہبائی نے جہاں ایک طرف قافیہ اور ردیف کی پابندی کی ہے وہیں دوسری طرف ہندی الفاظ کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ مثلاً وشرام، بھیس، امنگ، پریت، راکھ، میت، جھنکار، دام، ادھورے، جاپ، آس، گوری، پات، شمشان، باش، سنجوگ، اوب، انمول، ماند، سنگ، وردان، سمان، گیان، مات، نکیل، رکھیل، پٹوار، بول، ٹھیس، دھام، انگ، دوش، روگ، بلوان، سوگ، دیش، ویر، پال، راگ، تفنگ، سوگند، تال، کنیادان، سنگیت، بان، نینوں، انمول وغیرہ۔ اس کے علاوہ انھوں نے دوسری اصناف میں بھی ہندی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے اردو شاعری میں فراق کے بعد سب سے زیادہ ہندی الفاظ کا

استعمال عرشؔ صہبائی نے کیا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ان کے یہاں خالص اردو دوہے بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ان کے مختلف موضوعات پر مشتمل چند منتخب دوہے پیش ہیں:

نہیں پڑھوسی کا یقیں سمجھو اس کے ڈھنگ
امن کی بات چھوڑیئے سر پہ کھڑی ہے جنگ(۱۲۸)

بارش سے محروم ہو جیسے سوکھا کھیت
وہ دریا کی موج ہے میں صحرا کا کھیت (۱۲۹)

اس دور جمہور میں یہ دل چین نہ پائے
جیسے چاروں سمت ہوں بد روحوں کے سائے (۱۳۰)

ہر لمحہ کرتے رہے حق گوئی کا جاپ
اس طرح ہم بن گئے اپنے دشمن آپ(۱۳۱)

انسان کی یہ زندگی ایک شکستہ ناؤ
دیکھیں لے جائے کہاں وقت کا تیز بہاؤ(۱۳۲)
اس پر اثر انداز ہے مغرب کا ہر رنگ
مشرق کی تہذیب کو جیسے لگا ہو زنگ(۱۳۳)

کون ہے دنیا میں بڑا کس کی چھوٹی ذات
سب کی اپنی اہمیت کیا کانٹے کیا پات(۱۳۴)

رہنے کو ہیں کھونپڑے محلوں کے ہیں خواب
ہر مفلس کے ذہن پر بکھرے کئی سحاب(۱۳۵)

عرشؔ کی شاعری آمد کی شاعری ہے۔ان کی شاعری میں ہمیں رنگ رنگ کے متنوع مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری کو عشق و عاشقی تک ہی محدود نہیں بلکہ زندگی کو اس کے جملہ پہلوؤں کے ساتھ شاعری کے کینواس پر منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے شعری شگوفوں میں عصری حسیات کی مہک شامل

ہے۔وہ جو کچھ بھی دیکھتے تھے یا ان پر جو کچھ بھی گزرتی تھی وہ اسے عقل کے میزان پر رکھ دیتے تھے اور نجی تجربات کی روشنی میں اس کی قیمت آنکتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے مشاہدے اور تجزیے ہی بعد میں ان کے تجربات بن جاتے تھے۔ان کے متنوع احساسات و تجربات کو ہم ان کے دوہوں کے حوالے سے بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ان کے حساس اور غور و فکر انداز کا ملاحظہ ہو:

سوچ رہا ہوں کس طرح کشتی ہوگی پار
اک جانب طوفان ہے اک جانب منجدار (۱۳۶)

جھوٹ کبھی سچ بن سکے کوشش ہے بے کار
اک پل میں گر جائے گی ریت کی دیوار (۱۳۷)

کس درجہ محدود ہے سوز ہو وہ یا ساز
جیسے ہو یہ زندگی گنبد کی آواز (۱۳۸)

دل بھی کشادہ چاہیے اور کشادہ سوچ
آپ کو ہر اک بات میں کرتے ہیں سنکوچ (۱۳۹)

دل میں جتنے زخم ہیں بہتر نہ کرید
ان زخموں میں بند ہیں آپس کے سو بھید (۱۴۰)

دل میں شک درد ہو غم کا ہو طوفان
اس پر بھی قائم رہے ہونٹوں پر مسکان (۱۴۱)

یہاں تو انسان کا کوئی چلتا نہیں ہے زور
کب ٹوٹے کچھ پتہ نہیں سانسوں کی یہ ڈور (۱۴۲)
اپنی آنکھوں میں لگا ان کے پاؤں کی دھول
دنیا میں حق کوئی کے لئے گئے جو پھانسی جھول (۱۴۳)

عرش صہبائی کے دوہوں میں جو اہم بات ہے وہ خیالات کی پاکیزگی ہے۔یہ سطحی پن سے بہت دور ہیں

اور انھیں پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ خیال کہاں سے آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ دوہا دوہوں کی دنیا میں اضافہ ہے۔ خیال کے علاوہ جس طرح سے اسے بیان کیا گیا ہے وہ الگ سے غور طلب ہے:

اتنا گہرا زلزلہ کوئی نہیں آواز
جب انسان کے جسم سے روح کرے پرواز (۱۴۴)

موت کو حاصل برتری اس کے ہاتھ نکیل
ایسے ہے یہ زندگی جیسے کوئی رکھیل (۱۴۵)

اس طویل تبصرے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرشؔ یہاں اردو غزل کو نئے اشعار دیئے، نئی نظمیں دیں، وہیں اردو ادب کو نئے دوہے بھی عطا کئے ہیں۔ عرشؔ کے ابھی کچھ دوہوں کو زیر بحث لا گیا ہے لیکن پھر بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں انسان کے دکھ درد، زندگی کے گہرے انوکھے اور مختلف تجربات کس طرح ان کی شاعری میں ہیرے موتیوں کی طرح جگمگاتے نظر آتے ہیں۔

بالآخر یہ بات کہی جا سکتی ہے ہر شاعر پر لکھنے والا اپنے مضمون میں یہی کہتا ہے کہ فلاں شاعر کے یہاں انفرادیت ہے، فلاں کے یہاں تجربات، مشاہدات ہیں، انوکھا پن ہے وغیرہ لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہر فنکار کی اپنی الگ شخصیت ہوتی ہے۔ ہر شخص کے بات کرنے کا انداز جدا ہوتا ہے، عادتیں جدا ہوتی ہیں اگر صورت مل بھی جائے تو دل جدا ہوتے ہیں، طبیعت جدا ہوتی ہے، اس کی سوچ، فکر، تصور جدا ہوتا ہے اور یہی بات شاعری میں بھی لاگو ہوتی ہے۔ مانا کہ زیادہ تر شعراء ایک ہی رنگ الاپنے میں مشغول ہوتے ہیں لیکن پھر بھی کچھ تو انفرادیت ہوتی ہے اور وہ ہوتی ہے شاعر کی شخصیت کی چھاپ جو ہر فنکار میں جد ہوتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جیسی شاعر کی شخصیت ہوگی ویسا ہی اس کا فن ہوگا۔ عرشؔ صہبائی ایک با خلاق، بلند کردار شریف النفس رکھ رکھاؤ کے پاس دار تھے اور یہی خوبیاں ان کی شاعری میں نمایاں ہیں۔ خاص طور پر دوہا نگاری کے فن میں وہ اور بھی کھل کر سامنے آ گئے کہ پوری انسانی تہذیب کے ورثے کو ان میں سمونے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

حواشی:

۱۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص ۱۳،

۲۔ ایضاً ص، ۱۳۔۱۴

۳۔ ایضاً ص،۱۴

۴۔ ایضاً ص،۱۴

۵۔ ایضاً ص،۱۴

۶۔ ایضاً ص،۱۵

۷۔ ایضاً ص،۱۵

۸۔ ایضاً ص،۱۵

۹۔ سید خورشید کاظمی، مغنی حیات عرش صہبائی، سرینگر کشمیر: میزاں پبلشر، ۲۰۱۸ء، ص،۹۱

۱۰۔ عرش صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵ء، ص،۹۰

۱۱۔ عرش صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص،۷۰

۱۲۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرش صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵، ص،۱۸۱

۱۳۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگو یجز، ۱۹۸۴ء، ص،۷۷

۱۴۔ عرش صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص،۳۸

۱۵۔ ایضاً ص،۳۷

۱۶۔ ایضاً ص،۳۹

۱۷۔ عرش صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص،۱۷

۱۸۔ عرش صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵ء، ص،۸۷

۱۹۔ پروفیسر ایس اے قاضی شاذ شرقی، عرش صہبائی شخصیت اور شاعری، جموں: شاذ شرقی، ۲۰۰۸، ص:۲۹

۲۰۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرش صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵ء، ص،۱۸۹

۲۱۔ صہبائی، عرش، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶، ص:۶۱

۲۲۔ ایضاً ص،۶۱

۲۳۔ ایضاً ص،۶۱

۲۴۔ سید خورشید کاظمی، مغنی حیات عرش صہبائی، سرینگر کشمیر: میزاں پبلشر، ۲۰۱۸ء، ص،۹۹

۲۵۔ صہبائی، عرش، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵، ص ص،۱۰۷۔۱۰۸

۲۶۔ ایضاً ص،۱۰۸

۲۷۔ ایضاً ص ص،۱۰۸۔۱۰۹

۲۸۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص: ۵۲

۲۹۔ ایضاً ص، ۵۲

۳۰۔ سید خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر کشمیر: میزاں پبلشر، ۲۰۱۸ء، ص، ۹۶

۳۱۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص، ۵۸

۳۲۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵ء، ص، ۹۴

۳۳۔ ایضاً ص، ۹۴

۳۴۔ ایضاً ص، ۹۵

۳۵۔ ایضاً ص، ۸۲

۳۶۔ ایضاً ص، ۸۳

۳۷۔ ایضاً ص، ۸۳

۳۸۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص، ۲۰۔۲۱

۳۹۔ ایضاً ص، ۲۱

۴۰۔ ایضاً ص، ۲۷

۴۱۔ ایضاً ص، ۲۸

۴۲۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویژن، ۲۰۱۵ء، ص، ۱۸۴

۴۳۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص، ۴۷

۴۴۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵ء، ص، ۱۰۲۔۱۰۳

۴۵۔ ایضاً ص، ۱۰۳۔۱۰۴

۴۶۔ ایضاً ص، ۱۰۵۔۱۰۶

۴۷۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص، ۲۹۔۳۰

۴۸۔ ایضاً ص، ۳۳

۴۹۔ ایضاً ص، ۳۱

۵۰۔ فراقؔ گورکھپوری، اردو کی عشقیہ شاعری، کراچی: جاوید پریس، ۱۹۶۶ء، ص، ۱۳

۵۱۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص ص، ۳۵۔۳۶

۵۲۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵ء، ص، ۱۱۱

۵۳۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص، ۴۷

۵۴۔ ایضاً ص،۷۴

۵۵۔ ایضاً ص،۸۷

۵۶۔ ایضاً ص،۸۶

۵۷۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵ء،ص،۱۱۸

۵۸۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص،۱۰۰

۵۹۔ ایضاً ص،۹۹

۶۰۔ ایضاً ص،۱۱۰

۶۱۔ ایضاً ص،۱۰۷

۶۲۔ ایضاً ص،۱۰۳

۶۳۔ ایضاً ص،۱۰۷

۶۴۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵ء، ص،۱۱۶

۶۵۔ ایضاً ص،۱۱۰

۶۶۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص،۷۷

۶۷۔ سید خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی: سرینگر کشمیر، میزاں پبلشر، ۲۰۱۸ء، ص،۱۲۹

۶۸۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص،۷۳

۶۹۔ ایضاً ص،۱۰۲

۷۰۔ ایضاً ص،۱۰۳

۷۱۔ ایضاً ص،۹۴

۷۲۔ ایضاً ص،۹۴

۷۳۔ ایضاً ص،۸۹

۷۴۔ ایضاً ص،۹۳

۷۵۔ ایضاً ص،۸۸

۷۶۔ ایضاً ص،۸۲

۷۷۔ ایضاً ص،۸۶

۷۸۔ ایضاً ص،۹۲

۷۹۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵ء، ص،۱۱۸

۸۰۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص ۹۳

۸۱۔ مفتی محمد انوار الحق، دیوان غالب جدید، بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۸۲۔۱۹۰۴ء، ص ۳۲۱

۸۲۔ عرشؔ صہبائی، یہ جھونپڑے یہ لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء، ص: ۱۰۱

۸۳۔ ایضاً ص ۹۸

۸۴۔ ایضاً ص ۱۰۸

۸۵۔ ایضاً ص ۱۱۴

۸۶۔ پروفیسر ایس اے قاضی شاذ شرقی، عرشؔ صہبائی کی شخصیت اور شاعری، جموں: شاذ شرقی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۲

۸۷۔ ظہیرؔ غازی پوری، اردو دوہے ایک تنقیدی جائزہ، نئی دہلی: وجے گرافکس، ۲۰۰۵ء، ص ۶۹

۸۸۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۰۹ء، ص ۵

۸۹۔ ایضاً ص ۷۷

۹۰۔ ایضاً ص ۷۷

۹۱۔ ایضاً ص ۷۶

۹۲۔ ایضاً ص ۹۲

۹۳۔ ایضاً ص ۸۳

۹۴۔ ایضاً ص ۶۷

۹۵۔ ایضاً ص ۵۸

۹۶۔ ایضاً ص ۲۵

۹۷۔ ایضاً ص ۹۳

۹۸۔ ایضاً ص ۵۱

۹۹۔ ایضاً ص ۴۵

۱۰۰۔ ایضاً ص ۱۱۰

۱۰۱۔ ایضاً ص ۱۳

۱۰۲۔ ایضاً ص ۱۹

۱۰۳۔ پروفیسر عبدالقادر سروریؔ، کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)، جموں اینڈ کشمیر: اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگوایجز، ۱۹۸۴ء، ص ۴۷

۱۰۴۔ پروفیسر ایس اے قاضی شاذ شرقی، عرشؔ صہبائی شخصیت اور شاعری، جموں: شاذ شرقی، ۲۰۰۸ء، ص ۷۸

۱۰۵۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۰۹ء، ص ۵۲
۱۰۶۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویژن، ۲۰۱۵ء، ص ۲۸۹
۱۰۷۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۰۹ء، ص ۷۵
۱۰۸۔ ایضاً ص ۷۴
۱۰۹۔ ایضاً ص ۷۲
۱۱۰۔ ایضاً ص ۶۹
۱۱۱۔ ایضاً ص ۶۸
۱۱۲۔ ایضاً ص ۶
۱۱۳۔ ایضاً ص ۸۴
۱۱۴۔ ایضاً ص ۱۰۴
۱۱۵۔ ایضاً ص ۹۴
۱۱۶۔ ساحرؔ شیوی، دوہے کوکن کے، شاشتری نگر جے پور: ادبی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص: ۱۲۴
۱۱۷۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۰۹ء، ص ۸۲
۱۱۸۔ ایضاً ص ۸۰
۱۱۹۔ ایضاً ص ۸۷
۱۲۰۔ ایضاً ص ۸۷
۱۲۱۔ ایضاً ص ۶۷
۱۲۲۔ ایضاً ص ۶۷
۱۲۳۔ ایضاً ص ۷۴
۱۲۴۔ ایضاً ص ۷۴
۱۲۵۔ ایضاً ص ۴۰
۱۲۶۔ ایضاً ص ۷۲
۱۲۷۔ ظہیرؔ غازی پوری، اردو دوہے: ایک تنقیدی جائزہ، نئی دہلی: وجے گرافکس، ۲۰۰۵ء، ص ۶۹
۱۲۸۔ عرشؔ صہبائی، تجھ بن چین کہاں، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۰۹ء، ص ۲۳
۱۲۹۔ ایضاً ص ۲۹
۱۳۰۔ ایضاً ص ۲۹

۱۳۱۔ ایضاً ص،۲۸

۱۳۲۔ ایضاً ص،۳۱

۱۳۳۔ ایضاً ص،۲۵

۱۳۴۔ ایضاً ص،۱۳۷

۱۳۵۔ ایضاً ص،۴۵

۱۳۶۔ ایضاً ص،۷۹

۱۳۷۔ ایضاً ص،۸۴

۱۳۸۔ ایضاً ص،۸۵

۱۳۹۔ ایضاً ص،۸۶

۱۴۰۔ ایضاً ص،۸۶

۱۴۱۔ ایضاً ص،۹۰

۱۴۲۔ ایضاً ص،۴۱

۱۴۳۔ ایضاً ص،۲۰

۱۴۴۔ ایضاً ص،۱۰۸

۱۴۵۔ ایضاً ص،۶۴

☆☆☆

باب چہارم

عرش صہبائی کی غزل گوئی میں روایت پسندی

روایت ادب میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے ہے۔میرا یہ ماننا ہے کہ بغیر کسی بڑی اور مضبوط روایت کے اچھی اور دائمی اقدار کا ادب تخلیق کر پانا ممکن نہیں ۔ اردو غزل کے فروغ میں بھی روایت کی اہمیت ایک اہم کڑی کی ہے۔آج تک غزل کا کوئی شعر ایسا نہیں کہا گیا جو غزل کا شعر بھی ہو اور ساری روایتوں سے آزاد ہو۔روایت کا مفہوم مختلف ذہنوں میں مختلف ہوسکتا ہے ۔کچھ لوگ روایتی ہونا بہت بڑا عیب سمجھتے ہیں اور وہ نئے اور جدید ہونے کے معنی ساری اچھی روایتوں سے انحراف ضروری سمجھتے ہیں ۔ایسے کٹر ذہنوں کے لئے غزل میں کوئی گنجائش نہیں ہے ۔غزل کی بحریں ردیف اور قافیہ کے اصول بذات خود ایسی مضبوط روایتیں ہیں جن کے انحراف کے بعد غزل ،غزل نہیں رہ سکتی۔شاعری نظم ہو یا غزل ہو یہ روح کی آواز بھی ہے اور اس کی غذا بھی ۔ایک حقیقی شاعر نسبتاً بہت زیادہ حساس ہوتا ہے۔یوں تو ایک عام انسان بھی کسی واقعہ یا سانحہ کو دیکھ کر یا اپنی ذات پر بھوگ کر اس سے متاثر ہوتا ہے لیکن وہ تاثرات عموماً دیر پا نہیں ہوتے جبکہ ایک شاعر اسے نہایت شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔اتنا ہی نہیں ایک شاعر کے دل میں پھر ایک خلش یا چبھن سی ہوتی ہے جو اسے مضطرب کرنے لگتی ہے اور وہ اسے تب تک پریشان کئے رکھتی ہے جب تک وہ اسے شعر کا جامہ نہ پہنا دے۔ایسے اشعار سامعین و قاری حضرات کے دل پر چوٹ کرتے ہیں کیوں کہ یہ ایک حساس اور دردمند دل سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے اور قاری و سامع کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے گویا شاعر نے اسی کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔یہی اصل شاعری کی پہچان ہے۔ریاست جموں کشمیر کے بانکے اور البیلے شاعر عرش صہبائی یقیناً اسی قبیل کے شاعر تھے جنہیں ان کی بے پناہ ذہانت جولانی طبع اور نجی مشاہدات و تجربات کی بنا پر باکمالوں کی فہرست میں ایک نمایاں حاصل ہے۔وہ بزرگ شاعروں میں ایک شیریں بیان شاعر تھے جن کی نمایاں شعری خدمات پر اردو ادب کے پرستار ناز کرتے ہیں۔آپ کو ریاست جموں وکشمیر کے اردو شعراء میں نمایاں مقام حاصل ہے۔سرزمین جموں نے شہنشاہ ترنم کندن لال سہگل سے لے کر قدرت اللہ شہاب تک نہ

جانے جن جن عملی اور ادبی شخصیات کو جنم دیا ہے۔اسی زرخیز مٹی کی پیداوار نامور ادب و شاعر و ادیب عرشؔ صہبائی بھی ہیں۔اردو ادب کے تئیں آپ کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔بقول پرفیسر ساذ شرقی:

عرشؔ صہبائی کا نام شعر و ادب کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے،ان کا شمار نہ صرف غیر ملکی سطح کے شعراء میں ہوتا ہے بلکہ اپنی شعری اور نثری تخلیقات کی وجہ سے عرشؔ صہبائی برصغیر ہند و پاک میں ایک معتبر شخصیت ہیں۔ان کے ایک درجن سے زیادہ شعری مجموعے شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔نثر میں بھی ان کے ادبی اور تخلیقی مضامین باضابطہ کتابوں کے علاوہ ملک کے مختلف جرائد اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ان کے بعض شعری مجموعوں پر پر مختلف طلبا نے ایم۔فل کے مقالات لکھ کر جموں یونی ورسٹی سے ایم فل کی سند حاصل کی ہے۔بعض مقالہ نگاروں نے عرشؔ کے فن پر مختلف مضامین لکھ کر ان کی شاعری اور شخصیت کو ابھارا ہے۔(۱)

عرشؔ صہبائی کا شعری عہد بہت طویل ہے۔انہوں نے 1950ء سے لیکر دسمبر 2020ء تک اپنی عمر کے تقریباً 70/برس اردو زبان و ادب خصوصاً اردو شاعری کی خدمت میں دیئے ہیں۔وہ اس طویل عرصے میں کئی ادبی تنظیموں و تحریکوں ں سے وابستہ رہے ہیں لیکن ان کی یہ خوبی رہی ہے کہ وہ کبھی بھی کسی کی تقلید کے قائل نہیں ہوئے۔عرشؔ کی شاعری کے مطالعہ سے یہ احساس ضرور ابھرتا ہے کہ انہوں نے زندگی میں اپنے دور کی مختلف تحریکوں کے علاوہ اکثر و بیشتر واقعات و حادثات کو اپنی شاعری میں نمایاں جگہ دی ہے۔انہوں نے عوام کے دلوں کو چھو جانے والے جذبات و احساسات کو اپنے اشعار میں جگہ دینے کی جو کوشش کی ہے وہ اس میں وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔اس کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ ان کے بے شمار ایسے اشعار ہیں جو زبان زد خاص و عام ہوئے ہیں۔انہوں نے حیات و کائنات کے بارے میں اپنی فکر مخصوص کو بڑے موثر انداز میں اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔عرشؔ کی غزل گوئی میں معنی آفرینی اور کیفیت جیسی صفات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔یہ بات خاصی اہمیت رکھتی ہے کہ شاعری میں یہ دونوں صفات ایک ساتھ مشکل سے ہی جمع ہوتی ہیں۔البتہ اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ غزل کی روایت میں ایسے ان گنت شعر ملتے ہیں جن کی تنقیدی توجیہیں کرنا آسان نہیں ہوتا لیکن پھر بھی وہ اشعار اپنی تاثر آفرینی اور جمالیاتی خط کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔بعض تنقید نگاروں نے اپنی سہل پسندی کی خاطر اس قسم کے اشعار کو تغزل کا نمونہ بتایا ہے۔عرشؔ میرؔ و غالبؔ،مومنؔ و ذوقؔ وغیرہ کے زمانے کے شاعر تو نہیں لیکن ان کی غزل بھی مومنؔ کی غزل کی طرح تغزل سے بھرپور ہے۔

عرشؔ جدید شاعر ہوتے ہوئے بھی پوری طرح سے جدید شاعر نہیں تھے۔یعنی یہ کہ وہ ماضی کی حسین روایات کے باغی نہیں تھے۔عرشؔ صہبائی نے قدیم اردو و فارسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے ور پھر جدید شعری جدید ادبی رجحان کو بھی انہوں نے سمجھنے کی طرح سمجھا۔ان کو کلاسیکی ادب کی عظمتوں کا بھی اعتراف ہے اور وہ ترقی پسندی کی بلندیوں کے بھی قائل تھے۔عرشؔ نے اپنے فن کو سجانے اور سنورنے کے لئے اگر ایک طرف کلاسیکل ادب کی حسن آفرینیوں اور نزاکتوں کا ہضم کیا ہے تو دوسری طرف ترقی پسند کے تابناک اور جاوید عناصر کو بھی تحلیل کیا ہے۔اور شعلہ وشبنم کے اس حسین امتزاج نے عرشؔ کی شاعری میں وہ سنجیدہ اور بلند توازن پیدا کر دیا ہے جو نئے شعراء میں تقریباً مفقود ہے۔اسی طرح عرشؔ کے لب و لہجے کی جڑیں اگر ایک طرف قدیم ادب کی نزاکتوں اور نرمیوں کی گہرایوں میں اتر گئی ہیں تو دوسری طرف جدید ادب کی تلخیوں میں بھی دور تک گئیں ہیں۔اور اس طرح اس کی آواز میں بیک وقت تلخی وحلاوت اور سنجیدگی و جھنجھلاہٹ کا امتزاج ملتا ہے۔سب سے بڑی اور اہم بات یہ کہ عرشؔ کے کلام کوئی بھی غیر متوازن نہیں ہے بلکہ ان کے زبان و بیان میں شستگی، شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے۔عرشؔ کی شاعری کے متعلق کوثر چاندپوری کی یہ رائے بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہے:''عرشؔ صہبائی کے کلام میں خلوص اور تاثیر کی فراوانی ہے۔اکثر اشعار، خلش پیکاں، کی طرح احساس میں چبھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔''(۲)

1947ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب کے حوالے سے انہوں نے سب سے زیادہ کام کیا ہے اور ایسا ادب تخلیق کیا ہے جو دوسروں کو تحریک بخشتا ہے۔جموں کشمیر کے شعری ادب کی تاریخ آپ کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔عرشؔ نے اپنی عمر کا نصف صدی سے زائد حصہ پرورش لوح قلم کی نذر کیا ہے۔ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا لسانی شعور ہے۔انہوں نے اردو شاعری کی مختلف اصناف میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے جن میں غزل، قطعہ اور دوہا شامل ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کی طبیعت غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل ہے اور اسی کی بدولت عالمی سطح پر وہ ان چند گنے چنے اور کہنہ مشق شعراء میں شمار ہوتے ہیں جن کو اردو شاعری میں منفرد مقام حاصل ہے۔ایسا نہیں کہ ان کے جو مجموعے نظم، قطعہ اور دوہا سے تعلق رکھتے ہیں وہ کسی طرح کی کم اہمیت کے حامل ہیں۔موصوف نے جن اصناف میں طبع آزمائی کی ہے ان میں باکمال ادب تخلیق کیا ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ان کے فنی رموز سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ان کے اظہار اسالیب پر انہیں پوری قدرت حاصل ہے۔ان کی شاعری محض رسمی شاعری نہیں بلکہ اس میں روایت اور جدت دونوں کا خوبصورت و

دلکش امتزاج موجود ہے۔ان کے کلام میں خصوصاً ان کی غزلوں میں جدیدیت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری کی روایت کا رکھ رکھاؤ بھی ملتا ہے۔موصوف خود کو جدید شاعر تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کرتے تھے اور جدید شاعری سے سخت مخالفت کرتے تھے۔وہ جدید شاعری کو ابہام کا شکار بتاتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی وہ ایک اچھے جدید شاعر تھے۔

عرشؔ صہبائی جدید شاعر بھی ہیں اور کلاسیکی بھی۔ان کی شاعری میں ہماری روایتی کلاسیکی شاعری کے تمام امتیازات سے مزین ہونے کے ساتھ ساتھ آج کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ان کی شاعری بیسویں صدی بالخصوص آزادی کے بعد کی ہندوستانی فضا اور نئے خواب وخیال کی بھی پوری عکاسی کرتی ہے۔عرشؔ کی غزلیں ان کے معاصرین سے بھی مماثلت رکھتی ہیں۔ان میں اس زمانے کی جیتی جاگتی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں اور ان کی غزلیں اپنے معاصرین سے مختلف اور منفرد ہیں جو اپنے عہد سے آگے آنے والے وقت کی آہٹوں کا احساس دلاتی ہیں۔عرشؔ صہبائی کے مداحوں کی کمی نہیں ہے۔پروفیسر عبدالقادر سروریؔ، علی جواد زیدی، جوشؔ ملسیانی، کوثرؔ چاند پوری، شفاؔ کوالیاری، منورؔ لکھنوی نے جہاں ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے وہیں ان کے شاعری کے چند پہلوؤں کی کمزوریاں بھی شمار کروائی ہیں۔یہی نہیں جسٹس آر پی سیٹھی، شکیلؔ بدایونی وغیرہ کئی ایسی ہستاں ہیں جنہوں نے ان کی تحسین، انفرادیت اور معنویت کا بھی شمار کرایا ہے۔آج کے ادبی اور تہذیبی تناظر میں دیکھا جائے تو عرشؔ بھی فراقؔ اور فیض کی طرح اعلیٰ شاعری کے خالق ہیں۔ان کے یہاں بھی اردو شاعری کی شاندار روایت وکلاسیکیت اور جدیدت وانفرادیت کے اوصاف موجود ہیں جو انھیں ان کے عہد کے شعراء میں بلند مقام عطا کرتے ہیں۔بیسویں صدی میں بالخصوص آزادی کے بعد سے لیکر اب برصغیر ہندو پاک میں ابھرنے والے عوامی مسائل کو عرشؔ نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ہر نئی فضا میں نئے احساسات اور کیفیات کی شاعری ان کے یہاں موجود ہے۔

عرشؔ صہبائی سے قبل جدید غزل کی دو اہم روایتیں یگانہؔ اور فراقؔ سے چلتی ہوئی آگے بڑھی ہیں جن میں بالترتیب بیسویں صدی کی مجروح انا اور نفسیاتی اضطراب کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے لیکن عرشؔ کی غزل یہیں ایک نوا اپناتی ہے اور اس میں یہ دونوں رنگ کہیں ظاہر تو کہیں مدھم ہونے لگتے ہیں لیکن وہ ہمیں کسی خاص رجحان کے پیرو نظر نہیں آتے بلکہ مختلف لہجوں کی بازگشت کمال انفرادیت کے ساتھ ان کے لہجے میں سمٹی چلی جاتی ہے جو تسلسل روایت کی ایک صورت بھی ہے کہ وہ اپنے جدید لہجے کو کلاسیکی انداز سخن کے متنوع اسالیب کا لباس

پہناتے رہتے ہیں۔عرشؔ کی غزل میں اس حوالے سے غالبؔ، میرؔ اور مصحفیؔ کا رنگ بھی کہیں کہیں جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔جاوید مغل نے اپنے ایک مضمون ''عرشؔ صہبائی: شعری افق کا ایک درخشندہ ستارہ'' میں موصوف کے متعلق اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

عرشؔ صہبائی نے کلاسیکی اور ترقی پسند شاعری سے لیکر جدید شاعری تک کے رجحانات کو دیکھا پرکھا اور پھر عصری تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے ہر شعری رویہ اور رجحان کا ساتھ بھی دیا لیکن انہوں نے کبھی اپنی شاعری میں تقلید اور فیشن پرستی کو جگہ نہیں دی۔یہی وجہ ہے کہ تقریباً ایک درجن شعری مجموعوں کے مصنف عرشؔ صہبائی ہر زمانے میں سب کے ساتھ چلتے ہوئے بھی سب سے نمایاں اور منفرد نظر آتے ہیں۔عرشؔ کے یہاں ترقی پسند خیالات بھی ہیں اور جدیدیت کی خوشبو بھی۔ انہوں نے ضرورت کے مطابق اپنی غزلوں میں سادہ لب و لہجہ بھی اختیار کیا ہے اور خوبصورت تشبیہہ و استعارات اور علامت و پیکر کو بھی اپنے اشعار مین جگہ دینے سے گریز نہیں کیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عرشؔ غزل کے حدود و امکانات سے پوری طرح واقف ہیں۔میرؔ و مومنؔ سے لے کر غالبؔ اور اقبالؔ تک کی غزلوں کے مزاج اور رویوں کو عرشؔ صہبائی نے بڑی گہرائی سے دیکھا بھی ہے اور اپنی غزلوں میں برتا بھی ہے لیکن جیسا کہ ذکر ہوا ہے کہ وہ اپنے خیالات و تجربات کو اپنے خیالات و تجربات کو اپنی فکر و دانش کے ساتھ ملا کر اپنے ہی انداز میں پیش کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔حسن خیال کے ساتھ حسن بیان کی خوبیوں سے آراستہ عرشؔ کے اشعار دور سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔(۳)

عرشؔ صہبائی نے اپنے ہاں جدید رنگ کے ساتھ ساتھ غزل کے روایتی رنگ اور اس کے بطن سے ابھرنے والی لے اور جمالیاتی لطافت سنوارنے میں انہماک سے کام لیا ہے۔وہ شعوری طور پر الفاظ کا انتخاب کر کے ایک مخصوص فضا قائم کرنے کے ماہر تھے۔عرشؔ کی غزل فن اور جمال کا ایک حسین پیکر ہے۔انہوں نے خیال، زبان، ہیئت اور جذبات کی ہم آہنگی سے اس میں کمال کا حسن پیدا کیا ہے۔عرشؔ کا تصور عشق کی بڑی ہمہ گیری کا حامل ہے۔ان کے ہاں مجاز و حقیقت کی مختلف شکلیں اگرچہ کبھی کبھی الگ نظر آتی ہیں مگر ان میں کہیں کہیں رمزیت کی وجہ سے وحدت بھی ملتی ہے۔ان کے ہاں صرف مجروح انا کا رنگ اس لئے نہیں ابھرتا کہ وہ اس صورت میں اپنے باطنی اضطراب کو قبول کرتے تھے، اس ادراک کے ساتھ، کہ اپنی تباہ حالیوں کے حادثے کو قبول نہ کرنے کی صورت میں سوائے ایک جھنجھلاہٹ کے اور ردعمل پیدا نہیں ہوسکتا۔غم کی اسی تفہیم ان کے لہجے کو ٹھہراؤ عطا کیا ہے۔اسی طرح ان کی غزل کا مسلہ صرف نفسیاتی اضطراب یا کسی دبی ہوئی کسک کا مسلہ نہیں کہ اس میں اپنا اور محبوب کا وجودی اثبات بھی شامل ہے جو مسلسل حادثوں اور بے سروسامانی کا شکار ہے۔

یہاں زمانہ اگر محبوب کی قرب کی مہلت دیتا ہے تو اس میں مل کر بھی نہ مل پانے کی تشنگی کے بجائے ایک ایسی منہمک وارفتگی ہوتی ہے اور دل ہونے یا نہ ہونے کے درمیان کی پر تشکیک فضا میں ڈوبا رہتا ہے۔ انتہائے شوق میں شل جانے کا احساس عرشؔ کی غزل میں اسی کیفیت کا غماز ہے جو اضطراب کی نہیں جذب کی حالت کو سامنے لاتا ہے۔ اس انداز سخن سے خوبصورتی یہ پیدا ہوئی کہ غزل کے روایتی اسالیب بھی بار دگر اس عصر جدید میں زندہ ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے گرد و پیش کے شہر آشوب اور جذباتی اضمحلال کو سمٹتا ہوا ایک بالکل منفرد لہجہ بھی متعارف ہوا۔ عرشؔ صہبائی کی غزل کا یہ لہجہ ان کی نظم و دوہا سے بھی زیادہ متاثر ہے اور اس اثر پذیرائی کو یوں دیکھا جا سکتا ہے کہ نظم کی امیجری کے پھیلے ہوئے رنگ یہاں غزل کے سانچے میں سمٹنے لگتے ہیں۔

عرشؔ صہبائی غزل کی اس روایت سے منسلک ہیں جس کے سلسلے کی پہلی کڑی میرؔ و ولیؔ تھے۔ عرشؔ کی غزل، غزل کے معیار پر پوری اترتی ہے کہ غزل ذخمی ہرن کی آہ کا نام ہے۔ ان کی شاعری میں اس آہ کی گونج ہے۔ غزل تیر نیم کش کی کسک کا نام ہے۔ یہ چبھن عرشؔ صہبائی کی غزل میں بھی موجود ہے۔ ان کی غزل میں ذات و کائنات کا آہنگ بھی موجود ہے۔ عرشؔ کی شاعری میں روایت کے ساتھ ساتھ انحراف کا عنصر بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شاعری روایت سے زیادہ ان کے ذاتی مشاہدات کی حامل نظر آتی ہے۔ انہوں نے غزل میں اپنے عہد کی ذاتی اور سماجی زندگی، سیاسی ناہمواریاں اور انسانی نفسیات کا بیان بہت کامیابی سے ملتا ہے۔ ان تمام مسائل کو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے غزل کا جامہ پہنایا ہے۔

اگرچہ عرشؔ صہبائی اپنے شعری سفر کے دوران کسی ادبی رجحان سے وابستہ نہیں رہے لیکن اردو کلاسیکل غزل کی روایت سے انہوں اپنا رشتہ برابر برقرار رکھا ہے۔ ان کی غزلیں ساخت و بافت دونوں اعتبار سے کلاسیکل شعرا کی غزلوں سے خصوصی مناسبت رکھتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ جدید دور کی نمائندگی بھی کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنی غزل میں روایتی موضوعات کو نئے انداز میں بیان کر کے جدید غزل گو شعراء کی صف میں انفرادی حیثیت قائم کی ہے۔ آمینؔ بانہالی عرشؔ کے معاصرین شعراء میں ایک اہم نام ہے۔ عرشؔ کی شہرت اور مقبولیت کے متعلق امینؔ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں کہ ”عرشؔ صہبائی ایک اچھے اور معروف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ وہ ہر کسی سے بڑے خلوص اور پیار سے ملتے ہیں۔ بڑے تحمل اور شوق سے سنتے ہیں اور اپنی گراں قدر آرا کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان کے مداح اور ان کے چاہنے والے ہر جگہ ان کی شاعری کے دلدادہ ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار خطوط کے زریعے یا رسائل میں کرتے ہیں جن سے ان کی شہرت

کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"(۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ عرشؔ صہبائی جدید غزل گوئی کے بلند پائے کے شاعر گزرے ہیں۔ان کا شعری سفر بیسویں صدی کے درمیان میں شروع ہوا اور یہ سلسلہ اکیسویں صدی کی دو دہائیوں تک چلا جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کے موصوف نے شاعری کے کتنے ادوار بدلتے ہوئے دیکھے ہیں۔اس طویل سفر میں عرشؔ کے شعری مجموعے جب مب منظر عام پر آئے مختلف ادبی شخصیات نے ان کے کلام پر تبصرے کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان کے پہلے شعری مجموعے "شکست جام" کے شروع میں تعارف کے طور پر ان کے استاد محترم اور مشہور و معروف شاعر جناب جوشؔ ملسیانی کی رائے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔وہ عرشؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

عرشؔ صہبائی میرے ہی خوش فکر عزیزوں میں سے ہیں۔چار پانچ سال سے وہ اپنا کلام مجھے دکھاتے اور زبان وفن کے مشورے حاصل کرتے ہیں۔ان کی غزل میں اشعار کی تعداد تو چھ سات سے زیادہ نہیں ہوتی مگر شگفتہ زمینیں کرنے اور مشکل زمینوں میں بھی اچھے اشعار نکالنے میں ان کی کوشش قابل ستائش ہے۔کلام میں عریانی بھی نہیں ہوتی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی پاکیزہ طبیعت اور پاکیزہ بیان کا رجحان عریاں مضامین سے کوسوں دور رہتا ہے۔حال ہی میں وہ اپنا مختصر مجموعہ کلام "شکست جام" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔میں تنقید و تبصرہ اس لئے نہیں کر سکتا کہ اپنے ہی عزیز کے متعلق کسی شعر کی تعریف خواہ وہ فن کے لحاظ سے کتنی ہی بجا کیوں نہ ہو جذباتی ہونے کی وجہ سے بے وقعت سمجھی جائے گی۔اس لئے یہ کام دوسرے اہل نظر پر چھوڑتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا حسن قبول روزی کرے اور مجموعہ دنیائے ادب سے خراج تحسین کا مستحق سمجھا جائے۔(۵)

جوشؔ ملسیانی ایک اچھے استاد کے علاوہ اردو کے ایک عظیم شاعر تھے۔عرشؔ اگرچہ ان کے شاگرد تھے لیکن انہوں نے ان کے کلام کے متعلق رائے پیش کرتے وقت بطور قاری اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔اسی مجموعے میں شامل آبر احسنی گنوری ایک تنقدی مضمون بہ عنوان "گفتنی" بھی شامل ہے جس میں انہوں نے عرشؔ کے کلام کے متعلق بہت جامع رائے کا اظہار کیا ہے۔آبر احسنی لکھتے ہیں:

عرشؔ صہبائی کا کلام رسائل وجرائد میں آپ کی طرح مجھے بھی کئی برس سے نظر آتا رہا ہے اور میں ہر مرتبہ ان کے اشعار میں اثر و کشش محسوس کی ہے لیکن یہ کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ عرشؔ صہبائی کون اور کہاں رہتے ہیں اور کس عمر ولیاقت کے انسان ہیں

اور مجھے ہی کیا کسی کو بھی کلام پڑھتے وقت اس حماقت میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ شاعر کے متعلق تجسس کرے۔۲۶ اپریل ۸۵ء کو حضرت جوش ملسیانی کے یوم ولادت کے سلسلے میں جالندھر میں ایک معیاری مشاعرہ منعقد کیا گیا۔اس مشاعرہ میں میں بھی مدعو تھا،میونسپل حال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا شعراء اکرام کی ایک بڑی جماعت ڈائس کے سامنے با قاعدہ بیٹھی ہوئی تھی۔میرے لئے ان میں اکثر حضرات اجنبی تھے اور میں ان کے لئے اجنبی تھا۔مشاعرہ شباب پر تھا۔بڑے اچھے اچھے اشعار سننے میں آرہے تھے کہ اناؤنسر نے اعلان کیا کہ ان آپ کے سامنے سرزمین کشمیر کے ایک مقبول ومعروف شاعر جناب عرشؔ صہبائی تشریف لا رہے ہیں۔نام حافظہ میں پہلے ہی سے موجود تھا اشعار پہلے ہی دل و دماغ میں گھر بنا چکے تھے۔چونک کر دیکھا تو ایک حسین نوجوان بڑی سنجیدہ اداؤں سے ڈائس کی طرف جا رہا تھا اور پھر اس نے نہایت ہی دلکش متین نیز مشاقانہ غزل سنا کر محفل کی گرمی قابل قدر اضافہ کر دیا یہ تھے جناب عرشؔ صہبائی۔مجھے چونکہ ان سے ایک ربط پہلے سے ہی ہو چکا تھا ڈائس سے اترتے وقت بے تکلف اپنے پاس بلالیا اور چوری چھپے کچھ باتیں کیں میں نے چوری چھپے کی بات اس لئے کہی کہ جاری مشاعرہ میں باتیں کرنا بداخلاقی سمجھا جاتا ہے۔پھر تو عرشؔ ایک دن اور دو راتیں قریب ہی رہے اور ہر بیگانگی یگانگی میں تبدیل ہوگئی۔خوب سنا اور عرشؔ کو سمجھا کئی نشستوں میں وہ میرے ساتھ شریک رہے۔عرشؔ کے اشعار میں قدرتی صلاحیت کو زیادہ دخل ہے ان کی مشق ومحنت کو کم بلکہ بہت کم اس لئے کہ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے اس عمر میں تو شعر کے ہجے اور معنی بھی نہیں آتے۔مشق تو اب وہ کریں گے اور خدا جانے مشق ہونے کے بعد اس تلوار میں کتنا کاٹ پیدا ہو جائے گا۔(۶)

عرشؔ صہبائی کا مجموعہ کلام ''شکست جام'' اس قدر مشہور ہوا کہ موصوف کو اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت آن پڑی۔بڑے بڑے اہل قلم وادیبوں اور اداروں نے ان کے کلام کی داد دیتے ہوئے مختلف آرائیں پیش کیں جو اس مجموعے کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہیں۔ریڈیو کشمیر جموں نے عرشؔ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کچھ کیا ہے کہ''جناب عرشؔ صہبائی خوش فکر شاعر ہیں۔ان کے کلام میں ہم زبان وبیان کی جو صحت پاتے ہیں،وہ بالکل متوقع ہے اور وہ یوں کہ جوشؔ ملسیانی سے ہو کر ان کا احاطہ اردو شاعری کے اس اسکول سے جا ملتا ہے جسے''داغ اسکول'' کہا جاتا ہے اور جس کی زبان دانی ایک مسلم حقیقت ہے۔عرشؔ بنیادی طور پر غنائی شاعر ہیں کہیں کہیں داغ کی شوخی اور معاملہ بندی بھی ان کے اشعار میں ملتی ہے۔سرزمین کشمیر کو اپنا ابھرتا ہوا شاعر مبارک ہو''(۷)

آل انڈیا ریڈیو جالندھر کی جانب سے پیش کی گئی رائے کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں جو اسی مجموعے کے صفحہ نمبر ۱۱ پر درج ہے:''عرشؔ صہبائی سرزمین کشمیر کے ایک مقبول شاعر ہیں اور غزل سرائی کی جدید راہوں

کے علمبردار ہیں''(۸) ڈاکٹر شاہ نواز اور ڈاکٹر رفیق انجم نے عرشؔ کا ایک منتخب مجموعہ ''عکس جمال'' کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر شاہ نواز عرشؔ کی زندگی کے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

عرشؔ زندگی کا مزاج داں ہونے کے ساتھ ساتھ کرب و وجود کا بھی شاعر ہے۔ اس نے زندگی کو جن حالات اور رخوں میں دیکھا ہے اس کی صحیح تعبیر اپنے شعری منظر نامے میں پیش کی ہے۔ جب یکے بعد دیگرے قاری پر اس کے اشعار کی پرتیں کھلتی ہیں تو قاری عرشؔ کے شعری دفتر میں کئی رنگ دیکھتا ہے جو قوس قزح کی طرح حسین منور اور دلآویز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے پیوست بھی نظر آتے ہیں۔ عرشؔ نے اشعار میں سادگی اور سلاست کو خوب برتا ہے۔ رمز و ایما کے نقطے اس شاعری کی جان اور ایمان ہیں۔ عرشؔ کی شعری زمین پر جب بھی نزول سروش ہوتا ہے تو خوب سے خوب تر اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں جو عرشؔ کے عہد کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ہیں بلکہ ایسے شعری تفکر کا تو فقدان ہی نظر نہیں آتا ہے۔(۹)

ہر عہد کے غزل گو شعرا کے یہاں اس دور کی ماحول و معاشرے کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص فضا ملتی ہے جو اس شاعر کی داخلی کیفیات اور ان تمدنی احوال کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں اس نے نشو نما پائی ہوتی ہے۔ حسرتؔ موہانی اور جگرؔ مراد آبادی کے ہاں حسن و عشق کے معاملوں کا اظہار راس سے اس حد تک مختلف ہے جو ہمیں میرؔ تقی میر و غالبؔ و مومنؔ کے ہاں ملتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو، دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے، ہماری طرز فکر و احسان، طرز زندگی، اور یہاں تک کہ ہمارا لباس جوان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جو ہم سے پہلے تھے۔ عرشؔ صہبائی کے ہاں جتنی شدت کے ساتھ نکات زندگی کی تفسیر ملتی ہے وہ دوسرے غزل گو شاعروں کے ہاں مل پانا مشکل ہے۔ میں نے بارہا عرشؔ کی زبان سے یہ کلمہ از خود سماعت کیا ہے کہ مجھے دنیا میں موت کے علاوہ زندگی سے عزیز تر کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ زندگی کے ہر ہر پہلو کو انہوں کے بڑی باریکیوں کے ساتھ اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ زندگی جیسے ان کا محبوب موضوع ہو۔ اس پس منظر میں عرشؔ کے متعلق شرون کمار یہ رائے دیکھئے:

عرشؔ کی نظر زندگی کے ہر پہلو پر ہے۔ اس کی کہنہ مشقی اور پختہ کاری اور بات کہنے کا ڈھنگ اس کے اشعار کو پراثر بنا دیتا ہے۔ زندگی کے مختلف رنگ، ان سے پیدا ہونے والے دل شاعر کے احساسات، ردعمل اور شاعر اپنی اپنی مجبوریاں ان اشعار اور اس کے دگر مجموعوں، شکست جام، شگفت گل، صلیب، اسلوب، اساس اور ریزہ ریزہ وجود (غزلوں کے مجموعے) میں محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ عرشؔ کے ہاں ہر رنگ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ غم ہو، محبت ہو، مصروفیت ہو، پریشانی ہو، جمود کا احساس ہو کہ تسلسل اور روانی کی چاپ، انقلاب کی آہٹ ہو کہ ناامیدی و مایوسی کا سناٹا، عرشؔ پوری سچائی اور ایمانداری سے ان سے پردہ کشائی کرتا ہے

اس نے زندگی کو ایک متحرک ،مجسم تبسم ،معتبر اکائی کے روپ میں پیش کیا ہے ایسا لگتا ہے کہ عرشؔ نے زندگی سے عشق کیا ہے۔ یہی کمبخت اس کی محبوبہ ہے اس کا ہر رنگ اس نے دیکھا ہے زندگی نے اسے چرکے بھی دئے ہیں اور جھٹکے بھی ، روشنی بھی دی ہے اور اندھیرا بھی ، اپنے حسن کا جادو جگایا ہے اپنی کثافت کا شکار بھی لطافت سے اسکی جھولی بھی بھری ہے اور تلخیاں بھی دی ہیں۔ عرشؔ نے اس کے ہر غمزہ ، ما ہر ادا ، ہر وار کو برداشت کیا ہے لیکن اس نے اپنے عشق میں کمی نہیں آنے دی۔ (۱۰)

ڈاکٹر جاوید وششٹ کہتے ہیں کہ: ’’عرشؔ صہبائی نے اپنی غزلوں میں زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ خود اپنا محور بن جاتی ہے، اگر چہ ان کا تصور ایک شگفتہ گلاب کی طرح ہے یعنی اس کی شگفتگی وتازگی میں ہر برگ گل کا CONTRIBUTION ہے لیکن مجموعی طور پر گلاب ہی سارا کریڈیٹ لے جاتا ہے۔ میں نے سوچ سمجھ کر عرشؔ کو مغنی حیات قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک ان کی غزل کی بنیاد براہ راست ’’زندگی‘‘ پر ہے کسی کے توسط سے نہیں، لیکن لطف یہ ہے کہ ان کی غزل میں آکر زندگی خود غزل بن جاتی ہے۔‘‘ (۱۱)

اردو شاعری میں زندگی کی عکاسی ہر شاعر کے یہاں کسی نہ کسی پہلو میں ملتی ہے لیکن مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات ظاہر ہے کہ عرشؔ کی غزل میں یہ موضوع انتہائی درجے کے قریب نظر آتا ہے۔ اگر چہ یہ روایت کا حصہ ہے لیکن میں اسے عرشؔ کی انفرادیت کا پرتو بھی قرار دیتا ہے۔ اس بات کے جواز کے طور پر آئندہ ان کے اشعار پیش کئے جائیں گے جن سے آپ یقیناً میری بات کی تائد پر آمادہ ہونگے۔ عرشؔ کی زندگی کے سلسلے میں اقبالؔ انصاری نے بھی اپنے ایک مضمون میں بہت اہم بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

زندگی کو پوری طرح سمجھ لینے کا دعویٰ تو کوئی نہیں کر سکتا۔ عرشؔ صہبائی بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے۔ وہ تو بس بڑی دل جمعی اور دل پذیری کے ساتھ زندگی کی پرتیں کھول کر گہرائی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کی اس کاوش کا آئینہ ہے۔ ایک بات جو بڑی شدت سے ان کی شاعری میں خود کو محسوس کراتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو اپنے شعور میں جیا ہے، اپنے احساس میں جیا ہے، فنکارانہ لطف کے ساتھ جیا ہے، لبوں پر شگفتہ تبسم لئے ہوئے جیا ہے، ایک محترم حقیقت سمجھ کر جیا ہے۔ عرشؔ صہبائی کے جہان شعری سے گزرتے ہوئے بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی از خود فن بن کر ان کی شاعری میں سما گئی ہے۔ (۱۲)

مندرجہ بالا مختصر اقتباسات سے عرشؔ کی زندگی کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جب ہم ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دھندلاہٹ بڑی حد تک دور ہو جاتی ہے اور ان کی زندگی صاف طور پر

ہمارے سامنے نظر آجاتی ہے۔عرشؔ کے یہاں زندگی کے کئی پہلوؤں پر اشعار ملیں گے۔چند اشعار ملاحظہ کریں:

ایک مرکز پر کبھی ہوتا نہیں اس کا قیام
زندگی کے واسطے درکار ہیں محور کئی (۱۳)

ہم اپنی زندگی میں جس کا ذکر کر سکتے
کوئی بھی واقعہ اس درجہ خوشگوار نہ تھا (۱۴)

سخت جانی کا یہ عالم ہے کہ زندہ ہوں ابھی
کٹ گئی اک زندگی خون تمنا دیکھتے (۱۵)

اک میں ہی زندگی سے پریشان نہیں ہوں عرشؔ
خود میری زندگی بھی پریشان ہے بڑی(۱۶)

عرشؔ صہبائی کی زندگی اور شاعری سے ہم آہنگی اردو ادب کے کلاسیکی شعراء سے بہت حد تک مختلف ہے۔اپنی زندگی میں ان کی ذات ناتواں پر جو گزری ہے اسے انہوں ے سیدھا کاغذ پر منتقل کر دیا۔اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اتنا تاثر اتنی جاذبیت ہے۔اگرچہ اس کی وجہ سے ان کے کلام میں اپنائیت غالب آ گیا ہے۔ظاہر ہے کسی کا انفرادی غم اجتماعی غم نہیں بن سکتا اور کسی کے انفرادی اور ذاتی غم سے کسی کو ہمدردی نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی عرشؔ کا مخصوص لب ولہجہ نکھرئے ہوئے خیالات اور زبان کی سلاست و مانوسیت ایک پڑھنے والے کو کافی متاثر کرتی ہے۔عرشؔ صہبائی کے زندگی اور شاعری دونوں کو ہم باوجود کوشش کے بھی ہم جدا نہیں کر سکتے۔زندگی کی یہی عکاسی ہر دور کے شاعروں کے ہاں ملتی ہے۔عابدؔ مناوری بھی جموں کشمیر کے غزل گو شاعروں میں ایک خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔اس پر ان کا یہ ملاحظہ کریں:

اپنی اپنی نظر ہے اے عابدؔ
زندگی پھول بھی ہے کانٹا بھی (۱۷)

پرتپال سنگھ بیتابؔ کہتے ہیں:

زندگی دیکھ میں تری خاطر
روز کس کس طرح سے مرتا ہوں (۱۸)

ان ہی خیالات پر مبنی اشعار کئی دوسرے شعراء کے ہاں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شکیلؔ بدایونی کہتے ہیں:

وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں (۱۹)

ساحرؔ لدھیانوی کہتے ہیں:

تنگ آچکے ہیں کش مکش زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم (۲۰)

غلام ربانی تاباںؔ:

کوئی منزل ہے تیری اور نہ کہیں تیرا پڑاو
زندگی خانہ بدوشی کے سوا کچھ بھی نہیں (۲۱)

فانیؔ بدایونی ایک شعر میں زندگی کے متعلق کہتے ہیں:

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مر جانے کا(۲۲)

مثلاً مہیش چندر نقش کا یہ شعر دیکھئے:

اس کی مرضی پر ہے ہر قید و رہائی منحصر
خود قفس ہے اور خود ہی آشیاں زندگی (۲۳)

فراقؔ کہتے ہیں:

زندگی آگ بھی ہے پانی بھی — دل کو شعلوں سے کرتی ہے سیراب
زندگی ہجر کی کہانی بھی — زندگی عین دید یار فراقؔ (۲۴)

اردو شاعری کی روایت میں اس نوعیت کے اشعار بہت ہیں لیکن کہیں ان کا ٹکراؤ روایت سے ہوتا ہے اور کہیں انحراف بھی ملتا ہے۔ کسی موضوع کو اپنی شاعری برتنے اور اس کا حق ادا کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہ بات خیال یا نظریے کی نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر کی مشاقی، تجربات اور انداز و اسلوب کا زیادہ دخل ہوتا ہے کیوں کہ ہر شاعر کا بات کہنے کا اپنا ایک منفرد انداز اسلوب ولب ولہجہ ہوتا ہے۔ عرشؔ صہبائی کے کلام میں بھی تصور زندگی اور اوصاف زندگی کے ایسے ایسے نمونے ملتے ہیں جن کا تعلق بیک وقت روایت اور

انفرادیت دونوں سے رہتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

بارہا تھک کے گر پڑی ہے عرشؔ زندگی آفتوں کی جھولی میں
جیسے مجبور سی کوئی دلہن بے دلی سے رواں ہو ڈولی میں

کتنے جاں سوز مراحل سے گزر تھا اپنا
زندگی رہ گئی اک آگ کا دریا بن کر(۲۵)

حادثوں میں ہے متاع زندگی کی آبرو
زندگی کھاتی ہے کس کس موڑ پر ٹھوکر نہ دیکھ (۲۶)

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں(۲۷)

امید کی کرن کا نشان تک نہیں کہیں
یہ زندگی ہے یا کوئی تصور یاس ہے(۲۸)

کس قدر کیف آفرین تھا خواب وہ
زندگی جس خواب کی تعبیر ہے(۲۹)

عرشؔ نے جہاں شاعرانہ اسلوب کو پیغامی اسلوب میں منتقل کیا ہے۔ زندگی جینے کا مثبت رویہ ان کی شاعری میں جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں بھی روایتی شاعروں کی روایت پسندی کا عنصر ملتا ہے۔ حیات وموت کے مختلف پہلوں کا ذکر ان کی شاعری میں بڑی شدت سے ملتا ہے جو بیک وقت ان کے کلام میں روایت اور انفرادیت دونوں کا احساس دلاتا ہے۔ زندگی کو عرشؔ جس خوشگوار پہلو سے وہ بیان کرتے ہیں موت کو بھی اتنی ہی کشش اور توانائی سے بیان کرنے کی صلاحیت ان کے اندر موجود تھی۔ مثال کے لئے ان کے چند اشعار پیش ہیں:

تنگ آخر موت کو آواز دینا کچھ نہیں
موت سے پیدا کوئی جینے کی صورت کیجئے(۳۰)

زندگی کچھ دنوں کے ہنگامے اور پھر گہری نیند سو جانا ہے
زندگی ہے ابھرتا سورج عرشؔ اس کو آخر غروب ہونا ہے (۳۱)

زندگی پر ہو نہیں سکتی اجل دسترس
موت سے بحر بقا میں اک حباب زندگی(۳۲)

یہاں حیات و اجل کے تصورات عرشؔ کی شاعری میں ملتے ہیں وہیں اردو کے دیگر بڑے شاعروں کے یہاں اس نوعیت کے کئی اشعار ملتے ہیں۔مثلاً جگرؔ مرادآبادی لکھتے ہیں:

زندگی ہے نام جہد جنگ کا
موت کیا ہے بھول جانا چاہیے(۳۳)

بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گزرے (۳۴)

ضیاؔ جالندھری یوں کہتے ہیں:

ضیاؔ وہ زندگی کیا زندگی ہے
جسے خود موت بھی ٹھکرا گئی ہو (۳۵)

کیلاش ناتھ میکشؔ کشمیری کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کریں:

شبنم افشاں ہے کبھی شعلہ فغاں ہے زندگی
جان لیوا بھی ہے گر آرام جاں ہے زندگی(۳۶)

زندگی جہد مسلسل اک سفر لا منتہی
ہر گھڑی ہر پل رواں ہر دم دواں ہے زندگی(۳۷)

جگرؔ ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے۔وہ اپنے زمانے تک کے پہلے شاعر تھے،جنہیں پدم بھوشن کا خطاب ملا تھا۔جگرؔ کا نام زبان پر آتے ہی فوراً خیال ان کی شراب نوشی کی جانب اٹھ پڑتا ہے۔وہ زندگی سے سمجھوتا کرنے پر مجبور تھے لیکن عرشؔ صہبائی زندگی کے ہر امتحان میں صبر آزمائی کا مظاہرہ کرتے تھے۔انہوں نے زندگی

کے دیئے گئے تمام ہچکولوں کومسکرا کرسہااور اپنی شاعری کے زریعہ اپنے جیسے کئی لوگوں کی خوصلہ افزائی کی ہے۔ ان کے یہاں جوشعری پیکر ہے وہ کہیں میرؔ کہیں جگرؔ اور کہیں مومنؔ وحسرتؔ جا کوملتا ہے۔ یہ شعر دیکھئے:

پھول رہتے ہیں ہمیشہ تیز تر کانٹو ں کے بیچ
زندگی کی ہر خوشی عمر کی نگہبانی میں ہے (۳۸)

ساحلؔ احمد اپنے ایک مضمون میں موصوف کے متعلق رقمطراز ہیں ۔'' زندگی کے رمزی کنایات اور اشاراتی پیکروں کوانہوں نے جس طور سمجھا اورانہیں شعری تلازمات کا حصہ بنایا وہ صرف ان کی صلاحیت ذہنیہ تھی ورنہ زندگی ایسے ہزار پہلو رکھتی ہے جس تک رسائی پا لینا مشکل امر ہے۔ انہوں نے زندگی میں رنج وغم کے بھی چراغ جلتے دیکھے ہیں اور خوشی کے پھول بھی کھلتے دیکھے ہیں ۔'' (۳۹) جس طرح انسان کی تمام خواہشیں، حسرتیں اور آرزوئیں مٹ جائیں تو اس کی زندگی بے کیف ہو جاتی ہے اس کے اندر جینے کا لطف باقی نہیں رہتا اسی طرح انسان کی زندگی سے غم ،خوشی، غم اور پریشانیاں نکل جائیں تو بھی اس کا لطف باقی نہیں رہتا بلکہ انہیں کے دارومدار پر زندگی کا حسن ہوتا ہے۔ عرشؔ کو اپنی زندگی میں چونکہ ہمیشہ مشکلات و پریشانیوں سے واسطہ رہا ہے اس لئے ان کے کلام میں بھی اس کا برملا اظہار موجود ہے۔ چند اشعار اور ملاحظہ کریں:

یہ ناؤ زندگی کی کیوں ڈگمگا نہ جائے
غم کے سمندر میں گہرئیاں بہت ہیں(۴۰)

زندگی آج بھی رستا ہوا اک زخم ہے عرشؔ
آج بھی صورت حالات پر امید نہیں(۴۱)

دور تک بکھری ہوئی راکھ ہے ارمانوں کی
زندگی تو ہی بتا تجھ کو کہا ں لے کے چلیں (۴۲)

ہزاروں مشکلوں میں بھی ہے زندہ عرشؔ صہبائی
اسے جب دیکھتی ہے زندگی حیران ہوتی ہے(۴۳)

ہم اپنی زندگی کی اور کیا کر تفسیر
اک ایسا پھول کہ جس میں نہ بو نہ باس کوئی (۴۴)

عرشؔ پہلے شاعر ہیں نہ آخری کہ جن کے یہاں زندگی اور مشکلات زندگی کا مظاہر ملتا ہے بلکہ ہر دور میں میں شاعروں کو جن حالات سے واسطہ پڑا ہے اس کا اظہار ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً فانیؔ بدایونی کا یہ مشہور شعر دیکھئے:

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مرمر کے جئے جانے کا (۴۵)

ساحرؔ لدھیانوی کا انداز دیکھئے:

تنگ آچکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں کہیں جہاں کو بے دلی سے ہم (۴۶)

پریمؔ وار برٹنی کا یہ شعر دیکھئے:

یہ زندگی ہے یا کسی جوگن کے دل کی آہ
جس کے لئے فقیر کتنے ہوئے بادشاہ (۴۷)

مظہر حسین قیصرؔ کا شعر اس بات کی تصدیق کرتا ہے ملاحظہ کریں :

ہائے رے جور گردش ایام
زندگی سے بھی بڑھ گئے آلام (۴۸)

ساحرؔ لدھیانوی لکھتے ہیں:

زندگی کا نصیب کیا کہیے
ایک سیتا تھی جو ستائی گئی (۴۹)

حفیظؔ جالندھری کہتے ہیں:

بے تعلق زندگی اچھی نہیں زندگی کیا موت بھی اچھی نہیں
آج بھی پایا ہے ان کو بدمزاج صورت حالات ابھی اچھی نہیں (۵۰)

عرشؔ کا کلام ایسے اشعار سے لبریز ہے۔ ان کے مجموعہ کلام ''شبنم تیری یادوں کی'' میں زندگی کے حوالے سے 52 / اشعار پر مشتمل ایک طویل غزل موجود ہے جس میں مختلف ادوار زندگی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عرشؔ کی شاعری کا مرکزی محور زندگی ہے اور زندگی ان کی محبوب بھی ہے اور رقیب بھی تو بے جا نہ ہوگا۔

انہیں زندگی کا شاعر کہنے والے نے بھی میری طرح اس بات کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ ان کی ہر غزل میں ایک دو اشعار زندگی کے متعلق دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔کہیں وہ زندگی کو مسرت وشادمانی کے طور پر پیش کرتے ہیں تو کہیں زندگی کی بے ثباتی کا رونا رودیتے ہیں لیکن دونوں انداز ایک بات کا شدت احساس موجود ہے کہ موصوف زندگی میں غم اور مسرت کو برابر گردانتے تھے۔ان کے چند اشعار ملاحظہ کریں جن میں ان کے زندگی کے متعلق مختلف نظریات کا اظہار ملتا ہے:

اب نہ وہ رنگ ہے اس میں نہ وہ خوشبو اے عرشؔ
زندگی کوئی فسردہ سی کلی ہو جیسے(۵۱)

اس میں غم بھی ہے اور راحت بھی
زندگی کا یہ رکھ رکھاؤ ہے (۵۲)

آفتیں دیں ،کئی بلائیں دیں
زندگی نے کڑی سزائیں دیں(۵۳)
غموں سے زندگی جب جب بھی سنگسار ہوئی
نگاہ وقت میں یہ اور پر وقار ہوئی (۵۴)

میں نے خود حادثوں کو دعوت دی
زندگی یہ تیرا کمال نہیں (۵۵)

جو کوئی زندگی کو موڑ نیا دیتا ہے
لوگ اس شخص پہ آواز بھی کستے ہیں بہت (۵۶)

تمام زندگی کانٹوں کے درمیاں گزری
خدا کا شکر میں شرمندہ بہار نہ تھا(۵۷)

مندرجہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عرشؔ نے اپنی غزلوں میں جیسے ساری زندگی کا نچوڑ پیش کر دیا ہو۔ان کے کلام میں زندگی کی اکاسی کی یہاں تک بات ہے اس کا مکمل احاطہ کرنے لگیں تو ایک ضخیم کتاب پرتیب دی جاسکتی ہے۔ان کا ایک ایک شعر ان کی زندگی کا آئینہ ہے جس میں مبالغہ اور تخیل کا تانا بانا تو کجا ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس میں تصنع و بناوٹ کی جھلکی ہو۔عرشؔ کو زندگی سے محبت بھی تھی اور شکایتیں بھی لیکن وہ

باوجود مشکلات کے زندگی سے بدزن اور ناامید نہیں ہوئے اور نہ اسے برا بھلا کہا بلکہ ہمیشہ اس کے حسین گوشوں کو تلاش کرتے تھے۔ عرشؔ کے متعلق اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ کے بعد اتنی بات بڑے اعتماد بلکہ وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ عرشؔ کو زندگی نے نہیں بلکہ زندگی کو عرشؔ نے ہر قدم اور ہر مقام پر شکست سے دوچار کرتے ہوئے اسے چیلنج کیا ہے کہ وہ چاہے کتنے ہی حربے آزمالے، وہ اس سے دبنے یا ڈرنے والے نہیں۔ زندگی کی جیسی ترجمانی عرشؔ کے یہاں ملتی ہے وہ جدید شاعری کی تاریخ میں بہت کم شاعروں کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مثلاً:

وجود زندگی ہے مشکلوں کے ربط و پیہم سے
کوئی نغمہ ہو دنیا میں رہیں ساز ہوتا ہے(۵۸)

ہر اپنائے ہوئے ہیں وہ رسم و رواج
زندگی دیوار کا سایہ ہوا (۵۹)

کلاسیکی ادب سے گہرے تعلق کی بنا پر عرشؔ کا جوہر اس کی غزلوں پر بھی کافی نکھرا ہے۔ موجودہ اردو کی غزل گوئی اپنے انحطاطی دور سے گزر کر نئی زندگی اور نئی قدریں پا چکی ہے۔ آج کی غزل گوئی میں متعدد نئے نئے زاویے اور گوشے ابھر آئے ہیں اور آج کے غزل گو کے گردوپیش، نئے موضوع، نئی زندگی، نئی امنگیں، نئے خیالات اور نئے نئے جذبات انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ آج کی غزل گوئی ذاتی اور محدود سی صنف نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس نے اپنے مزاج کی لچک کے سہارے اپنے اندر عالمگیریت، آفاقیت اور لامحدودیت پیدا کر لی ہے اور آج کی دنیا کے تقریباً سارے کے سارے تقاضے اور موضوعات غزل کے دامن میں نظر آتے ہیں۔ عرشؔ صہبائی کی غزلیں ان تمام خصوصیات سے بھرپور ہیں۔ جب انہوں کی شاعری کے میدان میں قدم رکھا تھا تب وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کے بھی نئے نئے تقاضے بھی ابھر رہے تھے اس لئے شاعری کے موضوعات میں بھی تبدیلی آرہی تھی۔ عرشؔ چونکہ ایک پرخلوص، نیک سیرت اور انسانیت پرست انسان تھے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ان کی شاعری اپنے بدلتے ماحول اور معاشرے سے پیدا ہونے والے حقائق سے الگ رہتی۔ بقول عرشؔ:

ہزاروں حادثوں میں سکوں ہے دل کو
میں وہ چراغ ہوں جو آندیوں میں جلتا ہے (۶۰)

عرشؔ صہبائی کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے روایت پسندی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کو اس حسیت

روشناس کروایا جو ان سے پہلے جدید شعری ادب میں نا پید تھی ۔علوم نظریات و افکار و موضوعات کی طے شدہ بندشیں عرشؔ کے شعری کا مسئلہ نہیں بنتیں ۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سب جذبوں کے رنگ خالص ہیں اور ان کا شعری اظہار معصوم اور سادہ ہے۔رومان ،طلسم ،خوف ،دہشت ،تنہائی ،حکمت ،اخلاق ،موت ،حیات وغیرہ سب کی اپنی اپنی شکلیں ہیں لیکن عرشؔ کے ہاں کسی جذبے یا خیال کی محض صوری یا اکہری پیش کش بہت کم ہے کیوں کہ عرشؔ جذبے کی تفصیل کے بجائے اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی واردات کا مختصر بیان کرتے ہیں اور یہ ایجاز و اختصار ہی ان کے ہاں ابلاغ بن جاتا ہے۔چونکہ ٹھوس موضوعات کے برعکس ایک متحرک صورت حال ہے اس لئے عرشؔ کے شعر میں اسی صورت حال کے پیش نظر خیالات و احساسات طلسمی رنگوں کی مانند اپنی جگہیں بدلتے رہتے ہیں۔کبھی ایک رنگ غالب آتا ہے تو کبھی دوسرا دراصل جو فنکار بھی کسی مخصوص فکری رجحان یا مخصوص نظریے سے بچ نکلتا ہے اس کے ہاں اس قسم کا حسی اضطراب اور تخلیقی تنوع نظر آتا ہے۔

عرشؔ صہبائی کی ابتدائی غزلوں میں تازگی اور جدت ادا کے ساتھ ساتھ کلاسیکی رچاؤ جا بہ جا موجود ہے لیکن دور آخر میں پہنچ کر ان کی غزل نے اپنا ایک الگ انداز اختیا کر لیتی ہے۔ان کی انداز بے باکانہ شعر کہنے کا تھا۔انہوں نے اپنی پوری غزلیہ شاعری میں جھجک اور تکلف کو نہ صرف بالائے طاق رکھا ہے بلکہ اس تکلف اور جھجک کے محرکات یعنی مذہبی علم ،نظام تعلیم اور مشاہدے و مطالعہ سے حاصل کی ہوئی لفظیات ،خیالات ، اصطلاحات اور روایات کو اپنی شاعری سے خوبصورتی اور ہنرمندی سے استعمال کیا ہے۔عشق ،سیاست ،تصوف اور تصورات پر انہوں نے عمدہ شاعری کی ہے۔ان کی غزلوں میں کلاسیک کی خوشبو بھی ہے اور جدیدیت کا رنگ بھی۔انہوں نے پرانی باتوں کو نئی طرز دی ہے اور نئی باتوں کو سلیقے سے شاعری کا حصہ بنایا ہے۔اردو کے دیگ کئی اچھے شاعروں میرؔ ،غالب ،مومنؔ ،فراقؔ ،جوشؔ ،داغؔ وغیرہ کی طرح عرشؔ نے بھی اپنی شاعری میں شعری صنائع کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔تشبیہ ،استعارے ،اشارے ،کنائے اور لف ونشر کے علاوہ ان کی شاعری میں تلمیح نئے نئے رنگوں میں جلوہ گر ہوئی۔مثلاً ان کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

کہیں نہ طنز کریں تم پہ آئندہ نسلیں
فقیر شہر کے تن پی لباس رہنے دو (٦١)

نہیں اک خیر مقدم کو حوادث
ہمارے قدرداں کچھ اور بھی ہیں (٦٢)

ممکن نہیں کہ ایک سا سب کا مزاج ہو
دنیا میں سب کے ہوتے ہیں حالات مختلف (۶۳)

دل کا دامن ذرا کشادہ کر
حادثوں سے بھی استعفادہ کر(۶۴)

نت نئے حادثات کرتی ہے
زندگی تجربات کرتی ہے(۶۵)

پر خطر راستوں پہ چلتا ہے
جو بشر حادثوں پہ چلتا ہے (۶۶)

وفا کے واسطے جینا بھی اور مرنا بھی
یہی پیام وفا کے سفیر چھوڑ گئے (۶۷)

کہاں کہاں تیرے جلوے نہیں ہیں رنگ فشاں
کہاں کہاں تجھے اہل نظر تلاش کریں (۶۸)

عرشؔ کی شاعری میں آج کے عہد کی زندگی اور اس کے مسائل کا پرتو نظر آتا ہے۔عرشؔ کی غزل گوئی میں امیج سازی اور پیکر تراشی کی صفات بھی ملتی ہیں۔ان کے معاصرین میں ایسے شاعروں کی ایک لمبی فہرست موجود ہے جن کی شاعری میں لفظی توازن کی شدت موجود ہے۔عرشؔ کی شاعری میں یہ چیز بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔عرشؔ کے یہاں بعض اشعار ایسے مل جائیں گے جو ضرب المثل کی حیثیت کے حامل ہیں کیوں کہ ان کے بے شمار ایسے اشعار ہیں جو زبان زد ہوگئے ہیں اور لوگ شاعر کے نام کو چاہے نہ جانتے ہوں لیکن ان اشعار کو اکثر ادبی مجلسوں کے افتتاح اور اختتام پر استعمال میں لاتے ہیں۔کسی شاعر کے مقبول ہونے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ اس کے اشعار زبان زد ہو جائیں۔یہ کسی عام شاعر کے بس کی بات بھی نہیں ہوتی کے طے شدہ تجربات و حقائق کو محض دو مصرعوں میں ایسے باند دینا کہ زبان و ذوق، ذہن و دل، سب کی کسی نہ کسی طرح سیرابی ہو جائے۔مسلمہ حقائق و تجربات کو شاعری میں پیش کرنے والوں کی اردو غزل کی روایت میں بہت لمبی فہرست موجود ہے۔لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر وہی اشعار ضرب المثل ہوگئے جن کا طرز بیان عام فہم، سادہ اور

دلنشیں ہو، جو پڑھنے والے یا سننے والے کے ذہن پر فوراً نقش ہو جائے اور جو زندگی کے مختلف حقائق و مسائل کو آسان لفظوں میں ترجمانی کرے۔ اگر ہم اردو شعر و ادب کے اوراق پارینہ کو الٹ کر دیکھیں تو محاورے اپنے لفظی اور معنوی دلکشی خوبصورتی سے رمز و کنایہ کا ایک گلستان معنی بکھیرتے نظر آئیں گے۔ ان محاوراتی اور کہاوتی اسلوب نے شعر و ادب میں ایسے گل کھلائے ہیں کہ شعر و ادب کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ بعض شعرا کے اشعار ایسے زبان زد خاص و عام ہیں کہ محض انہیں اشعار کی بدولت ان کے نام بھی زندہ ہیں۔ ایک اچھا شعر انسان کو فرحت و تازگی بخشتا ہے اور اس کے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دیتا ہے۔ ایک باذوق شخص کوئی خوبصورت شعر جب سنتا ہے تو پھڑک اٹھتا ہے۔ اس پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اس کے منہ سے بے ساختہ 'واہ' نکل جاتی ہے اور وہ گھنٹوں اس شعر سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ بقول حسرتؔ موہانی:

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں (۶۹)

اب میں اردو کے چند شعراء کے ضرب المثل اشعار کی مثالیں پیش کرتا ہوں اور پھر اس کے بعد عرشؔ صہبائی کے کلام میں اسی نوعیت کے اشعار کی ترتیب بھی پیش کروں گا۔ بقول الٰہی بخش معروف:

کہاں تک راز دل افشا نہ کرتا
مثل یہ ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا (۷۰)

بقول امیرؔ مینائی:

زیست کا اعتبار کیا ہے امیرؔ
آدمی بلبلہ ہے پانی کا ! (۷۱)

شادؔ عظیم آبادی:

محبت میں نہ کیوں جی سے گزرتا
مثل سچ یہ ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا (۷۲)

فانیؔ بدایونی:

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے (۷۳)

بقول قابلؔ اجمیری:

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا(۷۴)

ایک شعر ناصرؔ کاظمی کا شعر دیکھئے:

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہونگے کوئی ہم سا ہوگا(۷۵)

شاہ مبارک آبروؔ:

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے
کہ اس کو بد نما لگتا ہے جیسے چاند کو گہنا(۷۶)

شوقؔ لکھنوی:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے(۷۷)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہی اشعار ضرب المثل بن سکتے ہیں جن میں قاری کی توجہ اپنی طرف مائل کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور جن میں خیال کچھ ایسے انداز سے پیش کیا گیا ہوتا ہے کہ پڑھنے یا سننے والوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ خیال ان کے دل میں پہلے سے موجود تھا۔ اردو کے بہت کم شاعروں کو ایسے اشعار کہنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے لیکن جن کو نصیب ہوئی ہے ان میں ایک نام عرشؔ صہبائی کا بھی شامل ہے۔ عرشؔ کے یہاں بھی بے شمار ایسے اشعار ہیں جو مسلمہ حقائق پر مبنی ہیں اور جو اپنے خیال کی ہم گیری انداز بیان کی وجہ سے ہر نوعیت کے قاری کے دل پر گیرے اثرات مراتب کرتے ہیں۔ اب موصوف کے چند اشعار ملاحظہ کریں جو میری اس وضاحت کا جواز ہیں۔ بقول عرشؔ:

ہر عمل کا ہے یہاں رد عمل
''کاٹنا ہے وہی جو بونا ہے''(۷۸)

کس پہ ہنسنا ہے کس پہ رونا ہے
''ہوکہ رہتا ہے جو بھی ہونا ہے''(۷۹)

رنج راحت فزا بھی ہوتا ہے
''غم ہی غم کی دوا بھی ہوتا ہے''(۸۰)

کھل ہی جائے گا جب پرکھ ہوگی
''کون پیتل ہے کون سونا ہے''(۸۱)

مصیبت جب بھی آتی ہے کبھی تنہا نہیں آتی
''وہیں موجیں اچھلتی ہیں جہاں طوفان ہوتا ہے''(۸۲)

زندگی ہے ابھرتا سورج عرشؔ
''اس کو آخر غروب ہونا ہے''(۸۳)

ہزاروں بندشیں بھی ہوں ہزاروں سختیاں بھی ہوں
''کبھی دبتی نہیں ہے حق کی جو آواز ہوتی ہے''(۸۴)

بکھرتی ہے وہیں سے زندگی کی روشنی اکثر
یہ دیکھا ہے کہ جو بھی جھونپڑے تاریک ہوتے ہیں (۸۵)

اردو کے اکثر شاعروں کے یہاں کہاوتوں پر مبنی اشعار ملتے ہیں۔ایسے موضوعات کو شعر میں باندھنا مشکل فن ہے لیکن اس فن میں بھی عرشؔ کو مہارت حاصل ہے۔قربان علی سالکؔ کے کلیات میں کئی اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں اردو کی مشہور کہاوتوں کو شعری سانچے میں پرویا گیا ہے۔مثلاً درج ذیل شعر دیکھئے:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے(۸۶)

سالک نے مندرجہ بالا یہ میں تندرستی ہزار نعمت کو شعر میں باندھا ہے او وہ اس میں کامیاب بھی ہیں۔ علاوہ ازیں ''بد کا انجام برا'' کو اسمعیلؔ میرٹھی نے اپنے شعر میں یوں باندھا ہے ملاحظہ کریں:

بد کی صحبت میں مت بیٹھو اس کا انجام برا
بد نہ بنے تو بد کہلائے بد اچھا بدنام برا(۸۷)

عرشؔ صہبائی کے یہاں بھی کئی اشعار ایسے ملیں گے جن میں انہوں نے بھی کہاوتوں اور محاوروں کو شعری جامہ پہنا کر اپنی فنکاری کا عمدہ ثبوت دیا ہے۔مثلاً عرشؔ کا یہ شعر دیکھئے جس میں ''انگور کھٹے ہیں'' کو انہوں یوں اپنی شعر میں باندھا ہے:

ٹیڑے جو بھی کام ہوں ان سے رہیے دور
کہیں نہ یہ کہنا پڑے کھٹے ہیں انگور(۸۸)

وہ ہوئے جب مائل لطف و کرم
ہم ہیں قطرے سے سمندر بن گئے(۸۹)

جانتا ہوں میں انا اک آگ کا دریا ہے عرشؔ
پار کرنا ہے مگر یہ آگ کا دریا مجھے(۹۰)

عرشؔ اپنے اسلوب کے خود تخلیق کار ہیں لیکن کہیں کہیں ان کے یہاں روایتی اسلوب بھی ملتا ہے جو داغؔ اور جوشؔ سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ جو لفظی توازن و تناسب اردو شاعری کا اہم حصہ ہے وہ عرشؔ کے ہاں بھی دیکھنے کا ملتا ہے۔ ان کے یہاں اعلیٰ درجے کی حاضر جوابی اور بات سے بات پیدا کرنے کی صفت موجود ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز ترین ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں روایت سے زیادہ انفرادی عنصر ملتا ہے۔ عرشؔ اردو شاعری کی روایت سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان بیشتر کا کلام عیوب اور اسقام سے پاک ہے۔

عرشؔ صہبائی کی شاعری میں زبان کی سلاست اور فصاحت کے ساتھ ساتھ ان کے شعر کہنے کا منفرد انداز دلکش اور پر اثر ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں شگفتگی، خیال کی بلندی، اور جدت بدرجہ اتم موجود ہے جو قاری خضرات کو اپنی جانب مائل کرنے میں کارگر ثابت ہوتی ہے۔ موصوف عام فہم اور سادہ الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے قائل تھے۔ ان کی شاعری کی تمام خصوصیات اور فنی لوازمات موجود ہیں جو کامیاب شاعر کی شہرت کا باعث ہوتے ہیں۔ پرروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں عرشؔ صہبائی کی شاعرانہ خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے یوں کہا ہے: ''وہ زبان محاورے، طرز ادا اور شعری محاسن کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ فنی خوبیوں کا بھی دھیان رکھتے ہیں''(۹۱)

اردو شعری اسلوب کی جمالیات میں الفاظ کی تکرار بھی ایک اہم وصف ہے جو شعر کو حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ بعض شعرا کے یہاں اس قسم کے اشعار کی بر مار ملتی ہے جن میں تکرار لفظ کا ستعمال موجود ہوتا ہے۔ یہ اردو کے شعری ادب کی خصوصیت ہے کہ بعض تکرار سے مبالغہ یا کثرت ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے چلتے چلتے رک جاتے ہیں، آتے آتے تیری یاد آ گئی، جاتے جاتے تم چلے گئے، کیسے کیسے ہمیں لوگ ملے وغیرہ۔ یہ تکرار لفظی بھی کسی شاعر

کے کلام کے اعلیٰ ہونے کی ایک نشانی قرار دی جاسکتی ہے۔ پہلے اردو کے مختلف شعراء کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں جن تکرار لفظی پائی جاتی ہے۔ مثلاً۔ میرؔ کا یہ شعر بھی دیکھئے جس میں ''آگے آگے'' کی لفظی تکرار ملتی ہے:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا (۹۲)

داغؔ دہلوی کا یہ شعر دیکھئے جس میں ''باتوں باتوں'' کی تکرار موجود ہے:

غیر کا قصہ شب وصل میں کیوں لے بیٹھے
باتوں باتوں میں یوں ہی وقت گزر جائے گا (۹۳)

حسرتؔ موہانی کا شعر ''آہستہ آہستہ'' کی لفظی تکرار دیکھئے:

بہت نادم ہوئے آخر وہ میرے قتل ناحق پر
ہوئی قدر وفا جب آشکار آہستہ آہستہ (۹۴)

فراقؔ گورکھپوری نے ''کہاں کہاں'' کی لفظی تکرار کو اپنے ایک شعر میں یوں برتا ہے:

سرحد غیبت تک تجھے صاف ملیں گے نقش پا
پوچھ نہ یہ پھرا ہوں میں تیرے لئے کہاں کہاں (۹۵)

ناصرؔ کاظمی کے یہاں بھی اس قسم کے اشعار ملتے ہیں جن میں لفظی تکرار کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

دل ویراں آنکھیں بے نور(۹۶) تنہا تنہا پھرتے ہیں

عرشؔ صہبائی کا شمار بھی انہیں شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے نہ دیدہ دل کے خون سے غزل میں رنگ بھرا ہے بلکہ شاعری اور حسن کاری کے تقاضوں کو بھی پورا کرنے پر بھی بڑی توجہ دی ہے۔ یعنی نہ صرف معنوی اعتبار سے بلکہ لفظی اور صوتی لحاظ سے بھی غزل کی آرائش کی اور اپنے ذوق و جمال، حسن نظر اور سلیقہ اظہار کو بروئے کار لاکر عروس غزل کے گیسو سنوارے۔ اگر کہیں کہیں لفظی صنعت گری ہے تو اس کے ساتھ ہی فصاحت و بلاغت اور سہل ممتنع کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جس سے ہماری روایتی غزل کی آبرو قائم ہے۔ ان کی غزلوں مین سادگی، رعنائی اور معنویت ایک ساتھ جلوہ گر ہے۔ عرشؔ نے حسن و عشق کے معاملات، قلبی واردات، زندگی اور کائنات کے اسرار و رموز بیان کرنے کے لئے کبھی روایتی اور کبھی نئے نئے اسلوب تلاش کئے، دریائے معانی کو کوزے میں بند کرنے کے لئے ایمائیت اور اشاریت سے بھی کام لیا ہے۔ عرشؔ صہبائی

اصول فن اور صحت زبان دونوں کا خصوصی خیال رکھنے کے قائل تھے۔ان کے یہاں بھی دیگر شعراء کی طرح ایسے اشعار موجود ہیں جن میں لفظی تکرار سے شعری حسن پیدا کیا گیا ہے۔ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

’رفتہ رفتہ‘ بھولتا جاتا ہوں سارے واقعات
یہ تمنا ہے کہ ماضی کی صدا بن کر گزر (۹۷)

بس اتنا پوچھا کہ وہ کیوں ’خفا خفا‘ سا ہے
دل و نظر کی تمنا کوئی مزید نہ تھی (۹۸)

اسے یہ دعویٰ مساوات کا وہ حامی ہے
’بشر بشر‘ میں جو کرتا ہے امتیاز بہت (۹۹)

نہیں معلوم اگر وہ مشتعل ہوں
لب نازک سے ہو ارشاد ’کیا کیا‘(۱۰۰)

وطن کے ذرے ذرے سے ہے ظاہر
ستارے ضوفشاں کچھ اور بھی ہیں(۱۰۱)

کون یکجا کرے مجھے اے عرشؔ
’تنکا تنکا‘ بکھر گیا ہوں میں(۱۰۲)

دل کے کھنڈرات میں بھی شہر بسے ہیں ’کیا کیا‘
عرشؔ اس وادی حسرت سے گزر کر دیکھو(۱۰۳)

اے عرشؔ کیا بتاؤں میں ’کس کس‘ کی زد میں ہوں
قسمت ہے اور گردش ایام اور ہے(۱۰۴)

وہ سایہ بن کے میرے ’ساتھ ساتھ‘ رہتا ہے
اگرچہ زندگی میں میرا ہم سفر بھی نہیں(۱۰۵)

’گاہے گاہے‘ کرم بھی ہو جائے
جب ستم بے پناہ ہوتے ہیں(۱۰۶)

نہ کیجئے نظر انداز دل کے کھنڈرات
'کبھی کبھی' یہاں گہرے کھنڈرات ملتے ہیں(۱۰۷)

مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ بھی عرشؔ کے کلام میں اس قسم کے بے شمار اور اشعار موجود ہیں۔انھوں نے ایک اچھے شاعر کی طرح اپنی شاعری میں غیر معمولی، نامانوس اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا ہے۔شاعری کا حسن الفاظ پر مبنی ہے اور الفاظ معنی سے بھی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ہر شاعر کا یہ مقصد ہوتا کے وہ اپنے معمولی سے خیال کو پر زور اور رعب دار الفاظ کی مدد سے بہتر کرے پیش کرے۔اس سلسلے میں عرشؔ کا انتخاب الفاظ اور لب ولہجہ عام سطح سے بلند ہے۔عرشؔ کا یہاں الفاظ بھی شاعری کا ایک جز ہیں لیکن شاعری انہیں کے دم پر منحصر نہیں ہے۔پہلے ذکر ہوا ایک لفظ کی دوبار تکرار کا اور اس کی مثالیں مختلف شعرا کے کلام سے دی گئیں اور اس ساتھ ساتھ عرشؔ کے اشعار بھی پیش کئے گئے جن میں دو لفظی تکرار ملتی ہے۔اس کے بعد ہم بات کرتے ہیں تین لفظ تکرار کی جو اپنی آپ میں ایک اہم خصوصیت کی حامل ہے۔اس قسم کے اشعار جن میں ایک لفظ کی تین بار تکرار ہو ہمیں اردو کے کئی اچھے شاعروں کے یہاں مل جاتے ہیں۔مثلاً شیخ ظہور الدین حاتمؔ کا یہ شعر دیکھئے جس میں لفظ 'عیب' کو تین بار استعمال میں لایا گیا ہے:

در پے ہے عیب جو تیرے حاتمؔ تو غم نہ کھا
دشمن ہے عیب جو تو خدا عیب پوش ہے(۱۰۸)

فانیؔ بدایونی کی غزل کا یہ شعر بھی اسی نوعیت کا ہے جس میں لفظ 'کیا' کی تکرار ہے:

اس نے دل کی حالت کا کیا اثر لیا ہوگا
دل نے کیا کہا ہوگا دل ہے بے زبان اپنا(۱۰۹)

داغؔ دہلوی کے یہاں اس قسم کے اشعار کثرت سے ہیں جن میں لفظی تکرار ملتی ہے۔ان کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

چوٹ کھانا دل حزیں نہ کہیں
درد رہ جائے گا کہیں نہ کہیں(۱۱۰)

فراقؔ گورکھپوری کا یہ شعر جس میں لفظ 'موت' کی تکرار تین بار ہے۔شعر ملاحظہ کیجئے:

موت اگرچہ موت ہے موت سے زیست کم نہیں (۱۱۱)

نظیرؔ اکبرآبادی نے لفظ 'کبھی' کی تکرار تین بار لائی ہے:

کبھی جھجھک کبھی بس بس کبھی پیالہ پٹک
وہ ناز کرتے ہیں کیا کیا شراب پینے میں(۱۱۲)

مرزا محمد رفیع سوداؔ:

فکر معاش ،عشق بتاں ،یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے(۱۱۳)

حیدر علی آتشؔ کے اس شعر کو دیکھئے ''کس کس کس'' کی تکرار واضع ہے:

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لئے کس کس کا ماتم کیجیے(۱۱۴)

اردو غزل کی فنی روایت میں نئے رنگ بھرنے والوں کی فہرست میں عرشؔ صہبائی کا نام بھی لکھا جا سکتا ہے کیوں کہ ان کی شاعری روایتی شاعری سے زیادہ مختلف بھی نہیں ہے۔ان کا اسلوب وہی ہے جو اردو غزل کا روایتی اسلوب ہے۔عرشؔ شعر وادب میں زبان کی شائستگی ،نفاست ،نرمی ،رچاؤ اور گھلاوٹ کے قائل تھے۔مندرجہ بالا اشعار میں ایک لفظ کی تین بار تکرار کا تذکرہ ہوا ہے۔عرشؔ کے کلام میں ایسے اشعار بہت ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

حقیقت پھر حقیقت ہے یہ مٹ سکتی نہیں ہر گز
حقیقت میں فقط آغاز ہی آغاز ہوتا ہے(۱۱۵)

داغ دل داغ جگر اور اس پہ داغ آرزو
کون سی شے کی کمی ہے تیرے دیوانے کے پاس(۱۱۶)

ایسے میں اک چراغ جلائے چراغ کو
ملتے ہیں ایک دوسرے سے جب گلے چراغ(۱۸۷)

جو پست قد ہیں وہ سب سے بلند ہوتے ہیں
بتاؤ ں کیا یہاں کیا کیا کمال ہوتا ہے(۱۱۸)

عمر ساری تو اسی ایک کشا کش میں کٹی
کاش ایسا کبھی ایسا کبھی ایسا ہوتا(۱۱۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری ایک ایسا اعلیٰ پر ین فن ہے۔اس کے لئے یہاں انسان کی حساس طبیعت کو دخل ہے وہیں ایک اچھا زبان داں ہونا ضروری ہے۔ایک اچھے زبان داں میں اپنے احساس، جذبات اور محض معمولی خیالات کو بھی پر اثر انداز میں دوسرے کے سامنے رکھنے کی قوت ہوتی ہے۔شعر کسی بھی صنف کا ہو اس میں خیال کے اہمیت کے ساتھ ساتھ بہترین الفاظ کا انتخاب خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ عرشؔ نے قدم قدم پر اردو کی شعری روایت کی مکمل پاسداری کی ہے۔مندرجہ بالا اشعار میں ایک لفظ کی تین بار تکرار کا تذکرہ ہوا ہے لیکن اردو شعری روایت میں دیکھیں تو مختلف ادوار میں مختلف شعراء ایسے مل جائیں گے جن کے یہاں ایک لفظ کی دو، تین بار ہی تکرار نہ ہو کر چار، پانچ اور چھ بار تکرار بھی ملتی ہے جو ان کی فنی مہارت کا نمونہ ہے۔اس قسم کے اشعار داغ دہلوی کے یہاں بے شمار ملتے ہیں۔مثلاً داغ کا یہ شعر دیکھیں جس میں لفظ 'دیکھا' کی تکرار چار بار آئی ہے:

تصویر رخ یار کو دیکھا اسے دیکھا

خورشید پر نوار کو دیکھا اسے دیکھا(۱۲۰)

میرؔ تقی میر نے لفظ 'کیا' کو ایک شعر میں چار دفعہ اور دوسرے میں چھ دفعہ استعمال میں لایا ہے۔اشعار دیکھئے:

کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں میں نے

عشوہ و غمزہ و انداز و ادا کیا کیا کچھ(۱۲۱)

جور کیا کیا جفائیں کیا کیا ہیں

عاشقی میں بلائیں کیا کیا ہیں(۱۲۲)

ناصرؔ کاظمی نے لفظ 'کیسے' تکرار دیکھئے:

اٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ

ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش(۱۲۳)

ناصرؔ کاظمی شعر دیکھئے جس میں لفظ 'کیا'' چار بار استعمال ہوا ہے۔

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ

لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ(۱۲۴)

عرشؔ صہبائی کے کلام میں بھی بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں ایک لفظ کی چار اور پانچ بار تکرار پائی جاتی ہے۔کچھ اشعار بطور خاص:

جو دیکھا انہیں اک نظر جاتے جاتے
خفا وہ ہوئے کس قدر جاتے جاتے (۱۲۵)

ان سے کیا جو ذکر غم دل کبھی کبھی
وہ مسکرا دئے ہیں سر محفل کبھی کبھی (۱۲۶)

ہائے کیا کیا کام کرنے تھے ہمیں
ہائے کیا کیا کام ہم کرتے رہے (۱۲۷)

لے کر تیرے غموں کا سہارا کبھی کبھی
تنہائیوں میں وقت گزارا کبھی کبھی (۱۲۸)

کبھی کبھی یہی بنتا ہے کرب کا باعث
کبھی کبھی غم دل میرا غم گسار بھی ہے (۱۲۹)

کبھی کبھی یہ خوشی سے بھی ہمکنار رہے
کبھی کبھی میرے حالات سازگار رہے (۱۳۰)

ذرے ذرے میں اس کا پرتو ہے
ذرے ذرے میں ہے نمو اس کی (۱۳۱)

کلی ہو ، پھول ہو ، شبنم ہو ، ذرہ ہو ، ستارہ ہو،
نظر والے تجھے ہر رنگ میں پہچان لیتے ہیں (۱۳۲)

مندرجہ بالا اشعار سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عرشؔ ایک فطری شاعر تھے۔ ذوق شعر ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور ان کی شاعری اپنی ارفع خصوصیات کی وجہ سے اردو زبان میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب شعر میں موسیقیت اور غنائیت پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ اگر سادگی اور انداز بیان عمدہ ہو تو شعر کا رتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ عرشؔ صہبائی کی شاعری نے روایتی موضوعات نئے ڈھنگ میں بلکہ نئے انداز سے اپنی شاعری میں پیش کر کے روایت کی پاسداری بھی کی ہے اور انحراف کا کا پہلو بھی اجاگر کیا ہے۔ بلاشبہ عرشؔ مقبول ترین شاعر ہیں۔ پروفیسر ایس۔ اے۔ قاضی شاذؔ شرقی کی

رائے بھی اس سلسلے میں بہت اہم ہے:

عرشؔ نہ ترقی پسند ہے نہ جدیدیہ۔اس نے ادب میں کسی ازم Ism کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ان تحریکوں اور مکاتب فکر کی بحث وتکرار سے بے نیاز وہ اپنی تخلیق کی دنیا میں مگن ہے۔وہ جان نثار غزل ہے بلکہ فنائی الشعرا۔اسے نہ جدیدیت سے وابستگی ہے نہ مابعد جدیدیت سے سروکار۔اسلوب میں روایت کا پاسدار رہتے ہوئے اس نے جدید لب ولہجہ، نئے علائم ،تازہ تلازمات اور نئے موضوعات کے تنوح سے اپنی شاعری کی تزئین وآرائش کی ہے اور جدید فکری دائروں میں نو بہ نو تجربات اور وقت کے تقاضوں کو تازہ کاری کے ساتھ شعری پیکروں میں ڈھالا ہے،اوران تجربات ورجحانات کے بیان اوراظہار میں شائستگی ہے،روانی ہے،زبان کی پاکیزگی،جذب اورامیج Image کی ہم آہنگی کی ہے۔(۱۳۳)

عرشؔ نے 1950ء کے زمانہ میں اپنے شعری سفر کا آغاز کیا ہے۔یہ وہ زمانہ تھا جب ہر صنف تجربات کا ایک طوفان لئے ہوئے اردو ادب کے افق پر نمودار ہوئی تھی۔عرشؔ نے بھی غزل میں کئی تجربے کئے اور دیگر اصناف کے مقابلے بطور غزل گوشاعر اپنی ایک شناخت قائم کی۔وہ تمام موضوعات انتظار،اداسی،تنہائی،محرومی، یافت ونایافت،محبت کی طلب،تصوف،حسن کی فراوانی،جذبہ عشق،سیاست،ترک محبت کی آرزو،اپنی ذات کی تلاش،زندگی کے مختلف پہلو جوابتدا سے اردو غزل کا حصہ رہے ہیں عرشؔ کی غزل میں بھی موجود ہیں لیکن صرف اس فرق کے ساتھ کہ ان عمومی موضوعات پر ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جہاں کسی اور شاعر کی تخیل کی پرواز نہ پہنچ پائی تھی۔عرشؔ نے اپنی غزلوں میں بعض نئے موضوعات کو بھی برتا ہے۔عرشؔ کی شاعری کے خاص موضوعات میں حسن عشق کا موضوع بھی اہم ہے۔سراپا محبوب واحوال عشق ومحبت کوشروع سے شاعروں نے اپنے کلام میں خاص اہمیت کا حامل سمجھا ہے۔اردو کی شعری روایت میں ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔جہاں محبوب کے طور عورت کے حسن کی بات ہورہی ہے۔محبوب مجازی کے حسن میں آنکھوں،لبوں اور رخساروں کو امتیازی اہمیت حاصل ہے۔اردو غزل کا لغوی معنی میں عورت کے متعلق باتیں کرنا بھی شامل ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ موضوع اردو غزل کی روایت کا اہم حصہ ہے۔اس پر موضوع پر ہر شاعر کے یہاں کچھ نہ کچھ اظہار خیال ضرور ملتا ہے۔جہاں سب شعراء کے کلام کا ذکر کر پانا تو ممکن نہیں لیکن چند شعراء کی غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ کریں۔سراج اورنگ آبادی کی غزل کا یہ شعر دیکھئے:

باغ میں نرگس حیراں نے تجھے دیکھ کہی
تیری آنکھوں سی کہاں لاج میری آنکھوں میں(۱۳۴)

اب وہ فرماتے ہیں کہاں میں نے دکھائی آنکھیں
آپ نے مفت میں رو رو کے سجائی آنکھیں(۱۳۵)

نظیرؔ اکبرآبادی کی غزل کا شعر ملاحظہ کریں:

نہ دن کو چین نہ رات کو خواب آنکھوں میں
بھر رہا ہے تیرے غم سے آب آنکھوں میں(۱۳۶)

ساحرؔ لدھیانوی لکھتے ہیں:

لب کچھ بھی کہیں اس سے حقیقت نہیں کھلتی
انسان کے سچ جھوٹ کی پہچان ہیں آنکھیں(۱۳۷)

میر تقی میرؔ:

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر یار دیکھنا
عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا(۱۳۸)

مومن خان مومنؔ کا شعر دیکھئے:

آنکھ لگتے ہی ناصح! کچھ نظر نہیں آتا
گر یقیں نہیں حضرت! آپ بھی لگا کر دیکھیں(۱۳۹)

فانیؔ بدایونی لکھتے ہیں:

وہ تو میرے سامنے تھے دیکھنے کی دیر تھی
میں نے آنکھیں بند کرلیں ورنہ پردہ کچھ نہ تھا(۱۴۰)

علامہ اقبالؔ لکھتے ہیں:

دل کی بربادی میں شامل تھی رضا آنکھوں کی
اس کی پاداش میں کام آئی ضیا آنکھوں کی(۱۴۱)

بقول بشیر بدرؔ:

دل میں اک تصویر چھپی تھی آن بسی ہے آنکھوں میں
شاید ہم نے آج غزل سی بات لکھی ہے آنکھوں میں(۱۴۲)

علی سردارؔ جعفری کے یہ شعر ملاحظہ کریں:

وہ میری دوست وہ ہمدرد وہ غم خوار آنکھیں
ایک معصوم محبت کی گنہگار آنکھیں(۱۴۳)

عرشؔ صہبائی کی بھی اس موضوع پر گہری نظر رہی ہے۔انہوں نے بھی اپنے محبوب کی آنکھوں کی خوبیوں کوکس کس انداز وزاویئے سے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ان کے یہاں بھی اس قسم کے بے شمار اشعار ہیں جو اردوغزل کی روایت میں اضافہ ہیں۔اس موضوع پر عرشؔ کے یہاں تعداد اتنی کثیر ہے کہ اگر سب کو ایک جگہ درج کریں تو ایک مکمل کتاب تیار کی جاسکتی ہے۔بہرحال ان کے کلام میں سے چند اشعار بطور مثال پیش ہیں:

یہی جی چاہتا ہے عرشؔ ان میں غرق ہو جائیں
وہ آنکھیں ہیں کہ نیلگوں سی جھیل ہوتی ہے(۱۴۴)

میں بکھر جاؤں گا مضاؤں میں
اپنی آنکھوں میں جذب کر مجھ کو(۱۴۵)

کچھ زباں سے بھی استعفادہ کر
آنکھوں آنکھوں میں گفتگو کیا ہے(۱۴۶)

صہبائے ناب میں بھی بلا کی ہیں مستیاں
لیکن تیری نگاہ کی کچھ اور بات ہے(۱۴۷)

ان کی نگاہ ناز کے انداز دیکھ کر
ان کی نگاہ ناز پہ قربان جایئے(۱۴۸)

جس مستی نگاہ کی شاداں ہے زندگی
اس مستی نگاہ کی کچھ اور بات ہے(۱۴۹)

کسی کی مے فروش آنکھوں کے ادنیٰ تغافل نے
بھری محفل میں عرشؔ اک پارسا کی آبرو رکھ لی(۱۵۰)

کسی صحرا میں جیسے کوئی چشمہ پھوٹ پڑتا ہے
وہ یاد آئے تو روئیں اس قدر بے اختیار آنکھیں(۱۵۱)

آنکھیں ہیں کہ مستی کے چھلکتے ہوئے ساغر
نازک سے وہ لب ہیں کہ شگفتہ سی کلی(۱۵۲)

ان کی آنکھوں میں وہ شوخی،وہ شرارت وہ ہنسی
جیسے بکھرے ہوئے فضاؤں سنہرے بادل(۱۵۳)

اگر خاموش سے ہونٹوں پہ بکھرے ہیں کئی نغمے
کسی کی مست آنکھوں میں بھی ہے اک گنگناہٹ سی (۱۵۴)

کس کی جرات کہ تمنائے مے و جام کرے
تیری آنکھوں نے قیامت کی کشش پائی ہے (۱۵۵)

مندورجہ بالا اشعار عرشؔ کے مختلف غزلوں میں پائے جانے والے چند اشعار ہیں جو محبوب کی آنکھیں کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔انہوں نے صرف اس موضوع پر ہی نہیں بلکہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کے ایک ایک نقطے کو کئی زاویوں سے تراش کر اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔انہیں غزل کے فن پر مکمل مہارت حاصل تھی۔اس کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں بہت سی غزلیں ایسی ہیں جو ایک موضوع پر کئی گئی ہیں۔ان کے یہاں کئی ایسی غزلیں موجود ہیں جن میں انہوں نے صرف محبوب کی آنکھوں کی تعریف کی ہے۔ایک غزل ملاحظہ کریں:

کیا مستی صہبا ہے ان جھیل سی آنکھوں
اک کیف کا دریا ہے ان جھیل سی آنکھوں
کیا کہیے کہ کیا کیا ہے ان جھیل سی آنکھوں ہیں
اک اور ہی دنیا ہے ان جھیل سی آنکھوں میں
کھلتے ہیں کنول جس میں احساس محبت کے
وہ شہر تمنا ہے ان جھیل سی آنکھوں میں
جیسے کسی وادی میں پوپھٹنے کا منظر ہو
یوں رنگ تمنا ہے ان جھیل سی آنکھوں میں
اب دل کے سفینے کا اے عرشؔ خدا حافظ
جو موج ہے دریا ہے ان جھیل سی آنکھوں میں (۱۵۶)

اس نوعیت کی بے شمار غزلیں عرشؔ کے کلام کا سرمایہ ہیں لیکن سب کو یہاں پیش کر پانا محال ہے۔بہر کیف ایک اور اسی نوعیت کی غزل کے دوشعر اور پیش ہیں:

نظر انداز کر دیتی ہیں وہ غفلت شعار آنکھیں
بجھتی جاتی ہیں پھر بھی راہ میں یہ خاکسار آنکھیں

نہ آیا ہے نہ آئے گا کبھی وہ اپنے وعدے پر
نہ جانے کس توقع پر ہیں محو انتظار آنکھیں (۱۵۷)

عرشؔ صہبائی کی شاعری زندگی اور حسن وعشق کا حسین مرقع ہے۔ اس بات کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ عرشؔ صہبائی نے منورؔ لکھنوی، نریش کمار شادؔ، فراقؔ گورکھپوری ساحرؔ لدھیانوی، منیرؔ نیازی، کیفیؔ عاظمی، ندؔا فاضلی، جوشؔ ملسیانی، بشیرؔ بدر، پنڈت میلا رام وفاؔ جیسی شخصیات کے ساتھ ملک کے مختلف مقامات پر مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو شعری فضا ان شعراء کے ہاں پائی جاتی ہے اس کی جھلکیاں عرشؔ کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ اس سلسلے میں تصور حسن عشق ایک سب سے اہم موضوع ہے جسے ہر دور کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ فن کے دو محرکات ہوتے ہیں ایک حسن اور دوسرا عشق، ہر حسین نظر آنے والی شے کی بنیادی قدریں تصور حسن اور سوز عشق سے وابستہ رہتی ہیں اور احساس میں حسن سے ہونے والا لطف ونشاط عشق ہی کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جب ہم عرشؔ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہوں نے بھی حسن وعشق کی تمام کیفیات کو غزل میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ عرشؔ کے یہاں نکات زندگی کے ساتھ ساتھ حسن وعشق بھی ایک اہم پہلو ہے بہ الفاظ دیگر وہ بنیادی طور پر تغزل کے شاعر تھے۔ حسن وعشق کا بیان اردو شاعری میں کچھ نیا نہیں ہے اردو کے تمام متقدمین ومتاخرین شعراء نے اس میدان میں زور آزمائی کی ہے لیکن ستارہ اسی کا چمکا ہے جس نے اپنے سوز عشق کے تاثرات و واردات کو خلوص کے ساتھ بیان کرتے ہیں معجز بیانی سے کام لیا ہے۔ ویسے تو میرؔ وغالبؔ اور جگرؔ وفراقؔ نے جو اپنے زمانے کے استاد فن سمجھے جاتے ہیں اپنی معجز بیانی سے اس میں جادو کا سا اثر پیدا کیا ہے۔ اس معاملے میں عرشؔ صہبائی نے بھی ان شعراء کے اثرات قبول کئے ہیں کیوں کہ عرشؔ کے یہاں بھی غزل میں حسن وعشق کا بیان ملتا ہے۔ عشق ومحبت اور غزل لازم وملزم سمجھے جاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک تو اگر غزل میں حسن وعشق کا ذکر نہ ہو تو وہ غزل ہوتی ہی نہیں۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے عوام رومانی نظموں کو بھی غزل ہی کہتے ہیں۔ عشق ایک فطری جذبہ ہے اور یہ دوسرے تمام جذبات پر حاوی ہے اس میں بلا کی شدت اور شورش ہے۔ یہ دل میں ایک خاص ذوق وشوق پیدا کر دیتا ہے۔ اردو کے تمام غزل گو شعرا نے عشق کو اپنے طریقے سے اظہار کیا ہے۔ بقول میرؔ:

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے (۱۵۸)

جگرمرادآبادی:

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے(۱۵۹)

سراجؔ اورنگ آبادی:

دل میں جب آکہ عشق نے تیرے محل کیا
سب دست و پائے عقل کوں یک پل میں شل کیا(۱۶۰)

جگرمرادآبادی:

جب کوئی عشق میں برباد جہاں ہوتا ہے
مجھ کو محسوس خود اپنا ہی زیاں ہوتا ہے (۱۶۱)

فراقؔ گورکھپوری:

ہم عشق کی وادی کے ہیں سیاح ازل سے
تنہا کبھی پھرتے ہیں کبھی موت کے ہمراہ (۱۶۲)

داغ دہلوی کا انداز دیکھئے:

اس عشق میں اجارہ نہیں ہے کسی کا داغؔ
پروردگار جس کو یہ دولت عطا کرے (۱۶۳)

حسرت موہانی کا یہ شعر دیکھئے:

طلب گار وفائے حسن ہے عشق ہوس پرور
یہ خو جاتی تو ہے لیکن با آسانی نہیں جاتی (۱۶۴)

داستان عشق میں ہجر کا بھی الگ باب ہے۔یہ موضوع اپنے اندر ایک بڑی وسعت رکھتا ہے۔عاشقِ صادق ہجر ہی سے ہوتی ہے۔اسی سے عشق میں گہرائی آتی ہے۔معشوق سے دور رہ کر یہ اس کے غم میں تڑپتا ہے اور وصال کی گھڑیوں کو یاد کرتا ہے۔اردو غزل کا بیشتر سرمایہ غم ہجراں کے متعلق موضوعات پر مشتمل ہے۔اس کے تحت شب فراق کی مجبوریاں، پشیمانیاں، یادیں، انتظار، وقت سفر، معشوق کی تواضع کے سلسلے میں اپنے گھر کی حالت کا بیان، خود سے اپنے در کا حال کہنا وغیرہ بہت سے موضوعات آجاتے ہیں۔عشق جو روایتی غزل کا مرکزی موضوع ہے جس کو قدما نے کثرت سے نظم کیا ہے۔عرشؔ کی دلچسپی کا خاص مراکز بھی حسن و عشق ہی

رہا ہے۔انہوں نے اپنے ماحول میں ہر طرف حسن کی تلاش کی ہے۔

عرشؔ صہبائی کا دل حسن وعشق کی لطافت ونزاکت اوراس کے رنگ وآہنگ سے مسرور ولطف اندوز ہوتا رہا ہے۔ان میں شاعری میں محبوب کے تصور پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ ان کا محبوب روایتی محبوب سے مناسبت بھی رکھتا ہے لیکن کچھ پہلوؤں میں اس سے مختلف بھی ہے۔وہ سادہ زندگی کے قریب بھی ہے اور صحت مند بھی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ عرشؔ کی نظر عورت کے حسن وشباب پر مڑی ہے اور انہوں نے کبھی کبھی اس کے حسن کو اشاروں وکنایوں میں بیان بھی کیا ہے لیکن زیادہ تر انہوں نے عورت میں حسن باطن کی تلاش کی ہے۔ان کی محبوبہ سادہ فطرت،حیادار عورت ہے جس کے سینے میں دل بھی ہے اور دل میں محبت کی خلش بھی لیکن وہ اسے اظہار کرنے پر قائل نہیں ہے۔عرشؔ اس کے اس انداز کو بے وفائی نہیں گردانتے بلکہ اسے اپنے محبوب کا ایک انداز وفا تصور کرتے ہیں۔مندرجہ بالا اشعار کی طرح ان کے یہاں بھی کئی اشعار ہیں جن میں حسن وعشق فراوانی موجود ہے۔ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

یہی بہت ہے کہ مجھ پر تیری توجہ ہے
تیری نگاہ کا انداز دوسرا ہی سہی(۱۶۵)

کم سے کم عشق میں یہ بات تو ہو جاتی ہے
زندگی خوگر آفات تو ہو جاتی ہے(۱۶۶)

عشق کا انجام تو معلوم تھا
ہم کو لے ڈوبا دل پر اضطرات(۱۶۷)

وادی عشق کی ہر راہ پر چل سکتے ہیں
ہم وہ پروانے ہیں جو آگ میں جل سکتے ہیں(۱۶۸)

بے مطلب بھی گڑ لیتے ہیں دنیا میں افسانے لوگ
عشق و وفا کے راز سے لیکن ہوتے ہیں بیگانے لوگ(۱۶۹)

اس طرح عرشؔ کا تصور عشق بھی عام عشقیہ کیفیات وواردات کا مجموعہ ہے ان کے دل میں بھی محبت کی کسک اور چبھن ہے لیکن آہ میں گریہ وزاری اور آہ فغاں نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنی خوداری،وضعداری

اور شرافت نفس سے عشق کے جذبات کے اظہار کے لئے حدوں کا تعین کیا ہے۔انہوں نے اپنی محبت میں پاکیزہ جذبے کا اظہار کیا وہ شوقیانہ پن سے بچتے رہے انھوں نے محبت میں ضبط وتحمل سے کا لیا اور محبت کو نہ کبھی عذاب سمجھا، نہ فرقت کا ماتم کیا، نہ محبوب کی بے توجہی اور اغیار کا گلہ شکوہ کیا بلکہ صرف محبوب کو بلایا، اس سے عرض تمنا کی اور اسے سمجھایا اور منایا ہے۔انھوں نے جس طرح محبوب سے اس کی جلوت میں مزہ اٹھایا اسی طرح خلوت میں بھی اس کے تصور سے لطف اندوز ہوئے اور خلوت غم کو بزم طرب بناتے رہے۔عرشؔ کے یہاں چاہے اور چاہے جانے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔محبت میں انہوں نے اپنے محبوب سے سچا عشق کیا اسے شدت سے چاہا اور ان کے محبوب نے بھی ان کے پیار و محبت کا جواب پیار و محبت ہی سے دیا۔ان کا عشق یک طرفہ نہیں بلکہ ان کو الفت کا مزہ جب ملا جب محبت میں محبوب اور عاشق دونوں بے قرار رہے ہیں۔ بقول عرشؔ:

دل مضطر سے نالاں ہیں ادھر وہ بھی ادھر ہم بھی
محبت میں پریشاں ہیں ادھر وہ بھی ادھر ہم بھی (۱۷۰)

اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ عشق و محبت غزل کا ایک بڑا موضوع ہے۔اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ عرشؔ نے عشق و محبت کے کون کون سے موضوعات کو اپنی غزل میں جگہ دی ہے کیوں کہ یہ ایک وسیع موضوع ہے اور ایک طرح سے دیکھا جائے تو پوری انسانی زندگی اس میں شامل ہو جاتی ہے۔غزل میں عشق مجازی یا جنسی محبت کے طرف داروں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ محبت ایک فطری جذبہ ہے، ہر انسان کو اس سے سابقہ پڑتا ہے اور یہ جذبہ تمام دوسرے جذبوں پر حاوی ہے اس لئے غزل میں اس کا اظہار اگر ہوتا ہے تو یہ فطری ہے اور غزل میں انہیں جذبات کو جگہ ملنی بھی چاہیے۔اس کے مقابلے میں جب ہم عشق حقیقی کے طرفداروں کی رائے پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ عشق حقیقی کو ہی اہم مانتے ہیں ان کے خیال میں جذبے کی سچائی اور خلوص عشق حقیقی میں ہی ممکن ہے۔عرشؔ صہبائی نے عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کے موضوعات کو بڑے فنکارانہ انداز میں اظہار کیا ہے۔عشق مجازی کی بات کریں تو عرشؔ صہبائی کی شاعری میں اکثر عشق و محبت کے سطحی اور شخصی و معاملہ بندی کے اشعار ملتے ہیں۔عشق و محبت کا جو ظہار ان کے ہاں ملتا ہے وہ ان سے قبل کے شعرا کے یہاں بھی موجود ہے جس کی مثالیں ہم ان کے اشعار کے ساتھ ساتھ پیش کرتے رہیں گے۔مثلاً فراقؔ کا شعر ملاحظہ کریں :

اک مدت سے تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں
ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں (۱۷۱)

عرشؔ صہبائی کے مندرجہ ذیل اشعار میں ایک سطحی اور عامیانہ پن نہیں بلکہ لسانی اور شعری رچاؤ، موضوعاتی بوقلمونی اور نغمگی ملتی ہے جو بہترین فارسی اور اردو غزل کی خوبیاں سمجھی جاتی ہیں۔عرشؔ صہبائی کی شاعری پر میرؔ، غالبؔ، حسرتؔ، جگرؔ، داغؔ، فراقؔ، وغیرہ کی غزل کی دھیمی دھیمی آنچ نظر آتی ہے۔مثلاً عرشؔ کے ان غزلیہ اشعار پر غور کریں:

اتنی شدت سے کبھی آیا نہ تھا اس کا خیال
زخم دل پہلے کبھی اتنا ترو تازہ نہ تھا(۱۷۲)

جب دل کو ٹٹولو گے وفائیں بھی ملیں گی
اس دشت میں گم شدہ صدائیں بھی ملیں گی(۱۷۳)

وہ حقیقت میں محبت سے بھی پاکیزہ ہے
ہم نے رکھا ہے جسے محبت کی طرح (۱۷۴)

محبت میں حیات نو کی یوں تشکیل ہوتی ہے
ادھر ارشاد ہوتا ہے ادھر تکمیل ہوتی ہے (۱۷۵)

اس پر فراقؔ کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

یہ تجھ سے چھٹتے ہی کیا ہو گیا محبت کو
وہی وجود و عدم ہیں مگر وہ بات نہیں(۱۷۶)

اس پر جگرؔ مرادآبادی کا شعر دیکھئے:

محبت کی باتیں محبت ہی جانے
معمے نہیں ہیں یہ سمجھانے والے(۱۷۷)

منظرؔ لکھنوی:

دنیا کہے کچھ ہے مگر ایمان کی یہ بات
ہونے کی طرح ہو تو عبادت ہے محبت(۱۷۸)

اس پر عرشؔ کا یہ شعر دیکھئے:

اک محبت کو ملی ہے امتیازی شان یہ
لاکھ رسوا ہو مگر بے آبرو ہوتی نہیں (۱۷۹)

مخدومؔ محی الدین کے دو اشعار دیکھئے:

چشم نم مسکراتی رہی رات بھر　　آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
رات بھر درد کی شمع جلتی رہی　　غم کی لو تھرتھراتی رات بھر(۱۸۰)

غم زمانہ کے ہاتھوں رہین یاس ہیں ہم
نہ چھیڑ اے غم جاناں بہت اداس ہیں ہم (۱۸۱)

فراقؔ کہتے ہیں:

سوز غم سے نہ ہو جو مالا مال
دل کی سچی خوشی نہیں ملتی (۱۸۲)

مہندر پرتاپ چاندؔ:

تیرا خیال غم مستقل سہی لیکن
تیرے خیال سے غافل رہا نہیں جاتا(۱۸۳)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عرشؔ نے اس موضوع پر کہیں صاف اور کہیں علامتی انداز میں شعر کہے ہیں۔عرشؔ صہبائی کی غزل میں نئے فکری پیمانوں کا شعری احساس موجود ہے۔انہوں نے اس موضوع پر کہیں صاف اور کہیں علامتی انداز میں شعر کہے ہیں۔ان کی شاعری میں تغزل کا گہرا رنگ و آہنگ موجود ہے۔حسن و عشق عرشؔ کی دلچسپی کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔انہوں نے اپنے ماحول میں ہر طرف حسن و عشق کا مشاہدہ کیا اور ان کا دل حسن و عشق کی لطافت و نزاکت اور اس کے رنگ و آہنگ سے مسرور و لطف اندوز ہوتا رہا ہے۔ان کے ان اشعار میں محبوب کے تصور پر غور کرنے پر پتا چلتا ہے کہ ان کا محبوب ایک پیکر حسن و شباب اور نسوانی محاسن کا مجسمہ ہے۔ان کی غزلیہ شاعری میں تصور محبوب کے متعلق ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انہوں کہیں بھی اپنے محبوب کے لئے تانیثیت کا صیغہ استعمال نہیں کیا ہے۔اردو کی کلاسیکی شاعری سے لیکر جدید شاعری تک کے اکثر شعراء میں ایسے اشعار دیکھے جا سکتے ہیں۔حسن و عشق کا موضوع ساری زبانوں کی شاعری میں ایک بنیادی تجربے کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر شاعر کے کلام میں حسن و عشق کے متعلق مضامین اچھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں چاہے۔مثلاً عرشؔ کے یہ شعر دیکھئے:

جتنی بھی بڑے گی غم و آلام کی تلخی
اتنا ہی محبت کا اثر اور بڑے گا(۱۸۴)

وفا سے بارہا ہم نے جلایا دامن دل کو
مگر یہ شمع اب کچھ سوچ کر خود ہی بجھا دی ہے (۱۸۵)

وہ غم کے سخت مراحل کہ جن سے ہم گزرے ہیں
وفا پرست بھی ان راستوں سے کم گزرے ہیں (۱۸۶)

محبت کی ہر اک رنگیں ادا کی آبرو رکھ لی
وفا پر مٹنے والوں نے وفا کی آبرو رکھ لی (۱۸۷)

وفا مطلوب تھی جن سے وفا نا آشنا نکلے
انہیں ہم کیا سے کیا سمجھے مگر وہ کیا سے کیا نکلے(۱۸۸)

جس طرح غالبؔ نے قائمؔ کے اسلوب کا مطالعہ کیا ہے اسی طرح عرشؔ نے بھی از سرِ نو کئی بڑے شعراء داغؔ، حسرت، میرؔ، فراقؔ و جوشؔ کے اسلوب کا مطالعہ بھی کیا اور اسے اپنے اندازِ شعری میں بھی لایا ہے۔ عرشؔ صہبائی کا تعلق چوں کہ داغؔ اسکول آف تھارٹ سے ہے اس لئے ان کا شعری انداز و لب و لہجہ بھی داغؔ دہلوی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ پہلے بھی اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان کا شعری اسلوب داغؔ کے اسلوب سے خصوصی مناسبت رکھتا ہے۔ داغؔ کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

میرے ہی دم سے مہر و وفا کا نشاں ہو اب
تجھ سا اگر نہیں ہے تو مجھ سا کہاں ہو اب(۱۸۹)
ہمیشہ اسے ہم نے ٹلتے ہی دیکھا
مگر دل بھی رنگ وفا ہے کسی کا(۱۹۰)

ہم کریں ترک وفا اچھا چلو یوں ہی سہی
اور اگر ترک وفا سے بھی نہ رسوائی گئی(۱۹۱)

محمود بیگ سازؔ کی غزل کا شعر ملاحظہ کریں:

غم الفت نے لطف زندگی کی آبرو رکھ لی
یہ وہ دشمن ہے جس نے دوستی کی آبرو رکھ لی(۱۹۲)

جگر مرادآبادی:

راہ وفا میں اک مقام ایسا بھی آیا
کہ ہم خود اپنی طرف سے بھی بدگماں گزرے (۱۹۳)

شیفتہؔ کا یہ شعر دیکھئے:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی (۱۹۴)

عرشؔ صہبائی ایک ہونہار غزل گو شاعر تھے اور صالح غزل کے عکاس و آئینہ دار تھے۔ وہ باخبر نکتہ رس اور اہل نظر فنکار جوشؔ ملسیانی کے شاگرد تھے لہذا ان میں بھی اپنے استاد کی پرچھائیاں اور فنی وشاعری کرنیں حراماں ہیں اور نہایت سلجھے ہوئی شاعری ہے۔ ان کے کلا کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جو بھی کہتے تھے اس میں مزید اصلاح کی گنجائش نہیں رہتی تھی اسی لئے اپنے استاد کی شاگردی سے وہ بہت جلد فارغ ہو گئے اور وقت کے گزرتے خود ایک استاد شاعر ہو گئے۔ وہ غزل کے عاشقوں میں سے تھے۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں وہ اپنے ایک مضمون میں خود اپنے بارے میں رقمطراز ہیں کہ ''چونکہ مجھ میں قدرتی صلاحیت موجود تھی اس لئے میرے کلام میں اصلاح کی کم گنجائش ہوتی تھی۔ کلام اس شدت سے ذہن میں اترتا تھا جیسے اشعار کی برسات ہو رہی ہو اور اب بھی یہی عالم ہے۔ میں بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہوں۔ میری غزل میں برتی کے اشعار نہیں ہوتے۔ معیاری اور اعلیٰ کلام ہی میری شہرت ومقبولیت کا سبب بنا'' (۱۹۵) ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

یہ ۱۹۵۱ء واقعہ ہے جب جموں میں بزم اردو ادب کے تحت ایک کل ہند اردو مشاعرہ کا اہتمام ہوا۔ قبلہ جوشؔ ملسیانی صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ عرشؔ صاحب ان کے تلاندہ میں شامل ہو گئے ہیں لیکن یہ سلسلہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا کیونکہ عرشؔ صاحب کے کلام میں اصلاح کی بہت کم گنجائش تھی کیونکہ ان کی طبیعت میں آمد تھی اور پھر مزاج کا بھی فرق تھا۔ مختلف مشاعروں میں ان کی شرکت کا آغاز ۱۹۵۱ء میں ہی ہو چکا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں ریڈیو کشمیر جموں کی طرف سے ایک بڑے مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں لسان الاعجاز، پنڈت میلا رام وفاؔ بھی تشریف لائے تھے۔ اس مشاعرے میں عرشؔ صاحب کے کلام کو بے حد سراہا گیا۔ (۱۹۶)

مندرجہ بالا دونوں آرائیں اپنی جگہ درست سہی لیکن جوشؔ ملسیانی شاعری میں ان کے استاد تھے۔ ان سے اپنے کلام پر اصلاح بھی لیتے تھے۔ اس کا جوز یہ کہ ہم جب جوشؔ ملسیانی کی کتاب ''آئینہ اصلاح'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ان کے ان تمام شاگردوں کی فہرست موجود ہے جو ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیا

کرتے تھے۔اسی کتاب میں عرشؔ صہبائی کا نام بھی درج ہے اوران کے بہت سے ایسے شعار بھی درج ہیں جن پرانہوں نے جوشؔ سے اصلاح لی ہے۔

اردو کے دیگر غزل گوشاعروں کی طرح ان کی غزل میں بھی وہی گوشت پوشت سے عشق،معاملات دل کی باتیں،مشاہدات نگاہ اورواردات قلبی کے مسلے ہیں۔ان کی عاشقی میں بانکپن ہے،حوصلہ ہے،عزم ہے،رونا گڑگڑانا نہیں ہےاورنہ احساس کمتری کے شکار ہیں،نہ بے وجد عجزوانکساری کے چونچلے ہیں۔عرشؔ کی غزلوں کوپڑھنے سے ان کے عشق کی ساری داستان سامنے آجاتی ہے۔ان کی محبت کی نشونما بڑی باقاعدگی اور ہمواری کے ساتھ ہوئی ہے۔ان کے یہاں نظربازی،دیوانگی،دل لگی اوردل کی لگی سب کچھ شامل ہے۔انہوں نےعشق کی وادی کی خوب سیر کی ہے۔اس کےایک ایک گوشے کودیکھا ہے۔اس کے چرکے سہے ہیں،مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ان کےاشعار میں ہرایک دل کی نبض ودھڑکن کی ایک ایک حرکت سنائی دیتی ہے۔مثلاًان کے چنداشعارملاحظہ کریں:

اندر سے کچھ ٹوٹا ٹوٹا لگتا ہے
وہ سب میں رہ کر بھی تنہا لگتا ہے
کچھ منظر آنسو لاتے ہیں آنکھوں میں
دل ٹوٹے تو اور بھی اچھا لگتا ہے
اس کے ذکر پہ آنکھیں بھر سی آتی ہیں
پوچھتے ہیں سب وہ میرا کیا لگتا ہے (۱۹۷)

وہ سمایا ہے میری سانسوں میں خوشبو کی طرح
میں نے اس انداز سے پہلے اسے چاہا نہ تھا

وہ بچھڑتے ہیں بچھڑتی نہیں یادیں ان کی
زخم بھر جاتے ہیں زخموں کے نشاں رہتے ہیں

مجھ میں اس میں ہے فرق بس اتنا
میں ہوں اک خواب اور وہ تعبیر

میں کس درجہ ہوں تنہا یاد آیا
وہ یاد آئے تو کیا کیا یاد آیا(۱۹۸)

ایک درویش ہوں دن رات دعائیں دوں گا
جو دمکتے تھے کبھی تازہ بہاروں کی طرح(۱۹۹)

ہم کو بھی یہ خبر نہیں کہ اسے
ہم نے چاہا ہے عمر بھر کتنا(۲۰۰)

مندرجہ بالا چند اشعار سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عرشؔ کی شاعری محبت کی کیفیات و واردات کی بہترین ترجمان ہے۔ان کے کلام میں آفاقیت و بشریت، ماورائیت اور سطحیت اور عرفانیت اور ارضیت ہر قسم کے ملے جلے اشعار ملتے ہیں۔ان کے یہاں وہ تمام خیالات موجود ہیں جن سے ذہن عشق کی آماجگاہ، تصورات کا مسکن اور نازک احساسات کا مترجم بنتا ہے۔عرشؔ صہبائی کے کلام کی تہہ تک اگر پہنچنا ہو تو ان کے کلام کے ہر دور کا گہرائی سے مطالعہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے کیوں کہ ان کے نفسیات کی تعمیر میں خارجی حالات کو بڑا دخل ہے ان کے دور کی سماجی روایتوں کا اثر ان کے جذبات و احساسات پر پڑا اور اسی آب و ہوا میں ان کا ایک مخصوص ذہنی کلچر بنا جسکی مدد سے ہم ان کے حسن کے احساس اور عشق کی گرمی کو محسوس کر سکتے ہیں۔وہ اپنے عہد کے استاد شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں اس لئے بعض معاملات میں ان کا کلام اردو کے بڑے استاد شاعروں کے ساتھ مناسبت رکھنے لگتا ہے۔اردو کے بڑے شعراء جگرؔ، فراقؔ، داغؔ کے یہاں عشقیہ کلام میں بشریت و ارضیت کا جو اثر ملتا ہے وہی ہمیں عرشؔ کے یہاں بھی ملتا ہے۔مثال کے لئے عرشؔ کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

اس کے ہونٹوں پہ بکھری ہوئی مسکراہٹیں
جیسے چمن میں تازہ گلابوں کا سلسلہ(۲۰۱)

نہ ہم سفر کوئی میرا نہ منزل مقصود
سمندروں میں ہوں کاغذ کی کشتیوں کی طرح(۲۰۲)

پھر سہانے موسموں کی یاد تازہ ہوگئی
پھر کسی نے دور سے مسکرا کر دیکھا مجھے(۲۰۳)

دل کے زخم ہرے ہوتے ہیں ساون میں
اس موسم میں غم کا میلا لگتا ہے(۲۰۴)

نہ کر سکوں گا فراموش ان کی گہرائی
وہ نیم بازسی آنکھیں سمندروں کی طرح (۲۰۵)

اس قسم کے اشعار استاد شاعروں کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔مثلاً میر تقی میرؔ کا یہ شعر دیکھئے:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے(۲۰۶)

داغؔ کا یہ شعر دیکھئے:

محیط عشق کی ہر موج طوفاں خیز ہے ایسی
وہ ہیں گرداب میں جو دامن ساحل میں رہتے ہیں (۲۰۷)

حسرتؔ موہانی کا انداز دیکھئے:

کوچہ عشق ہے مامون حوادث حسرتؔ
اب تمھیں کچھ خطر گردش دوراں نہ رہا(۲۰۸)

فانیؔ بدایونی:

گھڑیاں اپنے غم کی غنچوں میں چل پھر کے گزاریں
آئے تھے فانی جہاں میں گویا ہثل نسیم سحر(۲۰۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ عرشؔ صہبائی کی شاعری میں حسن عشق بھی ایک اہم موضوع رہا ہے۔انہوں نے عشاق کے احساسات اورتاثرات کے ساتھ ساتھ محبوب کے عظمت واحترام کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ان کے کلام میں حسن وعشق دونوں کا برابر احترام موجود ہے۔انہوں نے اگر عشق کو خوداری بخشی تو حسن کو بھی ذلیل و رسوانہیں ہونے دیا۔رکاکت جنسی خواہش ان کے یہاں کہیں نہیں ملتی۔وہ سستی جذباتیت کے قائل ہی نہ تھے بلکہ ہجر میں بھی ان کو وصل ہی جیسا لطف ملتا ہے،یہ ان کے عشق کا اعلیٰ تصور تھا اور وہ حسن کے اعلیٰ پرستار اور ادا شناس تھے۔ان کے کلام میں محبت وعشق کا پاکیزہ سلیقہ رسم عاشقی کی تہذیب کی بلندی اور جذب ومستی اور خواب وحقیقت کی ایک حسین آمیزش ہے۔عرشؔ صہبائی کو اپنی اور دوسروں کی عزت کا احترام تھا۔وہ ہر شخص کے درد کا احساس رکھتے تھے۔اسی سے انہوں نے عشق کی غیرت اور حسن کا احترام سیکھا تھا جو بعد میں ان کی فطرت بن گیا تھا اور یہی غیرت واحترام ان کی زندگی اور شاعری دونوں میں تاعمر قائم رہا۔

اردو شعری روایت میں یہ بات آئینے کی طرح صاف ہے کہ جب کبھی بھی کسی شاعر کے یہاں حسن و

عشق کا تذکرہ چلتا ہے تو شاعر پر خمیریات کی جانب بھی رخ کر لیتا ہے۔ چوں کہ بات محبوب سے عشق و عاشقی، حسن و جمال اور وفاداری و دغابازی کی ہو اور مے خانہ، شراب، صہبا، ساقی، خم، سراحی، اور جام کی بات نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔ شراب اور متعلقات شراب کے تذکرہ سے دنیا کی کوئی زبان خالی نہیں چنانچہ اردو شاعری میں بھی اس کا ذکر تقریباً ہر شاعر کے یہاں ملتا ہے پھر چاہے وہ شاعر شراب نوشی کا عادی ہو یا نہ ہو۔ انگریزی ادب میں خمیریات کا قحط ہے حالانکہ ہر انگریز اور مغربی تہذیب کا دلدادہ شراب کو پانی کی طرح استعمال کرتا ہے لیکن شاید دفتر زر کو اپنی زندگی میں اتنا اتار لیتا ہے کہ اس کو صفحہ قرطاس پر لانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ ہندی ادب میں خمیریہ شاعری کا خلا محسوس ہوتا ہے۔ ہندی ادب میں خمیریہ شاعری کے لئے ہربنس رائے بچن کا نام ہی سب سے اہم لیا جا سکتا ہے اور ان کی تصنیف ''مدھوشالہ'' اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔

اردو کا معاملا دوسری زبانوں کے ادب سے بہت مختلف ہے کیوں کہ اردو کا کم و بیش ہر شاعر ساغر و مینا کو اپنے اشعار میں اتارتا رہا ہے۔ اردو شاعری میں شراب اور متعلقات شراب کی تقلید فارسی شاعری سے کی گئی ہے اور فارسی شعراء (ایرانی شعراء) میں بعض نے تو شراب کو منہ بھی نہیں لگایا اور شراب کے متعلق مضامین نظم کئے مثلاً حافظ شیرازی جن کے متعلق عام طور پر یہ اتفاق رائے ہے کہ وہ شراب نہیں پیتے تھے لیکن انہوں نے شراب اور اصطلاحات شراب کا تذکرہ شراب معرفت کے مفہوم میں کیا ہے۔ ہندوستان میں حافظ شیرازیؔ کی سی مثال ریاضؔ خیر آبادی اور عرشؔ صہبائی کی دی جا سکتی ہے جن کا ضخیم دیوان مضامین شراب سے بھرا پڑا لیکن کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے کبھی شراب کو منہ سے بھی لگایا ہو جبکہ اسی زمانے کے مشاہیر شعراء مجازؔ مرحوم اور جوشؔ و فراقؔ ہیں جنہوں نے شراب سے عملاً واسطہ رکھا اور اس کے متعلق جو کچھ بھی بیان کیا اس میں ان کے ذاتی تجربات و جذبات ہیں۔ یہاں ان چند شعراء کے کلام کو مثالیں پیش کرتے چلیں جنہوں نے شراب اور متعلقات شراب کو اپنے غزل میں جگہ دی لیکن شراب سے ان کا دور دور کا کوئی واسطہ نہیں تھا: جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ہندوسان میں شراب سے تعلق نہ ہونے پر بھی اس پر سب سے زیادہ اشعار ہمیں ریاضؔ خیر آبادی کے کلام میں ملتے ہیں۔ کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں:

اپنی جھوٹی جو کبھی مجھ کو پلا دیتا ہے
لب ساغر لب ساقی کا مزہ دیتا ہے

جب ان کے ہاتھ میں جام شراب ہوتا ہے
حرام شے کا بھی پینا حلال ہوتا ہے(۲۱۰)

شعر تو میرے چھلکتے ہوئے ساغر ہیں ریاضؔ
پھر بھی سب پوچھتے ہیں آپ نے مے پی کہ نہیں

چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمارے شباب کی(۲۱۱)

داغؔ دہلوی کے یہاں بھی اس قسم کے کئی اشعار موجود ہیں۔ان کے یہاں ایک غزل کی ردیف ہی ''جام شراب'' ہے۔دوشعر ملاحظہ کیجئے:

بزم سے آخر شب ہے سفر جا م شراب
شام غربت ہوئی ساقی سحر جام شراب
بزم دشمن میں رہے آپ تو صوفی بن کر
سرخ آنکھوں میں کہاں ہے اثر جام شراب(۲۱۲)

حسرتؔ:

واعظو منہ میں تمہارے بھی بھر آئے پانی
مئے رنگیں کا جو ساغر سے چھلکنا دیکھو(۲۱۳)

نہ کر بزم ساقی میں انکار واعظ
بگڑ جائیں گے رند میخوار واعظ(۲۱۴)

جگرؔ مرادآبادی لکھتے ہیں:

بزم ساقی سے ذرا دیکھ تو چل کر زاہد
کیا بہارے ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں کی (۲۱۵)

یہ خانقاہ نہیں پی بھی جا ارے زاہد
یہ میکدہ ہے یہاں احترازرہنے دے(۲۱۶)

اصغرؔ:

میخانے کہ یہ صحبت اے شیخ غنیمت ہے
لے کچھ لب ساغر سے کچھ سینہ مینا(۲۱۷)

پی بھی جا زاہد خدا کا نام لے کر پی بھی جا
بادہ کوثر کی بھی اک موج پیمانہ میں ہے(۲۱۸)

عرشؔ کے معاصرین میں جموں کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک شاعر شری کیلاش ناتھ میکشؔ کاشمیری کے کی شاعری بھی اس قسم کے اشعار سے لبریز ہے۔عرشؔ کی طرح وہ بھی انہیں شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جن کا شراب سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں لیکن پھر بھی اس قسم کے مضامین ان کی شاعری میں بہ کثرت موجود ہیں۔ان ایک شعر بطور خاص:

وہ اور ہونگے جو پیتے ہیں بے خودی کے لئے
مجھے تو چاہیے یہ چیز زندگی کے لئے(۲۱۹)

عرشؔ صہبائی کا کلام بھی خمیریات کے مضامین سے بھرا پڑا ہے۔ان کی غزلیہ شاعری کے خمیریاتی اشعار میں رند، مستی، رنگینی، شوخی وظرافت کی لہریں بڑی آب وتاب کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس موضوع کے متعلق، مے خانہ، میکدہ، شراب، ساقی، جام، ساغر،خم،صراحی وغیرہ کا ذکر عرشؔ کے اشعار میں ایسے انداز میں موجود ہے کہ ہم عام قاری وسامع کلام پڑھنے کے بعد ان الفاظ کے اصل مفہوم سے آشنا ہو جاتے ہیں۔انہیں خود مے نویشی کی کوئی عادت نہیں تھی لیکن وہ میخانے کو دل بہلانے اور آرام وسکون کا مقام گردانتے ہیں۔ان کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کائنات کے اعلیٰ ومقدس مقامات سے زیادہ میخانے میں دلچسپی تھی۔خمیریاتی کے موضوع کے متعلق یہاں ان کے چند منتخب اشعار پیش ہیں:

راحت کی گھڑی آجاتی ہے جینے کا مقام آجاتا ہے
اس وقت خیال توبہ کیا جب رقص میں جام آجاتا ہے

عرشؔ! جب دیر و حرم میں نہ ملا اس کو سکوں
زندگی چپکے سے مے خانے چلی آئی ہے(۲۲۰)

دل بے تاب کو بہلانے چلے آئے ہیں
ہم سر شام ہی مے خانے چلے آئے ہیں

بے بلائے تو یہاں رند نہیں آتے ساقی
یاد فرمایا ہے صہبا نے چلے آئے ہیں(۲۲۱)

زندگی وابستہ کر بیٹھے ہیں میخانے کے ساتھ
جب سے رغبت ہوگئی ہے ہم کو پیمانے کے ساتھ(۲۲۲)

مے کدے میں جب میسر ہے سکون
کون کافر سجدہ دیر و حرم کرتا ہے(۲۲۳)

ہر گام پر تھیں ٹھوکریں راہ حیات میں
لیکن بہ فیض ساغر و مینا سنبھل گئے(۲۲۴)

ٹھکرا تو دیں بھرے ہوئے ساغر کو ہم
ٹالے گا کون ساقی گلفام کا کہا(۲۲۵)

لہرا کے خود ہی رقص میں ہر جام آگیا
یہ مے کدے میں کون سر شام آگیا(۲۲۶)

بغیر تیری عنایتوں کے بجھی بجھی سی ہے بزم عالم
ہیں کھوئے کھوئے سحر کے منظر ہے پھیکی پھیکی سی شام ساقی(۲۲۷)

بے تعلق جام مے سے اور پھر کیف مدام
محو حیرت ہوں تیری آنکھوں کی مستی دیکھ کر(۲۲۸)

کس کی جرات کہ تمنائے مے و جام کرے
تیری آنکھوں نے قیامت کی کشش پائی ہے(۲۲۹)

شاید غم حیات کہ تلخی نہ مٹ سکے
ساقی الٹ دے جام میں اک جام اور بھی(۲۳۰)

سجدوں کیلئے بندش بھی نہیں آداب کی پابندی بھی نہیں
تعظیم حرم پھر کون کرے جب میخانے ہوں راہوں میں(۲۳۱)

جام میں ساقی الٹ دے آج سارا میکدہ
جرعہ جرعہ کس لئے دیتا ہے پیمانے کے ساتھ(۲۳۲)

الٹ دے ابھی جام میں اور ساقی کہ الٹ جائے گا اثر جاتے جاتے
ٹھہر اے اجل جانب میکدہ ہم ذرا دیکھ لیں اک نظر جاتے جاتے (۲۳۳)

عرشؔ صہبائی کے یہاں کئی ایسی غزلیں ہیں جو خالص خمیری موضوع پر مبنی ہیں۔ یہاں ان کی ایک غزل کے اشعار ملاحظہ کریں:

با احترام ساغر و مینا بڑھا دیے
ساقی نے میری جرات رندانہ دیکھ کر
حیراں ہوں ان کے دیدہ حیراں کو کیا کہوں
دیوانے ہو گئے مجھے دیوانہ دیکھ کر
توبہ کا احترام بھی لازم رہا مگر
نیت بدل گئی میری پیمانہ دیکھ کر
ہر در سے بے نیاز ہے لاکھ اگرچہ ہم
سجدے میں گر گئے در میخانہ دیکھ کر(۲۳۴)

عرشؔ صہبائی نے زندگی سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر روایتی مضامین کو بڑی فنکاری سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ان کی غزل میں نکات زندگی اور حسن و عشق کے معاملات دو بڑے اور اہم موضوعات ہیں جن پر ان کا زیادہ شعری سرمایا ملتا ہے۔ انہوں نے عشق مجازی کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی کو بھی اپنی شاعری میں بڑی بردباری سے پیش کیا ہے۔ عرشؔ صہبائی دور جدید میں جموں کشمیر کے ان شاعروں میں صف اول کے شاعر ہیں جنہوں نے اردو غزل کی روایت میں اپنا ایک منفرد نام و مقام بنایا ہے۔ ان کی غزل میں متصوفانہ خیالات و تجربات کے مضامین بھی کثر سے ملتے ہیں۔ ان کا تصوف کتابی اور رسمی بھی ہے اور ذہنی اور جذباتی بھی۔ اردو شاعری میں تصوف بہر زاویہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اردو میں ٹھیٹ صوفی شعراء کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہیں لیکن شاعرانہ تصوف کس کے ہاں نہیں ملتا۔ چنانچہ ایسے شعرا کے کلام میں بھی جہاں مذہب اور تصوف سے کم تعلق رہا ہے تلاش کرنے والوں نے تصوف کو تلاش کر ہی لیا۔ کسی زمانے میں زندگی اور ادب دونوں میں تصوف کا رنگ گہرا اور واضع تھا لیکن بدلتے ہوئے وقت اور معاشرتی حالات میں اس کا اثر کم ہوا جا رہا ہے۔ تاہم یہ رنگ اور ہے اور رہے گا۔ اردو شاعری کے بیشتر موضوعات فارسی شاعری کی تقلید ہے۔ اردو

شاعری کا تصوف بھی فارسی شاعری سے متاثر ہے۔لفظ''تصوف'' عربی زبان کا لفظ ہے جس سے مراد معرفت حاصل کرنا ہے، اپنے ظاہر و باطن سے دل کی خواہشوں کو دور کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو جانا، کھردرا پہننا، تزکیہ نفس کرنا ہے۔تصوف اور صوفی الفاظ حضور ﷺ کے زمانے میں مستعمل نہ تھے۔آپ ﷺ کے زمانے میں فضیلت والا نام صحابہ تھا جو آپ ﷺ کی ہر بات پر بلا تردد لبیک کہتے تھے۔آپ کے زمانے کے بعد تابعین افضل سمجھے گئے، پھر تبع تابعین بعد ازاں زاہد و عابد کو افضل سمجھا گیا۔وقت کے گزرتے پھر یہ وقت آیا کہ زہد و عباد نے صوفی کا نام پایا۔

اٹھارہویں صدی کی شروعات میں جب اردو شاعری کے نقش و نگار اجاگر ہوئے اس سے پہلے کئی صدیوں سے پورے ملک میں فارسی زبان ہی کا دور دورہ تھا اور فارسی شاعری لوگوں کے دلوں میں بسی ہوئی تھی۔اس لئے جب انہوں نے اردو شاعری شروع کی تو فارسی کی تمام مسلمات شاعری اردو غزل میں شامل ہو گئیں۔وہی مضامین و موضوعات، وہی تشبیہات و تلمیحات، وہی لفظی و معنوی خوبیاں اور خامیاں جو فارسی کا نشان امتیاز تھیں اردو میں راہ پا گئیں۔شاعری کا جو منصب و معیار حافظؔ، سعدی، عرفیؔ اور طالبؔ کی نظر میں تھا وہی ہمارے شعرائے متقدمین نے بھی اختیار کیا۔تصوف کی بنیاد عشق حقیقی پر قائم ہے، اسلئے اس کو بھی عاشقانہ شاعری کا ایک ناگزیر عنصر بلکہ اس کا غازہ و نکھار کہا جا سکتا ہے۔فارسی میں حافظؔ، خیامؔ، عطارؔ اور رومؔ سب کے سب صوفیانہ رنگ کے شاعر تھے اس لئے ان کی شاعری ان کے واردات قلب کا مظہر ہے۔یہاں تک ہماری اردو شاعری کا تعلق ہے یہ اپنے یوم ولادت ہی سے آغوش تصوف میں پرورش پاتی رہی ہے اور آج بھی اس کے ظل عاطفت میں اپنے شباب کی منزلوں کو طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔اردو شعراء میں میر درد کا کلام تصوف میں ڈوبا ہوا ہے۔ان کے بعد غالب کے یہاں تصوف کا کچھ عنصر مل جاتا ہے اور بیسویں صدی کے شعراء میں اصغرؔ نے حسن چشم تماشہ سے بھی دیکھا اور وہ قوت شامہ اور قوت سامعہ کو بھی بروئے کار لائے۔روایت کا یہ تسلسل ہر عہد کے شاعروں کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ان میں سے بعض نے تقلید کو اپنی شاعری کا موجوع بنایا ہے اور بعض نے براہ راست تجربے کو بنیاد بنایا۔اردو ادب میں متصوفانہ شاعری کی روایت بہت طویل ہے اس کا مکمل احاطہ کر پانا یہاں ممکن نہیں اس لئے ان چند شعراء کے اشعار یہاں پیش کرتے ہیں جنہوں نے متصوفانہ خیالات کو اپنی شاعری میں پرتا ہے۔مثلاً میر دردؔ کا شعر دیکھئے:

جب میں آکر ادھر ادھر دیکھا　　　تو ہی نظر آیا جدھر دیکھا(۲۳۵)

میر تقی میر لکھتے ہیں:

عرض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے(۲۳۶)

ریاضؔ خیرآبادی:

تھوڑی سی بصیرت ہو تھوڑی سی بصارت ہو
ہر شئے میں ریاضؔ اس کا جلوہ نظر آتا ہے(۲۳۷)

اسمعیلؔ میرٹھی لکھتے ہیں:

خدایا اول و آخر بھی تو ہے خدایا ظاہر و باطن بھی تو ہے(۲۳۸)

غالبؔ کا شعر دیکھئے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے(۲۳۹)

عشق حقیقی جب غزل کا موضوع بنتا ہے تو لامحالہ تصوف اور اس کے متعلق تمام کیفیات کا مدارج اجزا اور مسائل غزل میں شامل ہوجاتے ہیں۔تصوف چونکہ مجاز کا زینہ ہے۔اس کا خلاق اور فلسفے سے بھی گہرا تعلق ہے اس لئے جب ہم عشق حقیقی کو غزل کا موضوع قرار دیتے ہیں تو ہماری غزل کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے اور اس میں تصوف،فلسفہ اور اخلاقیات کی ایک وسیع دنیا سما جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر کے یہاں کچھ نہ کچھ تصوف وفلسفہ کے مضامین مل ہی جاتے ہیں۔عرشؔ صہبائی کے یہاں بھی متصوفانہ مضامین پر اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ان کے لئے شاعری نہ ذریعہ عزت سعادت ہے نہ وسیلا حصول معاش، بلکہ ان کے کشف وواردات قلب کی ترجمان ہے۔انہوں نے زندگی بھر کسی کی مدح وستائش سے اپنی شاعری کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔قناعت اور استغنا سے بھرپور ان کی شخصیت نے درویشی کو پسند کیا۔احساس انا سے دامن چھڑا کے عظمت آدم اور رفعت انسانیت کے گیت گائے،اخلاق وشرافت کی تعلیم دی۔تزکیہ نفس وصفائے قلب کی بدولت عرفان ذات وعرفان رب کی راہ دیکھائی،توحید معرفت کے سہارے فطرت کے رازہائے سربستہ کو بے نقاب کیا۔انہوں نے تصوف کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں بلکہ اسے روزمرہ کی زندگی میں عملی جامہ بھی پہنایا ہے۔وہ محض مذہب وملت کے قائل نہیں تھے۔وہ آپسی محبت، بھائی چارے اور انسانیت کا دنیا کے لئے سب بہترین مذہب قرار دیتے تھے۔عرشؔ اگرچہ کوئی بڑے صوفی شاعر تو نہ تھے لیکن ان کی شخصیت اور شاعری میں متصوفانہ خیالات کا رنگ بھی ضرور نظر آتا ہے۔وہ خدا،اس کی مخلوق اور کائنات سے پیار کرتے تھے۔وہ زندگی کی حقیقت سے اچھی طرح

سمجھتے تھے۔فلسفہ وتصوف گو ان کے خاص موضوعات تو نہ تھے لیکن یہاں کہیں صوفیانہ اور فلسفیانہ اشعار کہے ہیں ان میں حقیقت کا رنگ نظر آتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ کریں:

کوئی اسے تسلیم کرے یا نہ کرے عرشؔ
ہر ذرے میں ہم نور خدا دیکھ رہے ہیں(۲۴۰)

جو دل سے ہوتے ہیں انسانیت کے دیوانے
تمام عمر وہ محو نماز ہوتے ہیں(۲۴۱)

کہوں یہ کس سے میں تخلیق بھی ہوں خالق بھی
اسے سمجھنے میں خود بھی مجھے زمانے لگے(۲۴۲)

کہاں ڈھونڈوں اسے اے عرشؔ جاکر
کہیں بھی اس کا نقش پا نہیں ہے(۲۴۳)

عرشؔ جب سے تلاش ہے اس کی
خود سے بھی دل کٹا کٹا سا ہے(۲۴۴)

جس کو ہوتی ہے آگہی اس کی
اس کے چہرے پہ نور ہوتا ہے(۲۴۵)

ذرے ذرے میں اس کا پرتو ہے
ہم یہ کس رہگزر سے گزرے ہیں(۲۴۶)

ذرے ذرے میں خدائی دیکھو
ہر بت میں شان کبریائی دیکھو(۲۴۷)

وہ کہ سب کی نظر سے پنہاں ہے
ذکر پھر بھی ہے جا بہ جا اس کا(۲۴۸)

عرشؔ صہبائی کے کلام میں واردات واکتشافات اور جذب وعشق کی کیفیات مختلف رنگوں میں موجود

ہیں۔مندرجہ بالا اشعاراس کا بہتریں جواز ہیں کہ ان کی شاعری میں تصوف کا ایک مربوط نظام پایا جاتا ہے۔تصوف میں چونکہ منزل عشق حقیقی ہے اسلئے عشق مجازی کے راستے سے گزر کر منزل تک پہنچا جاتا ہے۔چونکہ انسان اللہ کے حسن و جمال کا مظہر ہے،تو وہ حسن الٰہی کہ جلوہ سامانیوں کوکس طرح نظرانداز کرسکتا ہے۔تاہم یہ جلوہ سامانیاں عرشؔ کے یہاں بہت پاکیزگی اورشائستگی اختیار کئے ہوئے ہیں۔انسان کی ہستی خس وخاشاک کی طرح ناتوں ہے،قضائے الٰہی ایک زبردست موج ہے جس کے سامنے کسی کا زورنہیں چل سکتا، اس لئے وہ جس طرف بہالے جائے اس کو بہہ کر جانا ہے۔وہ ذات جس کا نام اللہ ہے،اپنی ذات کے لحاظ سے بالکل ایک ہے محض یگانا ہے بسیط محض ہے،نا قابل تقسیم ہے،اس میں کثرت ہےتو اسماء کے لحاظ سے ہے جو نسبتیں،مختلف جہتیں،انتزاعیات ہیں لیکن اہل تحقیق کثرت میں واحد کو دیکھتے ہیں۔عرشؔ کی غزلوں میں اسی مالک کائنات کے متعلق جذبہ توحید کی جھلک بھی کمال کی ہے۔مثلاًیہ اشعار دیکھیں:

عجب سلسلہ ہوگا سکوت کا اس وقت
نہیں تھا کچھ بھی زمانے میں جب خدا کے سوا(۲۴۹)

مسجدیں اس کی زمانے میں شوالے اس کے
ہر قدم ملتے ہیں کتنے ہی حوالے اس کے (۲۵۰)

ہر ایک ذرے میں ہے جذب اگرچہ اس کا ظہور
مگر میں دیکھ سکا اس کو دیکھ کر بھی نہیں(۲۵۱)

وہ جس کا نام ہے اس کا وجود بھی ہوگا
ملے گا لازماً اس کو اگر تلاش کریں

کہاں کہاں تیرے جلوے نہیں ہیں رنگ فشاں
کہاں کہاں تجھے اہل نظر تلاش کریں(۲۵۲)

دیر و کعبہ میں تلاش اس کی سراسر بے سود
وہ تو ہر لمحہ قریب رگ جاں رہتا ہے (۲۵۳)

عرشؔ صہبائی کی غزل گوئی میں روایت اورانفرادیت دونوں وصف موجود ہیں لیکن انہیں الگ کر پا اتنا

آسان نہیں ہے۔ وہ صحیح معنوں میں روایتی شعور رکھتے تھے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے ایک بات ذہن نشیں ہو جاتی ہے کہ انہوں نے فارسی اور اردو شاعری کی طویل روایت سے اپنا تخلیقی رشتہ قائم کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں سلیقہ ادا، زبان کا خوبصورت استعمال، ترکیب سازی، روایتی لفظیات کا استعمال، نئی معنویت کے ساتھ، قدم قدم پر کشادہ منظری کا احساس دلاتا ہے ان کا ڈکشن میرؔ، داغؔ، فانی، حسرتؔ اور جوشؔ کی شعری ڈکشن کی توسیع ہے۔ عرشؔ صہبائی کی فنی مہارت ان کے قدردانوں کے مضامین سے ہوتی ہے کہ انہیں شعری فن میں کس قدر مہارت حاصل تھی۔ جناب منیر قریشی گنگوہی اپنے ایک مضمون میں عرشؔ کے متعلق رقمطراز ہیں:

> عرشؔ صہبائی شاعری میں فکر وفن کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں شعر میں الفاظ کی نشست و برخاست میں بڑی اہمیت کا حامل معاملہ ہوتا ہے۔ اس سے شعریت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اس دور میں مجموعی طور پر شاعری میں فنی لوازمات کا بحران ہے اس لئے شاعری صرف خیال تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ (۲۵۴)

ہر عہد کی تحریکات، رجحانات اور رویوں کو ہم اس عہد کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات میں دیکھ سکتے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ ہر ادب اپنے عہد کے غالب رویوں کا ترجمان اور عکاس ہوتا ہے، خواہ وہ رویے سماجی، تہذیبی یا سیاسی ہوں۔ ہمارے ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ زمانہ قدیم میں بھی اپنے عہد کی سیاسی شکست وریخت پر شعراء نے بلاخوف اظہار خیال کیا ہے۔ یہاں تک عرشؔ کا معاملہ ہے انہوں نے تقسیم ہند کا دل سوز سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بلکہ وہ خود بھی کئی طرح کی اذیتوں سے گزرے ہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد فرقہ وارنہ فسادات کا دور بھی ان کے لئے انتہائی کرب ناک تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انسانی لہو ندی نالوں میں پانی کی طرح بہہ رہا تھا، ہر چوراہے پر عورتوں کی عصمت لٹنے کی کہانیاں تحریر تھیں۔ عرشؔ نے جموں کشمیر کے گاؤں، شہروں اور بازاروں کو اجڑتے بستے، بستے اجڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ انہوں نے مختلف سماجی، سیاسی، معاشرتی اور ادبی رجحانات وتحریکات کی نبضوں کو بھی بنتے بگڑتے دیکھا ہے۔ وہ خود اگرچہ کسی تحریک یا رجحان سے وابستہ نہیں رہے پھر بھی ایک فنکار کے تخلیقی شعور پر زمانے کے حالات، تحریکات اور رجحانات کا اثر ضرور پڑتا ہے۔

عرشؔ صہبائی کی غزلوں کے موضوع خارجی ہوں یا داخلی ان میں ایک خاص قسم کا آہنگ ملتا ہے، جس میں ایک تاثر ہے، لطافت ہے، موسیقیت ہے، شبنمیت ہے، ترنم ہے، نغمگی اور اشاریت ہے۔ ان کے شعری مضامین میں انسانی ہمدردی ودردمندی، انسانیت واخلاقی قدریں، حق گوئی اور جذبہ اصلاح کے عناصر خمیر کا درجہ

رکھتے ہیں۔ان کی شاعری میں ذات پات،اونچ نیچ اورقومی تعصب کی جھلک بھی کہیں کہیں دیکھنے کوملتی ہے۔ان کی ساری زندگی سیاسی حالات سے بھری پڑی ہے ان کے سیاسی نظریات اور خیالات کا عکس ان کی غزلوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔اردو شعری روایت میں سیاست اور سیاست دانوں پر طنزیہ اور تمہید یہ شاعری کی اپنی ایک تاریخ ہے۔شاعروں اورادیبوں کا سیاسی موضوع کے ساتھ بہت قریب کا رشتہ ہے۔اردو غزل کی روایت میں دیکھیں تو ہرایک شاعر کے یہاں سیاسی رنگ کے اشعار مل ہی جاتے ہیں۔مثلاً جگرؔ مرادآبادی لکھتے ہیں:

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
مرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے(۲۵۵)

حسرتؔ موہانی کا شعر دیکھئے:

نام سے قانون کے ہوئے کیا کیا ستم
جبر بزیر نقاب دیکھئے کب تک رہے(۲۵۶)

جگرؔ وحسرتؔ نے تو یہ اشعار تو بہت پہلے کہے ہیں جبکہ آج کی سیاست ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔عرشؔ کے ہم زمانہ میں سیاسی رنگ کی بات کریں تو ساغراعظمی کا یہ دیکھئے:

شرط یہی ہے کوئی منصف آئے تو اس بستی میں
رات میں کتنے گھر اجڑے ہیں صبح کا منظر بولے کا (۲۵۷)

عرشؔ صہبائی سیاست اور سیاست دان دونوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔انہیں اپنی ریاست کی سیاست نے کئی ایک کے بعد ایک جھٹکے دیے ہیں اور آج کے سیاسی موحول سے کون آگاہ نہیں ہے۔ عالمی وبائیں آج سے قبل بھی آتی رہیں ہیں لیکن آج تک اتنے مشکل دن کبھی نہیں آئے کہ انسان کی جان کی کوئی قیمت نہ رہی ہو۔عرشؔ نے اپنی نظم،دوہا،اور قطعہ میں جتنی شدت سے سیاسی رہنماؤں پر طنز کی ہے اتنی غزل میں نہیں کی لیکن جتنی کی ہے وہ حق پر مبنی ہے۔مثال کے لئے ان کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

عبث نہ اہل سیاست کو کیجئے بدنام
یہ خون پیتے ہیں لوگوں کا بادہ خوار نہیں(۲۵۸)

کہہ نہیں سکتے کہ ہندوستان کا کیا ہو انجام
عرشؔ یہ اہل سیاست کے کرم کی زد میں ہیں (۲۵۹)

نہ اس میں ماضی کی قدریں نہ خلوص و وفا
مئے مزاج کی تہذیب کو سلام میرا(۲۶۰)

ہیں رہبروں کے لبادے میں جو سیاست دان
وطن فروش ہیں یہ لوگ سرفروش نہیں (۲۶۱)

بحیثیت مجموعی عرشؔ صہبائی کی شاعری میں نئی حسیت، عصری آگہی اور روایتی شعور اس طرح ہم امیز ہیں کہ انہیں الگ الگ خانوں میں رکھ کر پرکھنا اور دیکھنا بہت مشکل کام ہے۔ روایت یا کلاسکیت میں زبان کے تخلیقی برتاؤ، پیرایہ اظہار اور اصول فن کی پاسداری خاص اہمیت رکھتے ہیں۔عرشؔ کی شاعری میں موجود جذباتی وفود، دھیما پن اور پرنم ریزی غضب کی طلسماتی گرفت رکھتی ہے۔انہوں نے اپنے تخلیقی اظہار کے لئے جو زبان تخلیق کی ہے وہ روایت سے قوت حاصل کرتی ہے۔ روایت کا تغافل ان کی شاعری کو ایک اثر آفرین اور متنوع بناتا ہے۔اردو شاعر کی روایت کا تغاعل عرشؔ کی شاعری کو اثر آفریں اور متنوع بناتا ہے۔عرشؔ نے جس وقت شاعری شروع کی تھی وہ دور فانیؔ بدایونی، جگرؔ مراد آبادی، یگانہؔ چنگیزی، سیمابؔ اکبر آبادی ،جوشؔ ملیح آبادی، منورؔ لکھنوی، فیض احمد فیضؔ اور فراقؔ گورکھپوری کے نظریہ شعر کے حیطہ اثر میں تھا۔ان میں میں سے فانی، جگر اور یگانہؔ کلاسکیت کی جانب پوری طرح سے متوجہ تھے جبکہ سیمابؔ اور جوشؔ نو کلاسکیت کی جانب متوجہ تھے۔شاید یہی وجہ ہے کہ نو کلاسیکی شعراء کی طرح کلاسکیت اور نو کلاسکیت کے درمیان ایک کشمکش عرشؔ کے شعری اسلوب میں بھی واضع طور پر نظر آتی ہے۔ان کا کلام پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ کہیں یہ حد درجہ روایت پرستی کے رجحانات کے تحت تراکیب سازی، بندش کی چستی، تراش خراش اور تخلیقی برتاؤ کی طرف مائل نظر ہوئے ہیں اور کہیں غیر تخلیقی پرتاؤ اور راست بیانی کے قائل ہوئے ہیں۔

عرشؔ صہبائی نے اردو شاعری کی روایت سے اپنا تخلیقی رشتہ قائم کیا ہے۔ان کی شاعری میں اعلیٰ انداز اسلوب، بہترین زبان کا استعمال، روایتی لفظیات کا استعمال، نئی معنویت کے ساتھ قدم قدم پر کشادہ منظری کا احساس دلاتا ہے۔ان کا ڈکشن فانیؔ ،داغؔ اور جوشؔ کے شعری ڈکشن کی توسیع ہے اور یہ تمام تر لفظیات عربی، فارسی، ہندی اور اردو کی روایتی لفظیات پر مشتمل ہے جس کو عرشؔ نے اپنے منفرد تخلیقی طرز انداز کے ذریعے لا جواب تاثرات سے مزین کیا ہے۔ روایت ان کی شاعری میں ایک طاقت اور عنصر کی طرح شامل ہے۔وہ اردو کی شعری روایت کی بے پناہ قوت سے پوری طرح واقف تھے۔اسی وجہ سے انہوں نے روایت میں موجود وسیع

امکانات کو بروئے کار لاکر نہ صرف اردو شعری روایت کی بازیافت کی بلکہ اپنی تخلیقی اپج کو باہر لانے میں روایت کا سہارا بھی لیا۔عرشؔ صہبائی سے پہلے بھی ہماری شاعری میں عربی ،فارسی اور ہندی زبان کے الفاظ قفس، قتیل، سفینہ، شنید، قتل گاہ، طوائف، جوگی، نقش پا، رقیب، جادہ ومنزل، اغیار وغیرہ جی ملتے ہیں مگر عرشؔ نے اس روایتی سرمایہ الفاظ میں صحیح معنوں میں معنوی وسعت پیدا کردی ہے۔انہوں نے جہاں جہاں جس انداز میں روایتی لفظیات اور اسلوب کو اپنایا ہے اس سے نہ صرف شعری اسلوب کی بازیافت ہوئی ہے بلکہ اس کے وسیع امکانات کھل کر سامنے آگئے ہیں ۔عرشؔ صہبائی کا شعری اسلوب روایت کے گہرے شعور سے مزین ہے۔غزل کو داخلی صورت عطا کرنے اور اسے ملائمت ،دھیما پن ،سوز وگداز سے متصف کرنے میں انہوں نے کلاسیکی روایت کا استعفادہ کیا ہے لیکن انہوں نے خود بھی اپنے شعور فن کام لے کر اس کو خوشگوار تبدیلیوں سے ہم کنار کیا ہے۔وہ غزل کی صنف میں ہیئت پر گہری نظر رکھتے تھے۔وہ غزل کے شعر میں کم سے کم لفظوں سے زیادہ سے زیادہ وسعت پیدا کرنے کی آگہی رکھتے تھے۔اکثر غزل گوشعراء خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید لفظوں کو فیاضی سے استعمال کرتے ہیں اور شعری عمال کو زک پہچانتے ہیں۔دوسری ایک اہم خصوصیت یہ کہ عرشؔ کے یہاں کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ جدت پسندی کا اظہار بھی ملتا ہے۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے یہاں روایت اور جدت گلے ملتی نظر آتی ہے۔

حواشی:

۱۔ پروفیسر ایس اے قاضی شاذ شرقی ،عرشؔ صہبائی شخصیت اور شاعری ،جموں: شاذ شرقی ،۲۰۰۸ء،ص،۱۵

۲۔ غلام جیلانی ،عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی ،جموں: آزاد بک ویزن ،۲۰۱۵ء،ص،۲۷۹

۳۔ ایضاً ص،۳۲۶

۴۔ شیرازہ ،عرشؔ صہبائی نمبر، جلد ،۵۶، شمارہ ،۳،۴،سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لیگوی، اپریل ۲۰۱۸ء،ص،۲۱۴

۵۔ عرشؔ صہبائی ،شکست جام ،جموں: مکتبہ اردو ادب ،۱۹۵۸ء،ص،۷

۶۔ ایضاً ص ص،۸۔۹

۷۔ عرشؔ صہبائی ،شکست جام ،جموں: مکتبہ اردو ادب ،۱۹۵۹ء،ص،۹

۸۔ ایضاً ص،۱۱

۹۔ عرشؔ صہبائی،عکس جمال، جموں:عرشؔ صہبائی،۲۰۰۷ء،ص،۱۱

۱۰۔ غلام جیلانی،عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویژن،۲۰۱۵ء،ص،۳۲۰

۱۱۔عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس،۱۹۹۵ء،ص،۱۲۲

۱۲۔کرن کوشل ٹھاکر،اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن،۲۰۱۳ء،ص،۱۸۷۔۱۸۸

۱۳۔ ایضاً ص،۱۸۴

۱۴۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندستانی آرٹ پریس،۱۹۹۵،ص،۲۲

۱۵۔ عرشؔ صہبائی،چشم نیم باز، جموں: نمی ڈوگری سنسنتھادی آرٹ فونڈیشن، ۲۰۰۷ء،ص،۸

۱۶۔ عرشؔ صہبائی،شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب،۱۹۵۹ء،ص،۲۳

۱۷۔ عابدؔ مناوری، بہار غزل، جموں: مکتبہ اردو ادب، جون ۱۹۶۱ء،ص،۱۷

۱۸۔ سید نوشاد علی، غیر مسلم غزل گو،اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۷ء،ص،۱۰۲

۱۹۔ شکیلؔ بدایونی،کلیات شکیلؔ بدایونی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۶ء،ص،۳

۲۰۔ صابرؔ دت،فن اور شخصیت ساحرؔ لدھیانوی نمبر،شمارہ ۱۷،۱۸،بمبئی: ساحر پبلشنگ ہاؤس،فروری ۱۹۸۵ء،ص،۴۱۵

۲۱۔ غلام ربانی تاباںؔ، ذوق سفر، دریا گنج دہلی: لبرٹی آرٹ پریس، اپریل ۱۹۷۰ء،ص،۱۲۹

۲۲۔ فانیؔ بدایونی،کلیات فانیؔ، دہلی: پرویز بک ڈپو، ب۔ت،ص،۴۵

۲۳۔ مہیش چندر نقشؔ، انداز، دہلی: یونین پرنٹنگ پریس،۱۹۶۲ء،ص،۱۰۱

۲۴۔ فراقؔ گورکھپوری،گل نغمہ، دہلی: ادارہ علم و ادب،۲۰۰۶ء،ص،۹۱

۲۵۔ شیرازہ ،عرشؔ صہبائی نمبر، جلد ،۵۶، شمارہ ،۳،۴،سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لیگوی، اپریل ۲۰۱۸ء،ص،۱۳۸

۲۶۔ ایضاً ص،۲۶

۲۷۔ ایضاً ص،۱۴۴

۲۸۔ عرشؔ صہبائی،شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب،۱۹۶۱ء،ص،۱۰۸

۲۹۔ ایضاً ص،۸۴

۳۰۔ عرشؔ صہبائی،شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب،۱۹۵۹ء،ص،۱۰۶

۳۱۔ عرشؔ صہبائی،سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن،۲۰۱۰ء،ص،۶۷

۳۲۔ عرشؔ صہبائی،شکست جام،جموں: مکتبہ اردو ادب،۱۹۵۹ء،ص،۹۶

۳۳۔ جگرمرادآبادی،کلیات جگرمرادآبادی،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،۲۰۰۵ء،ص،۱۰۴

۳۴۔ جگرمرادآبادی،آتش گل،نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ،۱۹۷۲ء،ص،۱۲۶

۳۵۔ ضیاؔ جالندھری،سرشام،لاہور:سویرا آرٹ پریس،۱۹۶۸ء،ص،۲۴

۳۶۔ میکشؔ کاشمیری،باہما،پونہ:پربھات پرنٹنگ پریس،۱۹۹۸ء،ص،۸۲

۳۷۔ ایضاً ص،۸۴

۳۸۔ عرشؔ صہبائی،سائے تیری یادوں کے،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۰ء،ص،۳۴

۳۹۔ شیرازہ،عرشؔ صہبائی نمبر، جلد،۵۶، شمارہ،۳،۴،سرینگر:جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لیگوی،اپریل ۲۰۱۸ء،ص،۱۳۴

۴۰۔ عرشؔ صہبائی،ریزہ ریزہ وجود،جموں:ہندوستانی آرٹ پریس،فروری ۱۹۹۵ءص،۳۲

۴۱۔ شیرازہ،عرشؔ صہبائی نمبر، جلد،۵۶، شمارہ،۳،۴،سرینگر:جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لیگوی،اپریل ۲۰۱۸ء،ص،۱۳۹

۴۲۔ عرشؔ صہبائی،نایاب،دہلی:جے کے آفسیٹ پرنٹرز،۲۰۰۴ء،ص،۴۹

۴۳۔ محمد طاہر عزیز خان،تیری پرفسوں نگاہیں عرشؔ صہبائی،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،۲۰۱۹ء،ص،۸۸

۴۴۔ عرشؔ صہبائی،ریزہ ریزہ وجود،جموں:ہندوستانی آرٹ پریس،فروری ۱۹۹۵ء،ص،۶۶

۴۵۔ بدایونی،فانیؔ،کلیات فانیؔ،دہلی: پرویز بک ڈپو،ب۔ت ء،ص،۴۶

۴۶۔ لدھیانوی،ساحرؔ،کلیات ساحرؔ،دہلی: کتابی دنیا،۲۰۰۶ء،ص،۳۹

۴۷۔ صابرؔ دت،مدیر فن اور شخصیت غزل نمبر،شمارہ ۶،مارچ جلد ۴،بمبئی:علوی بک ڈپو،ص،۵۳۹

۴۸۔ ایضاً ص،۵۸۴

۴۹۔ صابرؔ دت،مدیر فن اور شخصیت ساحرؔ لدھیانوی نمبر،شمارہ ۱۷،۱۸،بمبئی:ساحر پبلشنگ ہاؤس،فروری ۱۹۸۵ء،ص،۳۸۸

۵۰۔ خواجہ محمد ذکریہ،کلیات حفیظؔ جالندھری،نئی دہلی:فرید بک ڈپو(پراوئیٹ)لمٹیڈ،۲۰۰۸ء،ص،۱۹۶

۵۱۔ سید خورشید کاظمی،مغنی حیات عرشؔ صہبائی،سرینگر:میزان پبلیشرز،۲۰۱۸ء،ص،۵۶

۵۲۔ عرشؔ صہبائی،ریزہ ریزہ وجود،جموں:ہندوستانی آرٹ پریس،فروری ۱۹۹۵ء،ص،۴۶

۵۳۔ ایضاً ص،۳۶

۵۴۔ عرشؔ صہبائی، خدوخال، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۸ء،ص ،۱۰

۵۵۔ غلام جیلانی،عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵،ص ،۱۳۱

۵۶۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، دہلی: عرشؔ صہبائی،۲۰۰۴ء،ص ،۲۹

۵۷۔عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندوستانی آرٹ پریس،فروری ۱۹۹۵ء،ص ،۲۲

۵۸۔ عرشؔ صہبائی، گہی، کٹھوعہ جموں: مرکز تصنیف وتالیف،۲۰۱۵ء،ص ،۹۲

۵۹۔ عرشؔ صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، جموں: مانوی پرکاشن،۲۰۱۳ء،ص ،۲۲

۶۰۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندوستانی آرٹ پریس،فروری ۱۹۹۵ء،ص ،۱۷

۶۱۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن،۲۰۱۳ء،ص ،۱۱۵

۶۲۔ ایضاً ص ،۹۲

۶۳۔ ایضاً ص ،۱۰۶

۶۴۔ ایضاً ص ،۱۱۵

۶۵۔ عرشؔ صہبائی، توازن، جموں: مانوی پبلکیشن ،۲۰۰۵ء،ص ،۳۰

۶۶۔ عرشؔ صہبائی، جواز، جموں: مانوی پرکاشن،۲۰۱۱ء،ص ،۵۶

۶۷۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی،۲۰۰۴ء،ص ،۸۸

۶۸۔ ایضاً ص ،۱۴۷

۶۹۔ سید شمیم حسین، اردو کے ضرب المثل اشعار، لکھنو: ایڈورٹائزرس انڈیا،۲۰۱۴،ص :۳۳

۷۰۔ محمد شمس الحق، اردو کے ضرب المثل اشعار، کراچی: ادارہ یادگار غالب،۲۰۰۳،ص :۵۱

۷۱۔ ایضاً ص ،۷۶

۷۲۔ ایضاً ص ،۹۱

۷۳۔ فانیؔ بدایونی، عرفانیات فانیؔ، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)،۱۹۳۹ء،ص ،۹۰

۷۴۔ محمد شمس الحق، اردو کے ضرب المثل اشعار، کراچی: ادارہ یادگار غالب،۲۰۰۳ء،ص ،۱۳۰

۷۵۔ ناصرؔ کاظمی، برگ نے، نئی دہلی: شان ہند پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء،ص ،۱۳۰

۷۶۔ محمد شمس الحق، اردو کے ضرب المثل اشعار، کراچی: ادارہ یادگار غالب،۲۰۰۳ء،ص ،۱۵

۷۷۔ ایضاً ص ،۳۶

۷۸۔ عرشؔ صہبائی،سائے تیری یادوں کے،جموں: مانوی پرکاشن،۲۰۱۰ء،ص،۶۶

۷۹۔ ایضاً ص،۶۶

۸۰۔ عرشؔ صہبائی،نایاب،جموں:عرشؔ صہبائی،۲۰۰۴ء،ص،۱۲۷

۸۱۔ عرشؔ صہبائی،سائے تیری یادوں کے،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۰ء،ص،۶۶

۸۲۔ عرشؔ صہبائی،خدوخال،جموں:مانوی پبلی کیشن،۲۰۰۸،ص،۸۴

۸۳۔ عرشؔ صہبائی،سائے تیری یادوں کے،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۰ء،ص،۶۷

۸۴۔ عرشؔ صہبائی،خدوخال،جموں:مانوی پبلی کیشن،۲۰۰۸،ص،۸۵

۸۵۔ ایضاً ص،۸۳

۸۶۔ قربان علی سالک،کلیات سالکؔ،لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۶۶ء،ص،۲۰۵

۸۷۔ غلام جیلانی،عصری آ گہی کا شاعر عرشؔ صہبائی،جموں: آزاد بک ویزن،۲۰۱۵ء،ص،۹۴

۸۸۔ عرشؔ صہبائی،تجھ بن چین کہاں،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۰۹ء،ص،۳۴

۸۹۔ محمد طاہر عزیز خان،تری پرفسوں نگاہیں عرشؔ صہبائی،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،۲۰۱۹ء،ص،۳۱

۹۰۔ کرن کوشل ٹھاکر،اردو غزل کی عہد ساز شخصیت،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۳ء،ص،۱۱۶

۹۱۔ پروفیسر عبدالقادر سروریؔ،کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)،سرینگر:جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگوئجز،
۱۹۸۴ء،ص،۴۷

۹۲۔ میر تقی میرؔ،انتخاب کلام میرؔ،دہلی:ہندوستان لیتھو پرنٹنگ پریس،۱۹۶۰ء،ص،۱۴

۹۳۔ قاضی جمال حسین،انتخاب غزلیات داغ،لکھنو:اتر پردیش اردو اکیڈمی،۱۹۸۴ء،ص،۴۱

۹۴۔ خلیق انجم،انتخاب کلام حسرتؔ،نئی دہلی:انجمن ترقی اردو،۱۹۹۵ء،ص،۴۲

۹۵۔ فراقؔ گورکھپوری،گل نغمہ،الہ آباد:ادارہ انیس اردو،۱۹۷۱ء،ص،۵۱

۹۶۔ ناصرؔ کاظمی،برگ نے،نئی دہلی:شان ہند پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء،ص،۳۳

۹۷۔ عرشؔ صہبائی،نایاب،جموں:عرشؔ صہبائی،۲۰۰۴ء،ص،۹

۹۸۔ عرشؔ صہبائی،سائے تیری یادوں کے،جموں: مانوی پرکاشن،۲۰۱۰ء،ص،۲۴

۹۹۔ صہبائی،عرشؔ،خدوخال،جموں:مانوی پبلی کیشن،۲۰۰۸ء،ص،۴۴

۱۰۰۔ ایضاً ص،۶۷

۱۰۱۔ عرشؔ صہبائی،نایاب،جموں:عرشؔ صہبائی،۲۰۰۴ء،ص،۱۲

۱۰۲۔ عرشؔ صہبائی، جواز، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۱ء، ص، ۶۷
۱۰۳۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرش صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵ء، ص، ۹۸
۱۰۴۔ عرشؔ صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۱۱۹
۱۰۵۔ ایضاً ص، ۱۱۲
۱۰۶۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵ء، ص، ۹۸
۱۰۷۔ عرشؔ صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۸۲
۱۰۸۔ محمد شمس الحق، اردو کے ضرب المثل اشعار، کراچی: ادارہ یادگار غالب، ۲۰۰۳ء، ص، ۱۵
۱۰۹۔ فانیؔ بدایونی، کلیات فانیؔ، دہلی: پرویز بک ڈپو، ب۔ت، ص، ۶۶
۱۱۰۔ مسعود الحسن صدیقی، انتخاب کلام داغؔ، دہلی: یونین پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۱ء، ص، ۴۷
۱۱۱۔ فراقؔ گورکھپوری، گل نغمہ، الہ آباد: ادارہ انیس اردو، ۱۹۷۱ء، ص، ۵۷
۱۱۲۔ نظیر اکبر آبادی، دیوان نظیرؔ اکبر آبادی، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۴۲ء، ص، ۵۷
۱۱۳۔ محمد شمس الحق، اردو کے ضرب المثل اشعار، کراچی: ادارہ یادگار غالب، ۲۰۰۳ء، ص، ۱۵
۱۱۴۔ ایضاص، ۱۵
۱۱۵۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۴ء، ص، ۲۳
۱۱۶۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۲۸
۱۱۷۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵ء، ص، ۱۰۰
۱۱۸۔ ایضاً ص، ۱۰۰
۱۱۹۔ ایضاً ص، ۱۰۰
۱۲۰۔ مسعود الحسن صدیقی، انتخاب کلام داغؔ، دہلی: یونین پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۱ء، ص، ۱۰
۱۲۱۔ میر تقی میرؔ، کلیات میرؔ، کراچی: اردو دنیا، ۱۹۵۸ء، ص، ۲۶۸
۱۲۲۔ ایضاً ص، ۴۶۷
۱۲۳۔ ناصرؔ کاظمی، دیوان ناصرؔ کاظمی، اسلام پورہ لاہور: مکتبہ خیال، ۱۹۸۱ء، ص، ۷۹
۱۲۴۔ حامدی کشمیری، ناصرؔ کاظمی کی شاعری، الہ آباد: نیشنل آرٹ پریس، ۱۹۸۲ء، ص، ۵۰
۱۲۵۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۳۶
۱۲۶۔ ایضاص، ۵۱
۱۲۷۔ ایضاص، ۵۲

۱۲۸۔ ایضاً ص:۷۶

۱۲۹۔ غلام جیلانی،عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویژن، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۱

۱۳۰۔ ایضاً ص:۱۰۱

۱۳۱۔ ایضاً ص:۱۰۱

۱۳۲۔ عرشؔ صہبائی،عکس جمال، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۷ء، ص ۹۹

۱۳۳۔ شاذ شرقی پروفیسر ایس اے قاضی،عرشؔ صہبائی کی شخصیت اور شاعری، جموں: شاذ شرقی، ۲۰۰۸ء، ص ۸

۱۳۴۔ عبدالمعز شمس، آنکھ اور اردو شاعری،علی گڑھ: ایویروز اکیڈمی، ۲۰۱۸ء، ص ۵۴

۱۳۵۔ ایضاً ص ۵۹

۱۳۶۔ ایضاً ص ۵۵

۱۳۷۔ ساحرؔ لدھیانوی،کلیات ساحر، نئی دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۶ء، ص ۳۷۲

۱۳۸۔ مقدمہ مولوی عبدالحق، انتخاب کلام میرؔ (مع فرہنگ)، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۰۸ء، ص ۳۵

۱۳۹۔ عبدالمعز شمس، آنکھ اور اردو شاعری،علی گڑھ: ایویروز اکیڈمی، ۲۰۱۸ء، ص ۹۲

۱۴۰۔ فانیؔ بدایونی،کلیات فانیؔ، دہلی: پرویز بک ڈپو، ب۔ت، ص ۳۳

۱۴۱۔ عبدالمعز شمس، آنکھ اور اردو شاعری،علی گڑھ: ایویروز اکیڈمی، ۲۰۱۸ء، ص ۶۸

۱۴۲۔ ایضاً ص ۶۱

۱۴۳۔ ایضاً ص ۴۴

۱۴۴۔ خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۸۳

۱۴۵۔ عرشؔ صہبائی، چشم نیم باز، جموں: نمی ڈوگری سنستھا۔ دی آرٹ فونڈیشن، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱

۱۴۶۔ ایضاً ص ۳۲

۱۴۷۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص ۳۳

۱۴۸۔ خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۸۳

۱۴۹۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص ۳۳

۱۵۰۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص ۸۲

۱۵۱۔ خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۸۳

۱۵۲۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص ۸۴

۱۵۳۔ خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۸۴

۱۵۴۔ عرشؔ صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳، ص، ۳۰
۱۵۵۔ خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص، ۸۵
۱۵۶۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۷ء، ص، ۹۲
۱۵۷۔ ایضاً ص، ۹۰
۱۵۸۔ ولی محمد ولیؔ، دیوان ولیؔ، دہلی: جید برقی پریس، ۱۹۲۱ء، ص، ۱۲۰
۱۵۹۔ جگرؔ مرادآبادی، کلیات جگرؔ مرادآبادی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۵ء، ص، ۲۷۵
۱۶۰۔ سراجؔ اورنگ آبادی، کلیات سراجؔ، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۲ء، ص، ۳۴۳
۱۶۱۔ جگرؔ مرادآبادی، کلیات جگرؔ مرادآبادی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۵ء، ص، ۱۳۲
۱۶۲۔ فراقؔ گورکھپوری، گل نغمہ (تیسرا ایڈیشن)، الہ آباد: ادارہ انیس اردو، ۱۹۷۱ء، ص، ۴۳
۱۶۳۔ مسعودالحسن صدیقی، انتخاب کلام داغؔ، دہلی: یونین پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۱ء، ص، ۲۰
۱۶۴۔ خلیق انجم، انتخاب کلام حسرتؔ، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۵ء، ص، ۸۴
۱۶۵۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۷ء، ص، ۱۰۶
۱۶۶۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۱۷
۱۶۷۔ ایضاً ص، ۱۹
۱۶۸۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۷۷
۱۶۹۔ ایضاً ص، ۱۲۰
۱۷۰۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۳۴
۱۷۱۔ فراقؔ گورکھپوری، گل نغمہ (تیسرا ایڈیشن)، الہ آباد: ادارہ انیس اردو، ۱۹۷۱ء، ص، ۱۱۰
۱۷۲۔ عرشؔ صہبائی، اسلوب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۱ء، ص، ۱
۱۷۳۔ ایضاً ص، ۲۵
۱۷۴۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۳۷
۱۷۵۔ ایضاً ص، ۱۲۶
۱۷۶۔ فراقؔ گورکھپوری، گل نغمہ (تیسرا ایڈیشن)، الہ آباد: ادارہ انیس اردو، ۱۹۷۱ء، ص، ۱۱۳
۱۷۷۔ جگرؔ مرادآبادی، کلیات جگرؔ مرادآبادی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۵، ص، ۱۰۴
۱۷۸۔ سید جعفر حسین منظرؔ لکھنوی، دیوان منظر، لکھنو: سرفراز قومی پریس، مارچ ۱۹۶۲ء، ص، ۱۱۴
۱۷۹۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۶۷

۱۸۰۔ پروفیسر قمر رئیس، معاصر اردو غزل مسائل ومیلانات، دریا گنج دہلی: شوبی آفسیٹ پریس،۲۰۱۴ء،ص،۱۱۷
۱۸۱۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں، مکتبہ اردو ادب،۱۹۶۱ء،ص،۱۱۷
۱۸۲۔ فراقؔ گورکھپوری، گل نغمہ (تیسرا ایڈیشن)، الہ آباد: ادارہ انیس اردو،۱۹۷۱ء،ص،۲۹
۱۸۳۔ مہندر پرتاپ چاندؔ، حرف راز، ہریانہ: منوج پبلی کیشنز،۱۹۷۴ء،ص،۱۱
۱۸۴۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب،۱۹۵۹ء،ص،۲۶
۱۸۵۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں: مکتبہ اردو ادب،۱۹۶۱ء،ص،۱۱۶
۱۸۶۔ ایضاً ص،۹۷
۱۸۷۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں: عرشؔ صہبائی،۲۰۰۷ء،ص،۸۷
۱۸۸۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب،۱۹۶۱ء،ص،۸۱
۱۸۹۔ داغؔ دہلوی، آفتاب داغؔ (دیوان دوم)، لکھنو: سرفراز قومی پریس، ب۔ت، ص،۲۹
۱۹۰۔ ایضاً ص،۱۲
۱۹۱۔ ساحرؔ لدھیانوی، کلیات ساحرؔ، نئی دہلی: کتابی دنیا،۲۰۰۶ء،ص،۱۳۵
۱۹۲۔ محمود بیگ سازؔ برہانپوری، تارنفس، بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی،۱۹۹۵ء،ص،۳۹
۱۹۳۔ جگرؔ مرادآبادی، کلیات جگرؔ مرادآبادی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،۲۰۰۵ء،ص،۱۰۴
۱۹۴۔ شاہد ماہلی، داغؔ دہلوی، دہلی: عزیز پرنٹنگ پریس،۲۰۰۱ء،ص،۵۰
۱۹۵۔ شیرازہ، عرشؔ صہبائی نمبر، جلد،۵۶، شمارہ،۳،۴، سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لیگویجز، اپریل ۲۰۱۸ء،ص،۲۸
۱۹۶۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ، دل کے خواب ادھورے سے، کٹھوعہ جموں: مرکز تصنیف وتالیف،۲۰۱۴ء،ص ص:۵۔۶
۱۹۷۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں: عرشؔ صہبائی،۲۰۰۷ء،ص:۵۰
۱۹۸۔ خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز،۲۰۱۸ء،ص،۲۶
۱۹۹۔ ایضاً ص،۲۸
۲۰۰۔ ایضاً ص،۲۷
۲۰۱۔ عرشؔ صہبائی، چشم نیم باز، جموں: نمی ڈوگری سنستھا دی آرٹ فونڈیشن،۲۰۰۷ء،ص،۸۰
۲۰۲۔ ایضاً ص،۱۵
۲۰۳۔ ایضاً ص،۸۲
۲۰۴۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندوستانی آرٹ پریس، فروری ۱۹۹۵ء،ص،۱۵

۲۰۵۔ عرشؔ صہبائی، چشم نیم باز، جموں: نمی ڈوگری سنستھا دی آرٹ فونڈیشن، ۲۰۰۷ء، ص، ۱۵

۲۰۶۔ مولوی عبدالحق، انتخاب کلام میرؔ (مع فرہنگ)، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۰۸ء، ص، ٦٦

۲۰۷۔ محمودالحسن صدیقی، انتخاب کلام داغؔ، دہلی: یونین پرنٹنگ پریس، ۱۹٦۱ء، ص، ۱۵

۲۰۸۔ خلیق انجم، انتخاب کلام حسرتؔ، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۵ء، ص، ۳۵

۲۰۹۔ فانیؔ بدایونی، کلیات فانیؔ، دہلی: پرویز بک ڈپو، ب۔ت، ص، ۱۱۵

۲۱۰۔ ڈاکٹر خلیل احمد خان، منتخب کلیات ریاض خیرآبادی، لکھنو: نامی پریس نخاس، ۱۹۸۲ء، ص، ۲۳

۲۱۱۔ ایضاً ص، ۲۲

۲۱۲۔ داغؔ دہلوی، آفتاب داغؔ (دیوان دوم) لکھنو: سرفراز قومی پریس، ب۔ت، ص، ۲۹

۲۱۳۔ عندلیب شادانیؔ، دور حاضر اور اردو غزل گوئی، لاہور: علمی پرنٹنگ پریس، ۱۹٦۲ء، ص، ۸۴

۲۱۴۔ ایضاً ص، ۸۵

۲۱۵۔ ایضاً ص، ۸۴

۲۱٦۔ ایضاص، ۸۵

۲۱۷۔ ایضاص، ۸۴

۲۱۸۔ ایضاص، ۸۵

۲۱۹۔ جوشؔ ملسیانی، آئینۂ اصلاح، دہلی: یونین پرنٹنگ پریس، ۱۹٦۸ء، ص، ۵۲

۲۲۰۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹٦۱ء، ص، ۱۳

۲۲۱۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۳۲

۲۲۲۔ ایضاً ص، ۳۵

۲۲۳۔ ایضاً ص، ۱۰۸

۲۲۴۔ ایضاً ص، ٦٦

۲۲۵۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل: جموں، مکتبہ اردو ادب، ۱۹٦۱ء، ص، ۱۱۲

۲۲٦۔ ایضاً ص، ۱۰۸

۲۲۷۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۱۰

۲۲۸۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹٦۱ء، ص، ٦۵

۲۲۹۔ ایضاً ص، ٦۷

۲۳۰۔ عرشؔ صہبائی،شکست جام،جموں: مکتبہ اردو ادب،۱۹۵۹ء،ص،۲۰

۲۳۱۔ ایضاً ص،۷۹

۲۳۲۔ ایضاً ص،۳۵

۲۳۳۔ ایضاً ص،۳۶

۲۳۴۔ ایضاً ص،۶۹

۲۳۵۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی،اردو شاعری اور تصوف،حیدر آباد: مطبعتہ ابوالوفاء الافغانی جامعہ نظامیہ،۲۰۰۹ء،ص،۱۳۹

۲۳۶۔ ایضاً ص،۱۳۹

۲۳۷۔ ایضاً ص،۱۴۴

۲۳۸۔ ایضاً ص،۲۴۵

۲۳۹۔ غلام رسول مہرؔ،دیوان غالب،لاہور:علمی پرنٹنگ پریس،۱۹۶۷ء،ص،۲۱۳

۲۴۰۔ غلام جیلانی،عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی،جموں: آزاد بک ویزن،۲۰۱۵ء،ص،۱۰۳

۲۴۱۔ عرشؔ صہبائی،جواز،جموں: مانوی پرکاشن،۲۰۱۱ء،ص،۸۷

۲۴۲۔ غلام جیلانی،عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی،جموں: آزاد بک ویزن،۲۰۱۵ء،ص،۱۰۴

۲۴۳۔ ایضاً ص،۱۰۴

۲۴۴۔ ایضاً ص،۱۰۵

۲۴۵۔ ایضاً ص،۱۰۶

۲۴۶۔ عرشؔ صہبائی،نایاب،جموں:عرشؔ صہبائی،۲۰۰۴،ص،۹۶

۲۴۷۔ غلام جیلانی،عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی،جموں: آزاد بک ویزن،۲۰۱۵،ص،۲۰۷

۲۴۸۔ ایضاً ص،۱۰۸

۲۴۹۔ ایضاً ص،۱۰۸

۲۵۰۔ ایضاً ص،۱۰۹

۲۵۱۔ ایضاً ص،۱۰۹

۲۵۲۔ عرشؔ صہبائی،نایاب،جموں:عرشؔ صہبائی،۲۰۰۴ء،ص ص،۱۴۶۔۲۴۷

۲۵۳۔ ایضاً ص،۷

۲۵۴۔ شیرازہ،عرشؔ صہبائی نمبر،جلد،۵۶،شمارہ،۳۔۴،سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز،۲۰۱۸ء،

ص،۲۱۴

۲۵۵۔ پرویز احمد اعظمی،اردو میں سیاسی شاعری کی ادبی قدرو قیمت(۱۹۵۰۔۱۹۰۰)،دہلی:نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز، ۲۰۰۹ء،ص،۱۹

۲۵۶۔ ایضاص،۲۱۲

۲۵۷۔ ایضاص،۱۹

۲۵۸۔ عرشؔ صہبائی،شبنم تیری یادوں کی،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۳ء،ص،۱۵

۲۵۹۔ عرشؔ صہبائی،سائے تیری یادوں کے،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۰ء،ص،۱۳

۲۶۰۔ عرشؔ صہبائی،شبنم تیری یادوں کی،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۳ء،ص،۱۷

۲۶۱۔ عرشؔ صہبائی،جواز،جموں:مانوی پرکاشن،۲۰۱۱ء،ص،۸۳

☆☆☆

باب پنجم

عرشؔ صہبائی کی غزل گوئی میں انفرادیت پسندی

عرشؔ صہبائی اردو شعر و ادب کا ایک ایسا نام ہے جو کسی بھی تعارف کا محتاج نہیں۔ بے شک ان کا تعلق ریاست جموں و کشمیر سے ہے لیکن جب ہم ان کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں صرف ریاست تک محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ انہیں برصغیر ہند و پاک کا معتبر و باکمال اردو شاعر کہا جا سکتا ہے۔ آپ کی شاعری شیریں کلامی، نغز گفتاری اور معنی آفرینی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ آپ نے اپنے فن کی خونِ جگر سے آبیاری کی یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں شاعری کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ آپ مسلم الثبوت استاد شاعر کا درجہ رکھتے تھے۔ اردو کے دوسرے مراکز دہلی، لکھنو، عظیم آباد، لاہور، کراچی وغیرہ میں جو آپ کے ہم عصر شعراء موجود ہیں وآپ کی شاعرانہ خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ جہاں نظم، دوہا اور قطعات میں ان کا ایک نام ہے وہیں بحیثیت غزل گو بھی انہیں ایک بلند مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ ان کی غزلوں کو ایسی نرالی انفرادیت حاصل ہے جو ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ بقول کالی داس گپتا رضاؔ ''پورے ہندوستان میں دانشور ہیں اس فہرست میں عرشؔ صہبائی کا نام بھی شامل ہے'' (۱)

عرشؔ صہبائی نے بے شک شاعری کی بے شمار اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ادب میں اپنی پہچان بنائی ہے لیکن ان کے سب سے زیادہ شعری مجموعے غزل کے متعلق ہیں۔ ان کا مزاج غزل سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں بنیادی طور پر غزل کا شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی غزلوں کے بے شمار اشعار ان کی مقبولیت کا باعث بنے ہیں۔ انہیں عالمی سطح پر جو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ ان کے اعلیٰ معیاری کام کی بدولت ہوئی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ انہوں نے دیگر اصنافِ ادب میں بھی بہت کام کیا ہے لیکن غزل سے ان کی دلچسپی بہت زیادہ تھی جس کے چلتے ان کی حیات میں ہی ان کی صرف غزل پر مبنی 18 / شعری مجموعے شائع ہو کر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ان کے علاوہ ان کا ایک مجموعہ ''اعجاز غزل''(2021ء) میں ان کے انتقال کے تھوڑے عرصہ بعد شائع ہو گیا جبکہ ایک مجموعہ ابھی زیرِ طبع ہے جو ابھی منظرِ عام پر آنا باقی ہے۔ ''شکستِ جام'' غزل

گوئی پر مبنی عرشؔ کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو 1958ء میں شائع ہوا تھا جو ان کی شاعرانہ خوبیوں کا اولین جوہر ہے۔ جس کے متعلق جناب بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی لکھتے ہیں: ''شکست جام' میں جو کلام میں نے دیکھا اس میں محبت اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے کا جذبہ بڑی شدت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ بیشتر اشعار میں عملی زندگی کی تڑپ پائی جاتی ہے۔ عرشؔ صہبائی نے ذاتی تجربات کو حقائق کے سانچے میں ڈھالا ہے۔''(۲)

''شکست جام'' میں عرشؔ کی 110 غزلیں شامل ہیں۔ یہ عرشؔ کا دور آغاز ضرور ہے لیکن اس میں موجود کلام میں بھی ایسا سوز و تاثر ہے جو اہل درد کے دل کو پگھلا دیتا ہے۔ انہوں نے اپنے شعری سفر کا آغاز غزل سے کیا اور زندگی کے آخری ایام میں اسی صنف میں ان کا کلام پختگی کو پہنچا۔ ان کی شروع کی غزلوں میں ہی ایک نیا آہنگ اور ایک نئی روش دیکھنے کو ملتی ہے۔ شفاؔ گوالیاری لکھتے ہیں کہ ''شکست جام' قدیم اور جدید شاعری کا حسین سنگم ہے۔ رجائیت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ حیات و کائنات کے نظام کی خرابی پر بھی ہلکی ہلکی نشتر زنی کی ہے۔ جمالیات کے سانچے میں وقت کی گونج کو ڈھالا ہے۔ تغزل کا رنگ کافی نکھرا ہوا ہے۔ شگفتگی، روانی اور سلاست ہر جگہ نمایاں ہے۔ شکست جام گل رنگ و سدا بہار اور غم جاناں و غم دوراں کا بہترین امتزاجی شاہکار ہے۔''(۳)

عرشؔ صہبائی کے کلام پر بطور تبصرہ ان کے شاگردوں کی چند کتابیں، تاثراتی اور تحسینی مضامین ضرور ملتے ہیں لیکن کسی بھی اچھے نقاد نے علمی ڈھنگ سے ان کی غزلوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود بھی میں اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ عرشؔ کی غزل ان کے اعلیٰ اسلوب کی بدولت اردو غزل کے سفر میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ جب بھی کسی اچھے نقاد کی نظر سے گزرے گی وہ یقیناً میری اس بات کی تصدیق کا قائل ہوگا۔ ان کی غزل میں روایت اور جدت کا امتزاج موجود ہے۔ انہوں نے زندگی کا مشاہدہ و مطالعہ طے شدہ نظریوں اور آدرشوں کی مدد سے نہیں کیا بلکہ یہ آگہی انہیں اپنی ذات کی اتھاہ میں اتر کر ہی حاصل ہوئی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزل کو فکر و خیال کا نور عطا کیا ہے۔ ان کا شعر کہنے کا اپنا ایک منفرد انداز تھا۔ اچھی زبان، خیالات میں پاکیزگی اور فنی لوزمات کا استعمال ان کے ہر شعر کی بنیاد ہیں۔ ان کی غزل گوئی کے بارے میں مختلف اخبارات میں بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں جنہیں ''تحریف نامہ'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ان مضامین کا سلسلہ ان کے آغاز شاعری کے وقت سے ہی شروع ہو گیا تھا جو اب تک جاری ہے۔ علی جواد زیدیؔ اپنے ایک مضمون میں عرشؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

نوجوانی میں غزل گوئی بے حد ضرآزما ہو جاتی ہے۔ رندی وحسن پرستی کے ساتھ غم کا گداز اور تجربے کی گہرائی ذرا بدیر آتی ہے پھر زبان و بیان کے مرحلے آتے ہیں جہاں قدم قدم ٹھوکریں کھانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ موجودہ دور میں غزل گو شعراء مشکل سے ملتا ہے۔ عرشؔ صہبائی اس لحاظ سے مستحق ستائش ہیں کہ انہوں نے غزل کو شاعری کا جولانگاہ بنایا ہے۔ ''ایک تبسم ایک نظر'' عرشؔ صہبائی کے احساس حسن میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کی صحت مند محبت عشق مریض کی سرحدوں کو نہیں چھوتی۔ ان کا عشق ایک جوان اور صحت مند عشق ہے جو ایک مسکراہٹ پر دنیا کو نثار کر سکتا ہے اور ایک نظر سے دنیا کا سودا کر سکتا ہے مگر جو کائنات کی حقیقتوں اور تلخیوں سے بے خبر نہیں ہوتا ادھر کئی برس کے بعد ریاست جموں وکشمیر کے کسی شاعر کا ایک اردو مجموعہ شائع ہوا ہے۔ عرشؔ صہبائی ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہی سب سے پہلے اس جمود کو توڑا ہے۔ (۴)

عرشؔ صہبائی کی شاعری بیسویں صدی کے 5 عشروں اور اکیسویں صدی کے دو عشروں پر مشتمل ہے۔ ان کے شعری سفر کی ابتدا 1950ء یا اس سے قبل میں شروع ہوئی اور چونکہ دسمبر 2020ء میں ان کا انتقال واقعہ ہوا اس لئے اسے ان کا آخری دور کہا جا سکتا ہے۔ اتنے طویل عرصے میں بے شمار ادیب وشعراء نے ان کے کلام پر تبصرے وآرائیں پیش کیں ہیں۔ عرشؔ کے ابتدائی کلام پر ڈاکٹر منور سہائے انور اپنی رائے بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''جناب عرشؔ صہبائی کے کلام میں افکار کی طرفگی کے ساتھ ساتھ بیان کی دلآویزی بھی پائی جاتی ہے جو دور حاضر کے جواں سال شعراء کے اشعار میں کبریت احمر کا حکم رکھتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی جناب عرشؔ صہبائی اصول فن اور صحت زبان کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور فرسودہ مضامین نظم کرنے کے بجائے نئے نئے خیالات عمدہ الفاظ کے دلکش لباس میں جلوہ گر کرتے ہیں دنیائے اردو کو ان کی ذات سے بڑی توقعات رکھنی چاہئیں۔'' (۵)

ڈاکٹر منور سہائے انورؔ کی اس رائے کے جواز کے طور پر عرشؔ کے تمام شعری مجموعے پیش کئے جا سکتے ہیں کیوں کہ انہوں نے جب ان کے کلام پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے تب موصوف صرف ایک ہی شعری مجموعے کے مصنف تھے۔ اس شعری مجموعے کے دوسرے ایڈیشن میں دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''شاہراہ'' کی جانب سے ایک رائے نقل ہے جس کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

جوان العمر شاعر عرشؔ صہبائی کئی سال سے رسائل و جرائد میں نظر آتے رہے ہیں اور اب یہ ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو 'شکست جام' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مجموعہ کو دیکھ کر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور پختہ کلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس

مجموعے میں ان کی نمائندہ غزلیں موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ عرشؔ کی شاعری جو بہت کم عمر ہے، مستقبل میں کافی بلندی اور کامیابی کے امکانات رکھتی ہے۔ اسلوب بیان میں انفرادیت اور نیا پن نظر آتا ہے۔ نت نئی ردیفیں تلاش کرنے میں اور خوبصورتی کے ساتھ ان کے نباہ لے جانے میں عرشؔ نے اپنی مشاقی اور جستجو کا ثبوت دیا ہے۔ کلام میں رنگینی اور اثر ہے۔ اس میں ادبی لطافت اور پاکیزگی پائی جاتی ہے۔(۶)

آپ عرشؔ صہبائی کی غزل گوئی کے بارے میں مختلف تاثرات پڑھ کر یہ محسوس کریں گے کہ ہر رائے دہندہ نے ان کے کلام کو اپنے اپنے انداز سے ضرور دیکھا ہے لیکن ہر ایک کی رائے تعریف پر مبنی نہیں ہے۔ ان میں ایسے اہل قلم بھی ہے جنہوں نے ان کی فنی خوبیوں کو سراہا ہے۔ میر امتیاز حسین نے ایک مضمون بہ عنوان ''ایک شخصیت ایک ادارہ'' لکھتے ہیں:

عرشؔ کی پہچان برصغیر میں بطور اردو شاعر دیر سے ہو چکی ہے اور ان کے سات شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ عرشؔ صہبائی نے سماج میں چھپی ہوئی تلخیوں، سختیوں اور بے راہ روی کو زبان دے کر ایک لازوال پیغام دیا ہے۔ ان کی شاعری با معنی اور فکر انگیز ہے۔ فنی اسلوب کی گرفت کے ساتھ ساتھ عرشؔ صاحب کی شاعری کا اچھوتا پہلو یہ ہے کہ انتہائی آسان اور سلیس زبان کا استعمال کیا گیا ہے جس سے ان کی شاعری عام اور مجھ جیسے نیم خواندہ قاری کے دل میں بھی اتر جاتی ہے۔ جناب عرشؔ صہبائی نے اردو غزل کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کر کے اردو شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ عرشؔ ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے روایت سے ہٹ کر اردو غزل کو نئے اسلوب دئے اور بقول شررؔ فتحپوری عرشؔ صہبائی اپنے اسلوب کے واحد تخلیق کار ہیں۔ حالات پر گہری نظر رکھتے ہوئے انسانی کرب اور بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے آپ ایک ایسے ترقی پسند شاعر ہیں جن کی بے باقی دل کو چھو جاتی ہے۔(۷)

عرشؔ کی تمام خدمات اردو غزل کی روایت میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عرشؔ نے جن مضامین پر قلم اٹھایا ہے ان میں سے اکثر و بیشتر اردو غزل میں پہلے بھی موجود تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے غزل کی صنف کو ایک نیا موڑ دیا۔ اس معنی میں کہ انہوں نے جن عناصر کے گرد اپنی غزل کی تعمیر کی وہ ان سے پہلے غزل کا لازمی حصہ نہ تھے۔ عرشؔ کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر شاہنواز کی رائے کی اہم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''عرشؔ صہبائی ادب اور شعر کے تئیں حکیمانہ نظریات کے قائل ہیں اور ادب برائے زندگی ان کا خاص نظریہ ہے، جس کے گرد ان کی شاعری کا سارا نظام تصور گھومتا ہے۔ محبت کا یا سا پاکیزہ ذوق ان کی شاعری میں ملتا ہے کہ اس پر ہزار جی جان سے قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی آرزوئے حیات کی پیداوار وہ دولت تمنا ہے جہاں ہر دوسرا قدم

جادہ حیات کے لئے اٹھتا ہے،اور وجود ممکنات چاہتا ہے۔‘‘(۸)

عرشؔ نے اپنی غزلوں میں رمزیت کا ایک نیا انداز اختیار کیا ہے جو کہ انہیں رفعت عطا کرتا ہے۔ان کی غزل کی خصوصیت ان کا جوش بیان اور رمزیت ہے جس کی مثال اردو کے چند بڑے شاعروں کے علاوہ کسی کے یہاں نہیں ملتی۔عرشؔ کے اشعار کے الفاظ میں بلا کی ایمائی قوت ہوتی ہے۔ان کے تغزل میں رمز و کنایہ کہیں بھی بے جان نہیں ہیں بلکہ انہوں نئے نئے مضامین کو بڑی فنکاری سے اپنی غزل میں ادا کیا ہے۔ان کے یہاں پرانے لفظ نئے معنی پیدا کرتے ہیں۔مئے و میخانہ،زلف و گیسو،شمع و پروانہ،ہجر و وصال،شعاع و شبنم وغیرہ ہمارے دور انحطات کے ادب میں مریضانہ افسردگی پیدا کرنے والے تھے لیکن عرشؔ نے اپنے جوش بیان سے ان ہی الفاظ میں نئی روح پھونکی ہے۔ان کی غزلیں لفظ و لفظ ان کے جذبات و کیفیات کی آواز ہیں۔اردو غزل کے معروف شاعر شکیلؔ بدایونی عرشؔ کے متعلق کہتے ہیں:’’جناب عرشؔ بہترین غزل گو اور بڑے ہونہار، باشعور نوجوان ہیں۔ان کا تغزل کافی نکھرا ہوا اور سلجھا ہوا ہے۔شگفتگی اور رعنائی کے ساتھ گداختگی اور افتادگی کی بھی کمی نہیں ہے۔زندگی کی نقاشی اور کائنات کی عکاسی بھی جلوہ گر ہے‘‘(۹) جسٹس رام پرکاش سیٹھی جو کہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں بطور جج قابل قدر کارنامے انجام دئے ہیں۔وہ ادب بالخصوص شعری ادب کا مطالعہ کرنے میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔جب 1987ء میں جموں کشمیر کورٹ میں جج مقرر ہوئے تو عرشؔ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے کلام سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے فن شخصیت پر تبصرے کے طور پر ایک خط تحریر کیا جو عرشؔ کے شعری مجموعہ ’’عکس جمال کے آخر میں درج ہے۔وہ لکھتے ہیں:

عرشؔ صہبائی محض ایک فرد نہیں بلکہ تحریک اردو ادب کے چند سربرہوں میں سے ہیں جن پر نہ صرف جموں و کشمیر کے عوام فخر کر سکتے ہیں بلکہ پورا برصغیر ہندو پاک ان کی شاعری سے بقعہ نور ہے۔وہ محض ایک عام شاعر نہیں بلکہ وہ آج کی اردو شاعری کی جان ہیں۔وہ ایک پر خلوص اور مرنجان مرغ ہستی ہونے کے علاوہ آج کے دور کی اردو شاعری کے بے تاب بادشاہ ہیں اس کے میر کارواں ہیں اور خصوصی طور پر آبرئے غزل ہیں۔عرشؔ بلا شبہ ان چند شاعروں میں شمار کئے جا سکتے ہیں جو آج کے نامساعد حالات میں اور اردو زبان کی کسمپرسی کے دور میں بھی اردو شاعری کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے باد مخالف کی پرواہ کئے بغیر شمع ادب و ثقافت کے پرچم کو بلندیوں کی طرف لے جانے میں گامزن ہیں۔میں سخنور تو نہیں لیکن سخن شناس ہونے کی کاوش میں میرا اہم عقیدہ ہے کہ جو کلام عرشؔ کا میری نظر سے گزرا ہے اس کے تناظر میں کہہ سکتا ہوں کہ عرشؔ باقعی ’آبروئے غزل‘ ہیں۔انہوں نے غزل کو ایک نیا رنگ روپ دے کر اس کو ماضی کی روایت پرستی سے نکال کر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اثرات سے بچا کر وہ حیثیت اور عظمت بخشی ہے جو شاید بہت سے باوجود چاہنے کے بھی

نہ کر پائے ہوں ۔عرشؔ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا کلام ثقیل اور نا قابل فہم الفاظ سے مبرا ہے ۔زبان نہایت ہی سادہ،خیالات پاک و پاکیزہ ۔ ہر شعر دل میں اتر جانے والا اور دیر پا اثر چھوڑنے والا ہے ۔عرشؔ کی شاعری کا مطالعہ ایک نایاب سرمایہ ہے ۔ مجھے یقین واثق ہے کہ عرشؔ کے شعر کہنے کا انداز انکو اور اردو غزل کو ہمیشہ زندہ رکھے گا اور آنے والے مورخ یا تنقید نگار اگر تعصب کی عینک سے نہ دیکھے تو یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اردو غزل کا تذکرہ عرشؔ صہبائی کے کلام کے بغیر ادھورا ہے ۔ مجھے عرشؔ کا شناسا اور ذاتی طور پر واقف کار ہونے پہ فخر ہے ۔(۱۰)

یہ بات قابل ستائش ہے کہ جسٹس رام پرکاش سیٹھی صاحب کو شدت کے ساتھ یہ احساس تھا کہ عرشؔ جس دور سے گزر رہے ہیں وہ تعصب سے بھرا ہوا ہے ۔ جو سرکاری ادارے جو اردو کے فروغ کے لئے قائم کئے گئے ہیں اسے کسی نہ کسی پہلو سے نقصان پہنچا رہے ہیں اور یہ صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے ۔ بقول عرشؔ:

ہر ایک شخص تعصب کا ہے شکار اے عرشؔ
ہر شخص کو درکار ہے اصل نا م میرا (۱۱)

جموں سے ایک دور دراز علاقہ ڈوڈہ سے میر امتیاز حسین جو پیشے سے ایک ایڈووکیٹ تھے لیکن ادب سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے ۔عرشؔ کے کلام کے متعلق ان کی یہ رائے ملاحظہ کیجئے جو ان کے شعری مجموعہ ’’نایاب‘‘ کے شروع میں دیباچہ کے طور پر درج ہے:

ریاست جموں و کشمیر میں جب شعر و ادب خصوصاً اردو شاعری کے حوالے سے سے بات کی جائے تو عرشؔ صہبائی کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے ۔سرزمین جموں نے شہنشاہ ترنم کندن لال سہگل سے لیکر قدرت اللہ شہاب تک نہ جانے کن کن علمی و ادبی شخصیات کو جنم دیا ہے ۔اسی زرخیز مٹی کی پیداوار نامور شاعر و ادیب عرشؔ صہبائی بھی ہیں ۔میری طرح عرشؔ صہبائی کے زیادہ تر مداح انہیں یو ۔پی یا دہلی کا شاعر سمجھ کر پڑھتے ہیں ۔عرشؔ صہبائی سے غائبانہ تعارف ایک عرصہ سے تھا تاہم ذاتی تعارف ڈوڈہ میں ہوا جب آپ ایک مشاعرہ کے سلسلے میں یہاں تشریف لائے ۔اس ملاقات میں یہ پتہ چلا کہ عرشؔ صاحب جن کو میں بڑی دیر سے پڑھ رہا ہوں ہندوستان کی کسی دوسری ریاست سے نہیں بلکہ جموں کے رہنے والے ہیں ۔ ڈوڈہ میں موصوف نے مجھے میزبانی کا شرف دیکر گویا ذرے کو آفتاب کر دیا ۔عرشؔ صہبائی کی پہچان بطور اردو شاعر دیر سے ہو چکی ہے ۔اور ان کے ساتھ شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں ۔عرشؔ صہبائی نے سماج میں چھپی ہوئی تلخیوں ،سختیوں اور بے راہ روی کو زبان دے کر ایک لازوال پیغام دیا ہے ۔ان کی شاعری بامعنی اور فکر انگیز ہے ۔فنی اسلوب کی گرفت کے ساتھ ساتھ عرشؔ صاحب کی شاعری کا اچھوتا پہلو یہ ہے کہ انتہائی آسان اور سلیس زبان کا استعمال کیا گیا ہے جس سے ان کی شاعری عام اور مجھ جیسے نیم خواندہ قاری کے دل میں بھی اتر جاتی ہے ۔ جناب عرشؔ صہبائی نے اردو غزل کو نئی وسعتوں

سے ہمکنار کر کے اردو شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔عرشؔ ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے روایت سے ہٹ کر اردو غزل کو نئے اسلوب دیئے اور بقول شرؔر فتحپوری عرشؔ صہبائی اپنے اسلوب کے واحد تخلیق کار ہیں۔حالات پر گہری نظر رکھتے ہوئے انسانی کرب اور بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے آپ ایک ایسے ترقی پسند شاعر ہیں جن کی بے با کی دل کو چھو جاتی ہے۔(۱۲)

یہ سلسلہ یہی ختم نہیں ہوتا بلکہ اور بھی کئی بہت اہم آرائیں ان کے کلام کے متعلق مختلف رسائل و جراید میں درج ہیں جو ان کے اعلیٰ معیاری کلام کے شاہد ہیں۔ان کے قدر دانوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ شرؔر فتح پوری عرشؔ کی غزل گوئی کے متعلق کہتے ہیں:''اس دور میں آپ اردو غزل کی آبرو ہیں اور اپنے اسلوب کے واحد تخلیق کار''(۱۳)عرشؔ کے شعری فکر میں فن اور اس کی نزاکتوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ان کی غزلیہ شاعری میں غضب کا وحدت تاثر پایا جاتا ہے۔ایم۔صادق بٹ (مرحوم) ریٹائرڈ ڈسٹرک اینڈ سیشن جج کے تاثرات بھی قابل توجہ ہیں۔وہ پیشے سے جج تھے لیکن ادب کے مطالعہ کا بہت شوق رکھتے تھے۔عرشؔ کے کلام سے متاثر ہو کر وہ فرماتے ہیں کہ''عرشؔ صہبائی کی شاعری کی حدیں محدود نہیں ہیں اور ان کی شاعری برصغیر کے غزل گو شعرا کے لئے ایک چراغ راہ ہے۔ان کی شاعری کے اندر ایک ایسا کرتب چھپا ہوا ہے۔جسے صرف اہل نظر اور اہل قلم ہی پہچان سکتے ہیں۔انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا۔اور محسوس کیا ہے۔''(۱۴)

مذکورہ بالا آراؤں سے ایک بات تو وضع ہو جاتی ہے کہ عرشؔ صہبائی کا نام اردو شاعری کے ان شاعروں کی فہرست میں سے ایک نام ہے جو عالمی سطح پر اپنے کلام کی وجہ سے مشہور ہے۔انہوں نے متحدہ ہندوستان میں آنکھ کھولی، بے لوث محبت اور ہندو مسلم مشترکہ بھائی چارے ہیں پرورش پائی، برصغیر کے ادبی ماحول میں اپنا شعری سفر کا آغاز کیا، ملک کی تقسیم کا دردناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ خود اس کا حصہ بنے، ادب کی بساط الٹتے دیکھی، ادب اور ادیبوں کا بٹوارہ ہوتے دیکھا، تفکر، تدبر اور تخلیق ادب پر انحطاط، تعطل اور جمود کا کہرا چھائے ہوئے دیکھا، سماجی اور سیاسی پروپوگنڈے دیکھے اور پھر وہ وقت بھی کہ جب آزادی کی سحر کا افتاب طلوع ہوا، تعمیر و ترقی کا بھی ہوا، ہر سمت قدروں اور پیمانوں کے معیار بدل گئے اور ملک کی آزاد فضا میں ہر قوم ترقی کی راہ میں رواں دواں ہو گئی لیکن عوام کے آپسی بھائی چارے و رشتوں میں وہ تکدر اذہان پیدا ہو گیا کہ عرشؔ صاحب کو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی ایک غزل میں یوں کہنا پڑا:

دل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اترے ہوتے
تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح (۱۵)

غزل اردو ادب کی جتنی مقبول اور پسندیدہ ہے اتنی ہی زیادہ بدنام بھی ہے۔زمانہ قدیم سے لیکر آج تک اس پر بے انتہا اعتراضات ہو چکے ہیں۔یہ حقیقت بھی ہے کہ ہمارے پاس غزلیں بہت زیادہ لکھی گئی ہیں لیکن نئی اور ستھری غزلیں بہت ہی کم لکھی گئی ہیں بلکہ کہی ہوئی باتوں کو زیادہ تر دہرایا گیا ہے۔عرشؔ صہبائی کی غزلوں کے مطالعے کے بعد ایسا ہر گز محسوس نہیں ہوتا بلکہ ان کی زندگی اور شخصیت کا اثر ان کے کلام میں شامل دیکھائی دیتا ہے۔ان کا یہ شعر اس کی میری بات کی تصدیق کا جواز ہے:

میرے کلام میں ہے جزب زندگی میری
ہے میری زندگی کا آئینہ کلام میرا(۱۶)

عرشؔ صہبائی کی غزلوں میں ایک خاص خوبی چھوٹی بحروں کا انتخاب کیا ہے۔ان کی غزل چھوٹی بحر اور روزمرہ کے الفاظ پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی وہ تاثر چھوڑتی ہے اور وہ بات کہہ جاتی ہے جو ان کے ساتھ کے دوسرے شاعروں کے بس کی بات نہیں معلوم ہوتی۔یہی ان کی انفرادیت کا امتیاز بھی ہے۔اس کے علاوہ ان کی زندگی کے مسلسل آلام اور دکھوں اور کلفتوں نے ان کے کلام میں اور خصوصاً ان کی غزلوں میں ایک ایسا تاثر پیدا کردیا ہے جو دوسروں شاعروں کے پاس مفقود ہے۔عرشؔ صہبائی نے اپنی شاعری میں بالخصوص غزلیہ شاعری مختلف موضوعات کو سمیٹا ہے۔زندگی سے تعلق رکھنے والا کوئی ایسا موضوع نہیں جو ان کی نظر سے نہ گزرا ہو بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ ان کی شاعری میں زندگی بنیادی موضوع کی حیثیت رکھتی ہے۔ان کے یہاں بے شمار ایسی غزلیں ہیں جن کا بنیادی موضوع زندگی ہے جن میں زندگی کے مختلف نکات مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔یہ موضوع روایت کا حصہ ہے لیکن جتنا اس پر عرشؔ نے لکھا ہے اردو شاعری میں کوئی دوسرا شاعر ایسا نہیں گزرا جس نے اتنا کلام صرف اس ایک موضوع پر کہا ہو۔یہ اگر روایتی ہے تو ان کی انفرادیت کا ایک اہم جز بھی یہی ہے۔انھوں نے سماج و معاشرے میں پیش آنے والی مشکلات و حادثات کو بڑی بے باکی اور صاف گوئی سے پیش کیا ہے۔ظلم،زیادتی،سیاست،رشوت،غربت،خوں ریزی،گھریلو تشدد،غرض ہر طرح کے موضوعات کو ایک خاص علامتی انداز میں انھوں نے اپنی شاعری میں نئے رنگ سے برتا ہے۔عرشؔ کے یہاں ماضی و حال کے انسان کی مشکلات و مجبوریوں کا تذکرہ بھی ہے اور کچھ پرانے دور میں پیش آنے والے اہم واقعات و حادثات کے اشارے بھی۔وہ معاصر ماحول و سماج کی تلخیوں کا بیان بھی بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں اور بعض

اخلاقی وفلسفیانہ باتوں کا تذکرہ بھی ان کے یہاں بہتر انداز میں ملتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کریں:

تمام زندگی کٹتی ہے اس کی گردش میں
تمام زندگی انسان بکھرتا رہتا ہے(۱۷)

تنگ آ گر موت کو آواز دینا کچھ نہیں
موت میں پیدا کوئی جینے کی صورت کیجئے(۱۸)

میری یادیں ہیں کتنے ہی دلوں میں
کہوں کیوں کہ میرا گھر نہیں ہے(۱۹)

آدمی آفات ہستی سے اگر چاہے نجات
مشکلوں کا خیر مقدم ہر قدم کرتا رہے(۲۰)

آدمی کو کرنا پڑتا ہے سر تسلیم خم
دب سکتی نہیں وقت کی جو آواز ہوتی ہے(۲۱)

زندگی کی رہگذر میں حادثوں کے باوجود
آپ میرے ساتھ ہیں تو کیا پریشانی مجھے(۲۲)

یہ زندگی کا مدھوبن ہے اس کو کیا کہیے
کہیں ہیں یاس کے کانٹے کہیں ہیں آس کے پھول(۲۳)

زندگی نام ہے محبت کا
اب مگر کون اس کا قائل ہے(۲۴)
پھر اس کے بعد مل نہ سکا کوئی ہم سفر
یہ زندگی کی راہ میں کیسا پڑاؤ تھا(۲۵)

زندگی ایک مرقع ہے غم و راحت کا
خار و گل دونوں سے تزئین چمن ہوتی ہے(۲۶)

جو زندگی ہے تو غم بھی ہیں ساتھ ساتھ اس کے
کوئی ندی نہیں جس میں بھنور نہیں ہوتے (۲۷)

ڈھونڈتے ہی رہ گئے ہم راحتوں کے سلسلے
زندگی میں ہر قدم پر غم کی زنجیریں ملیں (۲۸)

زندگی اور معاملات زندگی کو سمجھنے سمجھانے کی روایت زمانہ قدیم سے ہی چلی آرہی ہے۔اردو کے اکثر و بیشتر شعراء نے یہاں ایک طرف عشقیہ واردات و کیفیات کی ترجمانی میں کی ہے وہی دوسری جانب مسائل زندگی کو فلسفیانہ زاویہ نگاہ سے دیکھا، پرکھا اور اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے۔ ہر دور کے شاعروں میں ایسے مسائل حیات کی ترجمانی ملتی ہے لیکن ان کا انداز بیان ولب ولہجہ انہیں انفرادی حیثیت عطا کرتا ہے۔ان کے چند اشعار ملاحظہ کریں جن میں ان کے انفرادی لب ولہجے کا عکس دیکھا جاسکتا ہے:

میں نے تمام عمر گزاری ہے اس کے ساتھ
اس زندگی سے بڑھ کر کوئی خوب رو نہیں (۲۹)

اسی بات کو عرشؔ ایک اور انداز میں یوں کہتے ہیں:

زندگی کا یہ بھی اک انداز ہے
رات دن سڑکوں پہ پتھر توڑنا (۳۰)

عرشؔ نے اپنے احساسات کی سادگی سے غزل میں ندرت اور دلکشی پیا کی ہے۔وہ غزل میں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے جن الفاظ،تشبیہات واستعارات کا استعمال کرتے ہیں وہ اپنے اندر ایک منفرد خصوصیت رکھتے ہیں۔عرشؔ نے زندگی کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا اور تجربات حاصل کئے اور تجربات کی جو دولت عرشؔ کے ہاتھ لگی اسے انہوں نے بہت ایمانداری اور سلیقہ سے اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ان کا انداز واسلوب ان کی اپنی ایجاد ہے:

جو اک جنبش لب سے بیان ہو جائے
فسانہ زندگی کا اتنا مختصر بھی نہیں
حادثوں کی ہے کھردری چادر
زندگی ریشمی غلاف نہیں (۳۱)

زندگی کو اگر سمجھنا ہے
جھونپڑوں میں اسے بسر کرنا
سب سے اچھا ہے مرا ہندوستان
سانس لینا ہی اگر ہے زندگی
چاندنی ہے تو کبھی ہے تیز دھوپ
صورت شمس و قمر ہے زندگی(۳۲)

عرشؔ صہبائی اپنی زندگی میں مسلسل پریشانیوں کا شکار رہے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ زندگی کے لئے ایک تعمیری نظریے کے قائل تھے۔ان کے یہاں کئی غزلیں اس کے جواز کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں لیکن یہاں ان کے شعری مجموعہ ''شبنم تیری یادوں کی'' میں شامل ان کی 152 ؍شعار پر مشتمل ایک غزل کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں۔ یہ غزل ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف مثبت و منفی رویوں پر مبنی ہے۔اس ایک غزل کے مطالعہ سے اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ زندگی میں دل شکن مرحلوں سے گزرے ضرور ہونگے لیکن زبان سے شکایت کبھی نہیں کی ہوگی۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

حادثوں کی رہگزر ہے زندگی
جب سے میری ہم سفر ہے زندگی
جس میں اخلاص و وفا محدوم ہیں
یہ رواں کس راہ پر ہے زندگی
چند سانسوں پر ہے اس کا انحصار
ہر گھڑی اک داؤ پر ہے زندگی
کیا کروں اس میں سکونت اختیار
سو عذابوں کا نگر ہے زندگی
اس کو اک پل بھی سکوں حاصل نہیں
ہر گھڑی محو سفر ہے زندگی
دنیا کی ہر چیز اس پر منحصر ہے
اک سراپا شور و شر ہے زندگی
ڈوب کر اس سے ابھرنا ہے محال
حادثوں کا وہ بھنور ہے زندگی
سب ادائیں اس کی ہنگامہ خیز ہیں
کیسے کہہ دوں بے ضر ہے زندگی
سانس رکنے پر ہے سارا کھیل منحصر
اک حدیث مختصر ہے زندگی
کر گزرتی ہے جو اس کے دل میں ہو
کس قدر آشفتہ سر ہے زندگی
دیر و کعبہ میں پریشان ہے عبث
میکدے میں آ ادھر ہے زندگی
یہ مجھے پہچان ہی پائی نہیں
عرشؔ کتنی کم نظر ہے زندگی(۳۳)

زندگی اور معاملات زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کی یہ طرز کوئی نئی نہیں بلکہ بہت پرانی ہے بلکہ اردو کے اکثر

وبیشتر شعرا نے یہاں کہیں عشقیہ واردات وکیفیات کی ترجمانی کی ہے وہیں ساتھ ساتھ کسی نہ کسی پیرائے میں مسائل زندگی کو بھی غزل کا موضوع بنایا ہے۔بیسویں صدی کے غزل گو شعراء پر بھی اس دور کی ترقی پسند تحریک اور معاشرے میں اٹھتی ہوئی آزادی کی لہر کی خوبصورت تصویر ملتی ہے۔عرشؔ صہبائی کا زمانہ بھی بیسویں صدے کے درمیان میں شروع ہوتا ہے جب ہمارا ملک آزادی کی بہت بڑی قیمت چکا کر آزاد تو ہو چکا تھا لیکن دو حصوں میں تقسیم ہو کر۔ایک ملک کو ہندوستان اور دوسرے کو پاکستان کا نام ملا۔اس سلسلے میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے،ہجرتا کا جو عمل چلا اور جو قیامت برپا ہوئی اس میں تمام قدریں اور سچائیاں بے معنی ہو کر رہ گئیں۔انسانیت لہولہان ہوئی۔عرشؔ صہبائی نے سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس درد کو دل میں محسوس کیا۔اس زمانے میں ان کی فکر میں تبدیلی آئی جس کے اثرات ان کی شاعری پر نمایاں ہیں۔

عرشؔ صہبائی کی زندگی اور شاعری میں جو ہم آہنگی ہے محوالہ ان کی غزل کے اشعار میں اس کا عکس واضع طور نظر آتا ہے۔انہوں نے پریشانیوں،مصیبتوں اور غم والم کو اپنی زندگی کے نشیب وفراز تعبیر کرتے ہوئے خود کو خوصلہ دیا ہے۔کہیں وہ زندگی کو خوشی وشادمانی کا سبب بتاتے ہیں کہیں اسی کو غم والم کا کارخانہ تصور کرتے ہیں۔ اردو غزل کی روایت میں کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا جس نے ان سے زیادہ زندگی کے اوصاف بیان کئے ہوں۔ان پر تحقیقی کام کرنے والوں میں بے شمار لوگوں ہیں جن کا اس بات پر کامل اتفاق ہے کہ وہ زندگی کے شاعر ہیں۔زندگی میں اگر ناکامیوں کا سامنا ہو تو اسے عرشؔ منزل مقصود کے حصول کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔سخت کوشی،مشقت اور جفاکشی کا وہ احترام کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے ان کی نگاہ میں مزدور،مظلوم،محنت کش، مفلس اور جفاکش لوگوں کا بہت احترام ہے۔عرشؔ کا خود بھی بچپن سے جوانی تک کئی طرح کی مصیبتوں سے سامنا ہوا ہے۔ان تمام پریشانیوں اور مصیبتوں نے ان زندگی کے ہر نشیب وفراز سے واقف کرایا۔یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کا اظہار پایا جاتا ہے۔جہاں ایک طرف غم کی کیفیات کی عکاسی ہے وہیں دوسری طرف انبساط ومسرت کی تصویریں بھی موجود ہیں۔جہاں ایک طرف خوشی وشادمانی کے قائل نظر آتے ہیں وہیں احساس درد بھی ان کے کلام میں موجود ہے۔اور یہ سب بے سبب نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک زندگی مختلف کیفیات،احساسات اور رنگوں کا مرکب ہے۔عرشؔ کے یہاں کئی مکمل غزلیں اسی ایک مضمون پر مبنی ہیں۔ان میں سے چند اشعار پیش ہیں:

یہ کبھی تسکین کا باعث کبھی آزار بھی ہے زندگی دیوار بھی ہے سایہ دیوار بھی

منحصر ہے دل کی کیفیت پہ یہ احساس عرشؔ　　زندگی اک غمکدہ بھی ہے تبسم زار بھی(۳۴)

وہ بشر زندگی میں خوگر آزار نہیں　　جو مصائب سے کبھی برسرِ پیکار نہیں
آج کے دور کی اس زندگی کو کیا کہیے　　ایسا افسانہ کہ جس کا کوئی کردار نہیں
ہر گھڑی مشکلوں سے سینہ سپر رہتا ہوں　　مختصر زندگی میں کون سا آزار نہیں
عرشؔ ہر حال میں جینا ہے مجھے دنیا میں　　کوئی بھی راہ ہو میرے لئے دشوار نہیں(۳۵)

ہم اپنی زندگی میں جس کا ذکر کر سکتے
کوئی بھی واقعہ اس قدر خوشگوار نہ تھا(۳۶)

رموز زندگی ظاہر ہیں ان پر
وہ سڑکوں پر جو پتھر توڑتے ہیں(۳۷)

زندگی کو اگر سمجھنا ہے
جھونپڑوں میں اسے بسر کرنا(۳۸)

جو بھی لمحہ ہے تپتی ہوئی ریت ہے
زندگی کربلہ کے سوا کچھ نہیں(۳۹)

جب ہو اس کی نظر سے ہم آغوش
زندگی مثل جام ہو جائے(۴۰)

مندرجہ بالا اشعار کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر زندگی کی بہت سی تلخ سچائیوں سے روشناس ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زندگی میں پیش آنے والی مصیبتوں، پریشانیوں اور بے رحم سچائیوں نے شاعر کے دل کو کتنی چوٹ پہنچائی ہے۔عرشؔ کی شاعری کو اگر مثبت رویوں اور رجائی عناصر کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان کے یہاں زندگی کے ہر پڑھاؤ پر رجاوآس کا عنصر بھاری نظر آتا ہے۔رجائی کیفیت کے اشعار ان کے یہاں کثرت سے پائے جانے کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔اول تو یہ کہ انہوں نے زندگی بھر جن نامساعد حالات کا مقابلہ کیا ہے وہ اسی رجائی کیفیت کا مرہون منت ہے۔دوم یہ کہ انسان جب حد سے زیادہ کسی چیز سے مایوس ہوتا ہے تو وہ ایک نوعیت کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے جینے میں وہ مزہ نہیں رہتا اور

انسان جینے کے بہانے تلاش کرتا ہے اس طرح وہ احساس برتری یا رجائی مزاج کے لفظوں سے اپنے قلب و شعور کو مطمئن کرنے کی سعی کرتا ہے۔ بہر حال سبب جو بھی ہو عرشؔ صہبائی کے یہاں یقین محکم، بلند حوصلہ، سخت کوشی، جگر کاوی اور جہد مسلسل کے عناصر خاصے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ عرشؔ صہبائی کی شاعری میں زندگی جینے کا ایک بہترین روایہ ملتا ہے۔ ان کا امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کو اس حسیت سے روشناس کروایا جو ان سے پہلے جدید شعری ادب میں ناپید تھی۔ اردو دنیا کی شعری کائنات نے اسلوب اور لہجے کی ندرت اور جدت نے انہیں ایک ممتاز اور نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ علوم و نظریات و افکار و موضوعات کی طے شدہ بندشیں عرشؔ کے شعر کا مسلہ نہیں بنتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں جذبوں کے رنگ خالص ہیں اور ان کا شعری اظہار معصوم اور سادہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بھول پائیں گے نہ ہرگز یہ میرا حسن سلوک
رنج و غم کے ساتھ اپنوں کی طرح رہتا ہوں (۴۱)

عرشؔ انسان کی کیا کروں تفسیر
جسم زندہ ضمیر مردہ ہے (۴۲)

کتنی کیفیتیں ہیں جن کی یہ غماز بھی ہے
زندگی درد بھی ہے سوز بھی ہے ساز بھی ہے (۴۳)

آباد ہمیں ہونا ہے اک روز یہیں عرشؔ
تسلیم ابھی شمس و قمر سے ہیں بہت دور (۴۴)

نگاہ وقت کا ہوتا نہیں ایک انداز　　نگاہ وقت کے تیور بدلتے رہتے ہیں
سبب جو بنتے ہیں دنیا میں انقلاب کا عرشؔ　　وہ لوگ زندگی بھر جھونپڑوں میں رہتے ہیں (۴۵)

یہ دیکھا ہے انہیں جب عرشؔ سجدہ ہو ادا کرنا
کسی کی یاد میں کرتی ہیں اشکوں سے وضو آنکھیں (۴۶)

کس قدر دلچسپ ہیں یہ رنگ و بو کے سلسلے
آرزو کے بعد خون آرزو کے سلسلے (۴۷)

ہزاروں سال دہراتی ہے دنیا جس کے افسانے
وہ خود انسان نہیں انسان کا کردار ہوتا ہے(۴۸)

عرشؔ کی زندگی میں مصائب و آلام کی بڑی اہمیت تھی وہ اسے خوشی سے زیادہ قرار کا باعث سمجھتے تھے۔ان کے مطابق جس زندگی میں مصائب وآلام نہیں وہ زندگی بے معنی ہے۔یہ بھی ان کا ذاتی تجربہ تھا کہ جب کبھی ان پر مصائب پڑے ان کے حوصلوں اور جذبوں کو نئی سمیت ملی اس لئے انہیں یقین کامل تھا کہ مصائب وآلام بے وجہ نہیں ہوتے بلکہ یہ انسان کے حوصلوں کو بلند کرتے ہوئے جینے کی نئی تحریک عطا کرتے ہیں۔مصائب وآلام کی طرح مسرت وشادمانی کی اپنی انسانی زندگی میں اپنی الگ اہمیت ہے۔عرشؔ کے نزدیک خوشی ہوا کے ان جھونکوں کی مانند ہے جو پل بھر میں چھو کر گزر جاتے ہیں جبکہ مصائب وآلام انسان کے ساتھ اس کا سایہ بن کر رہتے ہیں اسی لئے عرشؔ ان کا بڑی خوشی سے استقبال کرتے تھے۔انہیں مسرت وخوشی سے زیادہ حادثات،مصیبتوں اور غموں کے زیر سایہ رہنے میں زیادہ لذت محسوس ہوتی تھی۔انہیں مصائب و آلام سے کوئی شکائت نہیں تھی بلکہ وہ کہتے ہیں:

رشتہ جو مصائب سے ہے توڑا نہیں جاتا
اس ناؤ کو منجدار میں چھوڑا نہیں جاتا
جینے کی خاطر غم و آلام لازم ہوتے ہیں
یہ کشتی طوفان کے سہارے چلتی ہے
غم کو اے ناداں حقارت سے نہ دیکھ
راس آجائے تو یہ اکسیر ہے(۴۹)

عرشؔ کی غزل تراشے ہوئے پہلو دار ہیرے کی مانند ہے جسکے ہر پہلو سے روشنی پھوٹتی ہے۔انہوں نے غزل کے دائرے میں جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ان کے یہاں جدید شعری اسالیب کو برتنے کا خوبصورت سلیقہ ہے۔ان کی غزلیں زبان و بیان،اسلوب و ہیئت اور ان کی جمالیات اور تخلیقی معنویت کی آئینہ دار ہیں۔ان کی شاعری نئی حسیت،عصری تقاضوں اور الفاظ کے نئے تلازموں سے اس قدر ہم آہنگ ہے کیوں کہ ہر مکتبہ فکر کے قارئین،ہر نظریہ فکر کے ناقدین اور معاصرین نے اس کی تحسین اور اس کا اعتراف کیا ہے۔عرشؔ کا فن شعر پر عبور،انداز تحریر،لفظوں کا انتخاب،تشبیہوں واستعاروں کے استعمال کا سلیقہ اتنا مکمل اور جامع ہے جو دوسرے شعراء کی دسترس سے باہر ہے۔عرشؔ نے جس دور میں غزل گوئی کا آغاز کیا اس دور میں

اکثر غزل گوشعراء کے یہاں غزل میں رسمی مضامین کی بھرمار دیکھنے کو ملتی تھی۔ یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ عرشؔ کی شاعری رسمی مضامین سے شروع سے ہی پاک تھی لیکن کہیں کہیں تلاش کے بعد ان کے یہاں بھی رسمی مضامین مل ہی جاتے ہیں لیکن جہاں ان کی غزلوں میں جذبات کی تازگی محسوس ہوتی ہے وہیں ان کے اظہار کا پیرایہ بھی دوسرے غزل گوشعراء سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ یہ بھی ان کا کمال فن ہے بلکہ ان کی انفرادیت کا ایک اہم پہلو ہے کہ انہوں نے رسمی موضوعات و انداز اسلوب میں اچھے جدید طرز کے اشعار نکالنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آئے ہیں۔ مثلاً عرشؔ کے یہ اشعار دیکھیں:

صرف پھولوں کے لمس کی خاطر
اوس روتی ہے رات بھر کتنی(۵۰)

رہیں محفوظ الزام وفا سے
وہ اس مقصد سے وعدے توڑتے ہیں(۵۱)

یہ بہار جاں فزا یہ چاندنی چھٹکی ہوئی
آج ہر گلزار ہے رشک ارم آجایئے(۵۲)

ڈھونڈتا پھرتا ہے جس کو جاکے بت خانوں میں تو
خدمت مخلوق میں ہے وہ ثواب زندگی(۵۳)

کیا لطف چمن جب رہا نہ اپنا نشیمن
اب کنج قفس میں مجھے آرام بہت ہے(۵۴)

ہر ایک شعر میں اخلاقی درس ہے ایک بہترین نصیحت ہے خواہ وہ شکایت کے پردے میں ہو یا عام تخاطب کے روپ میں، کہیں تسکین دی گئی ہے تو کہیں طنز کی گئی ہے۔ عرشؔ صہبائی کی غزل اپنے لہجے کی انفرادیت کے باعث معاصر غزل میں ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔ خالص فنکارانہ آزادروی ان کے تخلیقی مزاج کو ایک عجیب بے نیازی عطا کرتی ہے اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ باطنی احساسات کے اظہار میں منفرد ہونے کے باوجود وہ اپنے بیرون ذات سے منحرف نہیں ہوتے بلکہ ان کے ہاں اپنے گرد وپیش سے استواری کا ایک قوی رجحان پایا جاتا ہے۔ عرشؔ سب کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی سب سے جدا طرز کے شاعر تھے۔ بقول عرشؔ:

میرا انداز سخن ہی میری پہچان ہے عرشؔ
اس قدر بھیڑ میں بھی ہے میری آواز الگ(۵۵)

عرشؔ کو بحیثیت شاعر جو چیز ممتاز درجہ عطا کرتی ہے وہ ان کی منفرد ہیئت اور مواد ہیں ۔ان کے طرز نگارش میں نغمگی بھی ہے اور پیغام بیداری بھی ۔ڈاکٹر جاوید وششٹ نے اپنے ایک مضمون بہ عنوان ''مغنئ حیات عرشؔ صہبائی اسلوب کے آئینے میں'' میں عرشؔ کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''عرشؔ صہبائی اردو غزل میں اپنا انفرادی رنگ قائم کر چکے ہیں اور دور جدید میں وہ اردو کے منفرد صاحب طرز غزل گو ہیں ۔عرشؔ نے اپنی شعری انفرادی کا سنگ بنیاد ''زندگی'' پر رکھا ہے ۔اس لئے وہ استوار بھی ہے اور زندگی کی طرح جمود سے بے نیاز بھی ،اس میں روانی ہے، تسلسل بھی ہے ۔اصل میں تسلسل ہی زندگی کا ضامن ہے ۔''(۵۶)

عرشؔ کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان کا علم آفاق گیر تھا ۔وہ فلسفہ کے پرانے اور نئے مباحث اور اس کے ظاہر و باطن سے پوری طرح آگاہ تھے ۔انہوں نے زندگی کے تمام مسائل کا بطور شاعر، فلسفی اور بندہ خدا کی حیثیت سے گہرا مطالعہ کیا اور ایک ہی ذات میں تینوں کو یکجا کر دیا ۔عرشؔ صہبائی کی غزلوں میں ہمیں اس زندگی کے نقوش، غیر فانی نقوش نظر آتے ہیں جو کہیں دور آسمانوں میں نہیں بلکہ زمین پر پرورش پاتی ہے اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے ۔زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ عرشؔ کی غزلوں میں تاثرات کے واضح نقوش اور سچے جذبات کی گہری پرچھائیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں اور انہیں چیزوں کی بنا پر عرشؔ کی غزلوں میں انفردی رنگ بھی پایا جاتا ہے ۔ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

عرشؔ ہم تھے حوصلے والے مگر
وہ غم ٹوٹے خدا یاد آگیا(۵۷)

غم کو اے ناداں حقارت سے نہ دیکھ
راس آجائے تو یہ اکسیر ہے(۵۸)

عرشؔ ہم پھر بھی دل و جاں سے ہیں اس پر شیدا
زندگی ریت کی گرتی ہوئی دیوار سہی
پھر بھی کمبخت کے انداز ہیں کتنے پیارے
زندگی درد کا چھبتا ہوا نشتر ہی سہی(۵۹)

عرشؔ نے اپنی معنی آفرینی، نئی ذہنی افق اور احساس وشعور کی نئی جہتوں سے نئی غزل کو روشناس کیا ہے۔ ان کا کلام سادگی ،شوخی اور ندرت بیان میں ممتاز ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں اپنے عہد کے ماحول اور کردار کو پیش کرنے کی کامیاب نظر آتے ہیں۔اپنے عہد کی صحیح عکاسی اور سچی تصویر پیش کرنا یقیناً ایک سچے اور کامیاب شاعر کا لایق تحسین کانامہ تصور کیا جا سکتا ہے۔موجود دور میں انسانی زندگی کے رویش کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

پہنے ہوئے ہے زندگی خوشنما لباس	کب تار تار ہو یہ دمکتا ہوا لباس
انسان نے اوڑھ رکھا ہے اک خوف کا لباس	خود اپنے سائے سے ہیں اسے اتنی وحشتیں
شہر ہوس میں دھجیاں بن کر اڑا لباس	چاہت نہ رہ سکی کسی مریم کی آبرو
انسان روز چاہتا ہے اک نیا لباس(۶۰)	انسان روز بیچتا ہے عظمت ضمیر

مزید انسان کے قول وقرار کی وضاحت کا اندازہ اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے۔

ہر بات کے ہر لمحہ بدل جاتے ہیں معنی
دنیا میں کسی بات کا معیار نہیں ہے(۶۱)

شہر زندگی کی بد اعتمادی کی فضا یہاں نمایاں ہے جس نے اپنے بسنے والوں کو مختلف سطحوں پر ایک خوف و ہراس میں مبتلا کر رکھا ہے کوئی صوت فقیر سے خائف ہے تو کسی کو اپنے غم خوار پر بھی اعتبار نہیں دراصل زندگی کو موجودہ عہد میں منفی رویوں سے اتنا گزند پہنچا ہے کہ اب بے ضرآوازوں اور غم خوار دستکوں سے بھی دل خوفزدہ ہے اسی لئے یہاں احساس تنہائی شدت اختیار کر گیا ہے اور انسان اپنے گردو پیش بسے اس بے خوف وصدا شہر کو ایک دست ویراں سے تعبیر کرتا ہے۔ایک ایسا شخص جو تقسیم سے لے کر عصر حاضر تک ہر قسم کے فسادات کا شاہد رہا ہو اسے زندگی نے کتنے مسائل دئے ہونگے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔شاید یہی سب ہے کہ عرشؔ کی شاعری میں زندگی کے تلخ اور خوشگوار مناظر ایک ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان کے اسلوب بیان میں انفرادیت نمایاں ہے۔ان کا تخلیقی مزاج عصری شعور اور اپنے تہذیب وثقافت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ان کے یہاں زمانے کی تیز رفتاری اور زندگی کی مصروفیت ،تنہائی کا کرب ،غم حیات وکائنات کے پس منظر میں بے بہا اشعار ملتے ہیں۔ان کے یہاں بعض کئی ایسی مسلسل غزلیں موجود ہیں جو انسانی زندگی کا منظر نامہ پیش کرتیں ہیں۔اہل ذوق وعلم دوست قاری وسامع کو یہ جان کر حیرت ہوگی کے عرشؔ نے اپنی عمر کی بالکل آخری ایام میں

اردوادب کی خدمت میں ایک ایسا عطیہ پیش کیا جوان کے نام کواردوادب کی تاریخ میں بلندی کو پہنچانے والا ہے اور یہ عطیہ 352 ؍اشعار کی غزل ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے اتنی طویل غزل اب تک نئی پود کے کسی بھی اردو شاعر کے یہاں موجود نہ ہوگی۔ اس طرح نئی اردو غزل میں سب سے طویل غزل لکھنے کا سہرہ عرشؔ صہبائی کے نام منسوب ہو جاتا ہے۔ یہ مکمل غزل ان کے 2021ء میں شائع ہونے والے مجموعے ''اعجازغزل'' میں شامل ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:

کہیں رکتی نہیں پیہم رواں ہے — مرے ہونٹوں پہ کس کی داستاں ہے
نہیں ہے راستوں سے جو بھی واقف — تعجب ہے وہ میر کارواں ہے
نہیں شعر و ادب سے جس کو نسبت — وہی شعر و ادب کا پاسباں ہے
وہ آنکھیں جس طرح پھولوں کی وادی — وہ لب ہیں جیسے صحن گلستاں ہے
محبت تو ہے اک انمول ہیرا — محبت کی کوئی قیمت کہاں ہے
گلستاں کی بربادی ہے یقیناً — کہ اس کی تاک میں خود باغباں ہے
نہیں ایسا کوئی جو یہ بتائے — عرشؔ کے کلام میں خامی کہاں ہے
جناب عرشؔ کی پہچان ہے یہ — کہ دائیں گال پر تل کا نشاں ہے(۶۲)

مندرجہ بالا اشعار بلکہ پوری 351 ؍اشعار کی غزل تغزل کا ایسا منظر نامہ پیش کرتی ہے کہ جس میں حسن و بیان کی دلاویزی، احساس وادراک کی وسعت ورعنائی، واردات قلب کی پاکیزگی، حقیقت بیان، غم دوراں اور غم جاناں سب کچھ موجود ہے۔ یہاں پوری غزل پیش کر پانا ممکن نہیں لیکن اگر ہم عرشؔ کی اس مکمل غزل کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ عرشؔ نے ہر دور کے اکثر و بیشتر موضوعات کو اس میں جذب کر لیا ہے۔ انہوں نے اس میں زندگی کے وسیع معنوں کو اپنے پیرائے بیان میں پیش کیے ہیں۔ ہندوستان کی تہذیب وتمدن کی جھلک یہاں کے عقائد، رسم ورواج، راگ راگنیاں، میلے ٹھیلے، سیاسی پیچ وخم، مذہبی عقائد و رسومات اور زندگی کے چھوٹے بڑے تمام مسائل کو اپنی غزل میں پیش کیا ہے۔ عرشؔ نے روایتی رنگ تغزل کو قائم رکھتے ہوئے ذاتی رنگ وآہنگ اور عصری آگہی سے اپنی شعری فضا کو معطر کیا ہے۔ وہ اپنے لہجے کی انفرادیت اور اسلوب کی ندرت کے سبب غزل کی نئی شعری فضا میں ایک خاص شناخت کے حامل تھے۔ انہوں نے موجودہ زندگی اس کے حوصلہ شکن اور مایوس کن ماحول میں بھی انہوں نے زندگی جینے کے عزم و حوصلے کی بات کی ہے۔ جہاں پر انسان

اقدار کے زوال، انتشار، مایوسی، گھٹن اور لاسمتیت کا اسیر نظر آتا ہے۔اس حقیقت سے انکار بھی مشکل ہے کہ انسانی زندگی کے لئے یقین محکم، عمل پیہم، عزم وحوصلہ اور قوت بازو پر بھروسہ ہی انسانی خودی کے تحفظ کا ضامن ہوسکتا ہے۔ بقول عرشؔ:

غم میں بھی زندگی کے ترانے ہیں دوستو
جینا اگر ہو لاکھ بہانے ہیں دوستو(۶۳)

مشکلیں تھیں دل شکن کتنی مگر
ہم بھی جینے پر کمر بستہ رہے(۶۴)

انہیں یہ کون سمجھائے عمل سے زندگانی ہے
جہاں والے عبث ہر آستانے پہ سر پٹکتے ہیں(۶۵)

ان کے بغیر کچھ نہیں انسان کی زندگی
رکھتے ہیں اس کو زندہ جو اس کے اصول ہیں(۶۶)

عرشؔ صہبائی نے اپنی غزلوں میں جس بلند حوصلے اور عزم کا ذکر کیا ہے اس کا انداز جداگانہ ہے ان کا طرز بیان اور لب ولہجہ پر اثر اور دلکش ہے۔ان کی شاعری کا شگفتہ، سادہ اور سلیس انداز بیان، ان کی فکری کاوش، ذہنی ریاضت کا نتیجہ ہے۔ان کی غزلوں میں تشبیہات و استعارات کو نہایت سلیقہ سے برتا گیا ہے۔انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار میں سادگی اور سلاست سے کام لیا ہے۔ان کی شاعری میں فطری اور الہامی طرز ادا پوشیدہ ہے۔اکثر اشعار میں سوز دروں اور غم والم کی سچی تصویر نظر آتی ہے۔حادثات ان کی زندگی میں ایک اہم رکن کی حیثیت رکھتے تھے اور عرشؔ ان کا احترام کرتے تھے۔وہ اپنے ماحول و معاشرے میں جن حالات ومشکلات سے گزرے ہیں ان کی سچی تصویر ان کی شاعری میں ملتی ہے:

وقت بے وقت بھی یہ پوچھتے رہتے ہیں مزاج
حادثے زندگی کے بہترین ہمسائے ہیں(۶۷)

زندگی کیا یہ پوچھے کوئی ہم سے اے عرشؔ
تیر کر ہم آئے ہیں آگ کے دریا کتنے

ہم زندگی کی ناؤ کو کھیتے تو کس طرح
دریائے حادثات کا الٹا بہاؤ تھا(۶۸)

زندگی حادثوں کی ہے تقریب وقت نامہ نگار ہوتا ہے (۶۹)

وہ اور ہونگے حادثوں سے حوف ہے جنہیں
ہم لوگ حادثوں سے نکھرتے ہیں اور بھی(۷۰)

زندگی میں ہر قدم پر تھا حوادث کا ہجوم
یہ تمنا تھی کبھی ہم خود کو تنہا دیکھتے(۷۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ جوشاعری انسانی زندگی سے قوت حاصل کرتی ہے وہی اصل میں کمال عروج کو پہنچتی ہے۔عرشؔ کی غزل نے انسانی زندگی کی صداقتوں کواپنے دامن جگہ دی اور اپنی منفرد لب لہجے کی بنا پر اسے اعلیٰ انجام کو پہنچایا۔زندگی کو زندگی کی طرح گزارنا کوئی آسان کام نہیں یہاں قدم قدم پر انسان کو عدم تحفظ،تنہائی اورموت کے کئی راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔آج ہر انسان ایک دوسرے کے لئے خوف وخطرے کی علامت بن گیا ہے۔ہمدردی خلوص اورصلہ رحمی کے جذبات مفقود ہوگئے ہیں باہر کی دنیا سے ہمارا رشتہ خوف وخطر کے احساسات قائم نہیں ہونے دیتے اوراپنے باطن کی جانب سفر اپنی ذات کی کمیوں اور وسوسوں کے باعث ممکن نہیں رہا یہ ایک ایسی پیچیدہ صورت حال ہے یہاں کچھ واضع نہیں ہوتا۔اسی طرح اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عرشؔ صہبائی کی شاعری میں ابھرنے والی ظلم و بربریت اورقتل وغارت گری کی تمثالیں ہمارا ذہنی رشتہ،مظلومیت بے کسی،بے چارگی اورتنہائی کی اس اساطیر سے جوڑ دیتی ہیں جہاں اپنے اپنے عہد کے انسان اپنی ’’بہتری‘‘اور’’انفرادیت‘‘کے بموجب زمانے کےظلم وستم سہنے پر مجبور ہیں۔بے شک یہ ذہنی رشتہ کائنات اوراس پر مسلط منفی قوتوں سے دشمنی کا رشتہ ہے۔پھر بھی بڑی معنویت کا حامل ہے کہ موت وزیاں کے ساتھ زندگی کا جاں بخش احساس بھی پیدا کرتا ہےاورانسان کی حس مدافعت کوفعال کرتا ہے۔اتنی حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے عرشؔ بھی اس کا احساس رکھتے ہیں:

نہ ہو مایوس اتنا دیکھ کر پر پیچ راہوں کو
انہیں پر پیچ راہوں میں نہاں ہے تیری منزل بھی(۷۲)

عرشؔ صہبائی کے کلام میں بالخصوص غزلوں میں اشعار کا انتخاب کرتے وقت یہ پریشانی آتی ہے کہ کون سا شعر قارئین کی نظر کریں۔اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قدرتی شاعر تھے۔ان کی طبیعت میں آمد ہے۔جتنے سادہ ان کے اشعار ہیں ایسی ہی ان کی زندگی تھی۔یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی زندگی ان کے کلام سے متاثر ہے یا ان کا کلام ان کی زندگی سے۔یہ وصف بھی ان کی انفرادیت کا ضامن ہے۔یہ بھی ان کی خوبی ہے کہ ان کے کلام میں کسی قسم کی بناوٹ نہیں بلکہ شعر پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہم زندگی سے باتیں کر رہے ہیں۔بقول ساحلؔ احمد:

زندگی کے رمزی کنایات اور اشارتی پیکروں کو انہوں نے جس طرح سمجھا اور انہیں شعری تلازمات کا قصہ بنایا وہ صرف ان کی صلاحیت ذہنیہ تھی وگرنہ زندگی ایسے ہزار پہلو رکھتی ہے جن تک رسائی پالینا مشکل امر ہے۔انہوں نے زندگی میں رنج و غم کے چراغ جلتے دیکھے ہیں اور خوشی کے پھول بھی کھلتے دیکھے ہیں۔ایک حساس آدمی کی طرح انہوں نے زندگی اور اس سے متعلقہ رشتوں کے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جو مثبت نتائج پر برآمد ہوئے انہیں دامن الفاظ میں پیوست کرتے ہوئے وہ سماعت کے ان تمام رہ رووں تک پہنچانے کا فرض منیب بھی ادا کر دیا ہے۔کبھی مسافر کو رہ سنگ سے گزرنا پڑتا ہے اور کبھی رہ سبزہ سے بھی۔رہ صادق کا ہر رہ رو زندگی کو اپنا رفیق اور دوست مانتا ہے اور اس کی رفاقت پر یقین کرتا ہے۔زندگی اور موت وہ ازلی حقیقتیں ہیں جو کسی فرد کی مطیع نہیں ہوسکتیں۔زندگی کا حصول بہت آسان نہیں۔اس کے پانے اور قربت نصیب ہونے میں موت کو ہمہ وقت یاد رکھنا لازم ہے۔(۷۳)

ساحلؔ احمد صاحب نے ایک بڑی معنی خیز بات کہی ہے کہ زندگی میں موت کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ایسا نہیں کہ انسان کو یہ بات یاد نہیں ہوتی لیکن وہ اسے فراموش کر دیتا ہے۔اس کے دل میں خیال رہتا ہے کہ وہ دنیا میں مستقل رہے گا یا یہ کہ موت ابھی بہت دور ہے لیکن حقیقت میں یہ بس انسان کی سوچ ہے۔عرشؔ صہبائی ہر حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں:

آج ہم زندہ ہیں کل مرحوم ہو جائیں گے عرشؔ
اک حقیقت رفتہ رفتہ داستان بن جائے گی(۷۴)

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خیال کو کتنے بہترین ومنفرد انداز سے بیان کیا گیا ہے۔"اک حقیقت رفتہ رفتہ داستان بن جائے گی" کی کہاں تک داد کی جائے۔عرشؔ کی بے باکی اور جرات داد سے مبرا ہے۔ایسے اشعار آپ کو بہت کم شاعروں کے یہاں ملیں گے۔عرشؔ حسن بیان نے انہیں انفرادیت سے ہم کنار کیا ہے۔شاعر کا خود بھی اس کا احساس ہے۔ان کا یہ شعر بھی دیکھئے:

میرا جشن وفات کب ہوگا
مجھ کو اس میں شریک ہونا ہے(۷۵)

اس طرح عرشؔ صہبائی نے اپنی غزلوں میں اسرار کائنات کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش میں ایسی شعری تعبیرات اور بصیرت سے کام لیا ہے جو ہر قدم پر آفاقیت کی دعوت دیتے ہیں۔ایسے کئی اشعار ان کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں جو ہمیں کائنات اور اسرار کائنات کو نہ صرف سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں بلکہ خالق کائنات سے ایک مستحکم تعلق پیدا کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کی ابتدا بھی کائنات سے ہوتی ہے اور کائنات،موجودات یا کونیات کے متنوع مناظر اور کیفیات کے ذریعہ اس کے خالق تک پہنچا جاتا ہے۔دنیاوی زندگی میں کائنات کو دیکھے بغیر اللہ تعالیٰ کی معرفت نہیں ہوسکتی ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کا ابتدائی مقصد ہی کائنات کو دیکھنا اور سننا ہے۔گویا عرشؔ کے کلام میں حیات و کائنات کے مشاہدات و احساسات کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔البتہ انہوں نے زندگی کے علاوہ موت کے اوصاف اور اس کی کیفیات کا بیان کرنے میں بھی منفرد انداز اختیار کیا ہے۔اس بات کے جواز کے طور پر ان کے مختلف رنگ کے اشعار کا حوالہ دیا جاسکتا ہے:

پھول سے خوشبو کی صورت ہم جدا ہو جائیں گے　　یہ بہار یہ چمن آرائیاں رہ جائیں گی
ہم سافر ہیں نکل جائیں گے ہر بستی سے دور　　اور ہم کو ڈھندتی پروائیاں رہ جائیں گی
خود کو نہ پہچان پائیں گے یہ صورت ہوگی　　خشک پتوں کی طرح ہم کو بکھر جانا ہوگا(۷۶)

عرشؔ صہبائی کی شاعری میں یہ بھی ایک انفرادی پہلو ہے کہ ان کے بعض اشعار قران کی آیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔حیرت کی بات یہ ہے کہ قران ان کی نظروں سے کبھی نہیں گزرا لیکن پھر بھی ان کے کلام میں قران قریم کی بعض آیات کی ترجمانی ملتی ہے۔مثلاً زندگی کا موت سے جاملنے یا موت کی آغوش میں جانے کا مضمون الگ بگ قران کی 49/آیات میں مختلف انداز سے موجود ہے۔لیکن یہاں ہم اگر مثال کے لئے قران پاک کی سورہ امران کی آیت نمبر 185/کے شروع کے مضمون کے مفہوم پر غور کریں کہ ''ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے''۔اس ایک مضمون کے جواز میں عرشؔ کے کئی اشعار مل جاتے ہیں۔مثلاً:

آب جو بن کے رہوں یا کوئی دریا اے عرشؔ
آخر کار سمندر میں اترنا ہے مجھے
ہوتا نہیں دائمی انسان کا عروج
سورج بھی شام پڑنے پر ڈھلتا ضرور ہے

زندگی ہے ابھرتا سورج عرشؔ
اس کو آخر غروب ہونا ہے
زندگی کچھ دنوں کے ہنگامے
اور پھر گہری نیند سونا ہے
یہ حادثہ ہر اک پہ گزرنا ہے کسی روز
شیرازہ ہستی کو بکھرنا ہے کسی روز(۷۷)

زندگی اور موت دونوں ایک دوسرے میں ایسے جذب ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود بے معنی سا لگتا ہے۔ اس میں سے ایک سے دوسرے تک کے سفر میں ایک پوری کائنات واقع ہے جو کئی طرح کے امتحانات لئے ہوئے نمودار ہوتی ہے۔ بقول عرشؔ:

زندگی آج بھی رستا ہوا غم ہے عرشؔ
آج بھی صورت حالات پُر امید نہیں
جو ستم بھی ہے وہ مخصوص ہے میری خاطر
زندگی! تو ہی بتا ایسا بھی کیا ہے مجھ میں
زندگی اک مرقع ہے غم و راحت کا
خار و گل دونوں سے تزئین زندگی ہے(۷۸)

پھر قران پاک کی سورۃ 45/سورۃ جاثیہ کی آیت 27/ کے مضمون کا ایک حصہ ''اور اللہ ہی تمہیں زندہ کرتا ہے پھر تمہیں مارتا ہے پھر قیامت کے دن کی طرف جس میں کوئی شک نہیں، تمہیں اکٹھا کر کے لے جائے گا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''(۷۹) کی عرشؔ یوں ترجمانی کرتے ہیں:

جئیں ہم اس کی خوشی تو مریں ہم اس کی خوشی
یہ کیا کہ ہم کو کسی شے پہ اختیار نہ ہو(۸۰)

عرشؔ صہبائی کی غزلوں میں ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں اپنی غزلوں کو فلسفیانہ پیچیدگیوں سے پاک رکھا ہے مگر مذہبی اظہار خیال اور مذہبی طرز سے وہ خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ یہ بات تقریباً تسلیم شدہ ہے کہ غزل کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر عرشؔ نے اپنی غزلوں میں کئی مقامات پر اپنے خودساختہ عقائد سے بالاتر اٹھ کر خالص توحید کے نغمے گائے ہیں۔ انہوں نے خالق کائنات اور اس کی تخلیقات کا بیان اپنے اشعار میں اتنی فنکاری اور سادگی سے کیا ہے کہ اشعار پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر کے مزاج میں تصوف کا رنگ بھی نمایاں

ہے۔کسی بھی کام کے کرنے میں جذبے کی صداقت بہت بڑی طاقت رکھتی ہے۔عرشؔ کے انداز فکر اور جوش و جذبے کا اندازہ ان کی غزل کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے۔عرشؔ کی غزلوں کے مطالعے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے زندگی اور کائنات سے ذاتی سطح پر رشتہ قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اپنے فکر اور مشاہدے کے ذریعے جو کچھ جیسا محسوس کیا اسے ویسا ہی اپنی غزل میں بیان کر دیا۔یہ بات ہم اکثر سنتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ شاعر کا تخیل اور مشاہدہ عام انسان کی نسبت بہت گہرا ہوتا ہے لیکن اس کی صداقت کا احساس ہمیں عرشؔ کی شاعری کے مطالعے کے بعد ہوتا ہے۔یہ کائنات اللہ تبارک و تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہے اور وہی سب سے بہترین تخلیق کرنے والا ہے۔جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمینوں میں ہے سب اسی کا ہے۔قران پاک کی سورۃ 3 کی آیت 190 رمیں ہے''اور اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ۔اور اللہ ہر چیز پر جسے وہ چاہے دائمی قدرت رکھتا ہے۔''(۸۱)اس مفہوم کو عرشؔ کے بیشتر اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے۔اس کے جواز کے طور پر بھی عرشؔ کے کئی اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں جو ان کی زبان دانی اور منفرد لہجے کے شاہد ہیں۔ایسے ہی اشعار انہیں اردو ادب میں ایک منفرد انداز کے شاعر کے عہدے پر فائز کرتے ہیں:

یہ حقیقت ہے وہ ہر ذرے میں ہے جلوہ نما
جس طرف دیکھئے بکھرے ہیں اجالے اس کے
ستارے، پھول،کلیاں،ابر،رنگ و بو،دھنک،شبنم
نہیں کوئی وجود اس کا مگر پر چھائیاں کتنی
کوئی اسے تسلیم کرے یا نہ کرے عرشؔ
ہر ذرے میں ہم نور خدا دیکھ رہے ہیں
میں اپنے بارے میں اتنا کہوں گا
کہ میں ہوں داستان تحریر اس کی(۸۲)

عرشؔ صہبائی کے یہاں بعض مضامین ایسے ملتے ہیں جن کا استعمال شاعر نے ممکن ہے صرف شاعری کرنے کے لئے کیا ہو لیکن ان اشعار پڑھنے سے ایسا قطعاً محسوس نہیں ہوتا بلکہ ان میں شاعر کا اپنا تجربہ و مشاہدہ شامل نظر آتا ہے۔مثلاً عرشؔ کا تعلق ہندو مذہب سے تھا اور ایسا اکثر دیکھنے کو ملتا ہے کہ ہندو دھرم کے ماننے والے ایک خدا کے بجائے انیک خداؤں کی عبادت پر یقین رکھتے ہیں لیکن عرشؔ کے اشعار پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدائے واحد کی عبادت یعنی توحید کے قائل بھی تھے۔آپ ان کے ان اشعار سے خود اندازہ

لگا سکتے ہیں:

یہ اس کا فیض ہے مجھ کو ہے آگہی اتنی
ہر ایک ذرے میں اس کا وجود پاتا ہوں
یہ بات الگ ہے کہ نہیں اہل نظر ہم
ورنہ تیرے جلوے کہیں روپوش نہیں ہیں
جس کو ہوتی ہے آگہی اس کی
اس کے چہرے پہ نور ہوتا ہے
تیری ہر سانس میں موجود ہے وہ
تو ناحق خاک صحرا چھانتا ہے(۸۳)

عرشؔ صہبائی کے کلام میں جذبے اور احساس کی گھلاوٹ ملتی ہے۔ان کے لہجے میں نرمی و دردمندی کے ساتھ کہیں کہیں تلخی بھی ملتی ہے۔عرشؔ کی غزلوں میں کئی ایسے اشعار ہیں جو نوآموز شعراء کے لئے ایک تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔آج کے معاشرے کی سب سے بڑی خرابی بے اعتمادی ہے۔انسان کو کسی شے کا بھی اعتماد حاصل نہیں رہا، وہ خود محنت و مشقت کے بغیر ہر چیز حاصل کرنے کا قائل ہے اور اگر ایسا کچھ ممکن سے باہر ہوتا ہے تو اسے قدرت کے ذمے ڈال دیتا ہے۔اگر اسے کچھ با آسانی حاصل ہو جاتا ہے تو اپنی قابلیت سمجھتا ہے اور اگر کچھ نہ ملے تو خدا کی ذات تک کا منکر ہو جاتا ہے۔دنیا کی تمام بڑی ہستیوں کے قول و فعل میں یہ بات خصوصی دیکھی گئی ہے کہ وہ خدا کی ذات سے ہمیشہ پر امید رہتے تھے بلکہ ناامیدی کو کفر گردانتے تھے۔عرشؔ بھی اسی عقیدے کے قائل تھے:

سب کو ہے تسلیم تو ہے کار ساز
میری مشکل بھی کبھی آسان کر
اس کی رحمت سے کسی حال میں مایوس نہ ہو
وہ اگر چاہے تو قطرے کو دریا کردے(۸۴)

خالق کائنات نے اس جہاں کو پیدا کیا ہے۔یہ قول کئی مقدس کتابوں میں درج ہے کہ کائنات کے بنانے والے نے اس کی ہر چیز کو بہتر بنایا اور ایسا بنایا کہ اس میں مزید بہتری کا کوئی امکان باقی نہیں رکھا ہے۔عرشؔ اس بارے میں دیکھئے کیا خوب کہتے ہیں:

اس کی جو بات ہے دنیا میں ہے حرف آخر
کس میں جرات کہ کوئی نقص نکالے اس کا(۸۵)

عرشؔ صہبائی نے غزل میں روایت کا پاس رکھتے ہوئے اس نوعیت کے کئی نئے تجربے کئے۔ان کی غزل کے اشعار ان کے ذاتی احساسات و کیفیات کے ترجمان ہیں۔ان کے یہاں آس اور یاس دونوں کیفیتیں انفرادی رنگ و آہنگ کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ کیفیتیں ہر انسان کو متاثر کرتی ہیں۔اول یہ کہ انسانی ذہن وقلب پر شعوری و لاشعوری طور پر ان کیفیات کا اثر ہوتا ہے اور دوم دل میں اٹھنے والی کسک اور ذہن میں پلنے والی الجھن کچھ زیادہ ہی جگر آزما ہوتی ہے۔عرشؔ کے آس اور یاس کے پیمانے میں ڈھلنے والے امتزاجی مضامین کی انفرادیت یہ ہے کہ عرشؔ نے کہیں منطقی تقاضے کے مطابق فرد،سماج ومعاشرے میں حیات کے منفی رویے یا حالت کو پیش کیا ہے تو کہیں سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کا حل منطقی اور اصلاحی طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔جہاں انہیں معاشرے کی فرسودہ روایات ورسومات سے گھٹن محسوس ہوئی تو انہوں نے اپنے کلام کے زریعے سے اسے درست کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔غرض یہ کہ ان شعری مضامین میں انسانی عظمت اور جذبہ ہمدردی،اخلاقی قدریں اور جذبہ اصلاح،حق گوئی وغیرہ کا شدید احساس موجود ہے:

یہ دیکھا ہے کہ مٹ جاتی ہے ہر دل کی پریشانی
بشر جب زندگی کی قید سے آزاد ہوتا ہے(۸۶)

آدمی آفات ہستی سے اگر چاہے نجات
مشکلوں کا خیر مقدم ہر قدم کرتا رہے(۸۷)

بھنور کی زد مین رہی کشتی حیات مری — تمام عمر الجھتی رہی تلاطم سے
کھلی کتاب کی مانند ہے حیات مری — جہاں جہاں سے بھی چاہو ورق ورق پڑھ لو
ہوئی ہے زندگی یوں نذر حادثات مری — میں اک چٹان تھا جو بٹ گیا ہوں ذروں میں
غم حیات سے روشن ہے کائنات مری(۸۸) — غم حیات کی عظمت کو میں سمجھتا ہوں

عرشؔ صہبائی کی شاعری میں زندگی کے خار وگل دونوں کا چہرہ صاف دکھائی دیتا ہے بلکہ ان کے اشعار میں ایک بے چین روح گردش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھی معاشرے میں ہونے والے ظلم وستم سے ٹکر لیتے رہے ہیں۔انسان کی انسانیت کا مٹ جانا کوئی عام بات نہیں ہے آج اخلاقی اعتبار

سے انسان اس معیار کو پہنچ چکا ہے کہ وہ جانوروں کو تو جان سے عزیز رکھنے کا قائل ہے لیکن انسان ہو کر انسانوں کی ہی تباہی کے منصوبے بنا تا رہتا ہے۔ ہمارے معاشرے سے جب اخلاقی قدریں مٹ جاتی ہیں تو کچھ حساس دل لوگ اپنے قلم کو نشتر بنا کر سماج میں ابھرنے والی نئی روایات اور رسومات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور جن رسومات و روایات کی بدولت غلط قسم کی سماجی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہوں ان کا اپنی تحریروں میں برملہ ردعمل کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ عرشؔ بھی انہیں حساس دل لوگوں میں سے ایک تھے جو ہر رسم و روایت کو بدل دینے کا عزم رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے قلم کو تلوار بنایا ہے اور غزل اور نظم کے ذریعہ اپنی تہذیب و ثقافت کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقول عرشؔ:

ہم کو جکڑے ہوئے تھے رسم و رواج
ہم یہ زنجیر توڑ کر نکلے(۸۹)

عزم سے ہوتے ہیں حل سب مسلے
عزم سے کٹتی ہیں زنجیریں کئی(۹۰)

بدلنا ہے مجھے اے عرشؔ زندگی کا نظام
بلا سے لاکھ رسوم کہن کے پہرے ہیں(۹۱)

دنیا کی روایات نے بر باد کیا ہے
دنیا کی روایات کو سلجھانا پڑے گا(۹۲)

نظام نو کے اجارہ دارو یہ خوب تنظیم ہے چمن کی
کسی کو حاصل ہوا گل تر کسی کو خار چمن ملا ہے(۹۳)

سلسلہ ہائے رسومات کہن چھوڑ گئے
اپنے اجداد کی جاگیر پہ رونا آیا(۹۴)

اسے یہ دعویٰ مساوات کا وہ حامی ہے
بشر بشر میں جو کرتا ہے امتیاز بہت(۹۵)

عرشؔ کا شعور پختہ ہے اور فن بہت نکھرا ہوا ہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں بعض مقامات پر بڑے جوش اور ولولے سے کام لیا ہے۔ ان کا جداگانہ انداز و اسلوب انہیں ترقی پسند شعراء کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

کٹتی ہے تو کٹ جائے زباں اپنی مگر ہم　　ظلمت کو کسی طور ضیا ہم کہہ نہیں سکتے
ہیں میری نظر میں وہ بشر قابل نفرت　　دنیا میں بروں کو جو برا کہہ نہیں سکتے (۹۶)

اس لئے رکھتا ہوں میں اس کو عزیز
حق پرستی روح کی آواز ہے (۹۷)

آدمی کو کرنا پڑتا ہے سر تسلیم خم
دب نہیں سکتی جو وقت کی آواز ہوتی ہے (۹۸)

عرشؔ کی غزل ایک نئی معنویت رکھتی ہے۔ اپنی فکر اور فلسفہ کے سارے پہلو انہوں نے اپنی غزل میں سمو دئے ہیں۔ یہ بھی ان کی ایک اہم خوبی ہے کہ انہوں نے اپنی غزل میں اظہار و ابلاغ کے تجربے کئے ہیں، غزل کو نئی علامتیں دی ہیں اور رمز و کنایہ کی نئی محفلیں آراستہ کی ہیں۔ یہ بھی ان کا انداز ہے کہ انہوں نے غزل حق پسندی کی نئی طرح کا آغاز کیا ہے۔ بے باکی و حق گوئی اگرچہ ایک بہترین عمل سہی لیکن بعض مقامات زندگی میں ایسے آتے ہیں جہاں نہ چاہتے ہوئے بھی انسان حق بات کو کہنے سے پرہیز کرتا ہے اور ایسا کرنا کئی معنوں میں ضروری بھی ہو جاتا ہے لیکن حضرت عرشؔ کو جس حد تک میں نے جانا وہ حق بات کو ڈنکے کی چوٹ پر کہنے سے کبھی نہیں کتراتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ انہیں بے باکی و حق گوئی اور اخلاص سے نفع کم نقصان زیادہ ہوا۔ اس کا اظہار ان کے اشعار میں بھی دیکھا جا سکتا ہے:

اخلاص بنا دے گا ہمیں اپنا ہی دشمن
کیا علم تھا بے جرم سزائیں بھی ملیں گی
خاموش رہیں گے تو ضمیر اپنا گھٹے گا
حق بات پہ سنگین سزائیں بھی ملیں گی
میں سمجھتا تھا کہ اخلاص و وفا ہے معتبر
لیکن اپنی بات پر ہے اب پشیمانی مجھے

میں کبھی منصور کی صورت کبھی سقراط ہوں
حق پرستی نے کیا دنیا میں لا فانی مجھے(۹۹)

عرشؔ نے اپنے عہد کے غزل گویوں سے الگ ہٹ کرنئی امیجری اور نیا لب ولہجہ پیدا کیا۔ان کی لے میں اک نئی تازگی ہے۔انہوں نے عروس غزل کو روایتی مضامین کی قید آزاد بھی کرایا اور روایت سے صحت مند استعفادہ بھی کیا ہے۔ان کے صحت مند تجربات نے بعد میں آنے والوں کے لئے راہ ہموار کی ہے۔غزل کو عرشؔ نے ایک اندھی اور بے حس صنف سخن کے بجائے حساس اور باشعور صنف سخن بنایا ہے۔موجودہ دور کی نئی غزل کے تناظرات کو بدلنے میں عرشؔ صہبائی کی تخلیقی کاوشوں نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔تاہم یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اردو غزل میں عرشؔ صہبائی کا اتنا اعلیٰ کام کیا ہے۔اس کے باوجود اردو غزل کے جتنے انتخاب اور جتنی تنقیدی کتابیات میری نظر سے گزری ہیں ان میں کسی میں بھی انہیں شامل نہیں کیا گیا ہے۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ تعصب کے شکار رہے ہیں۔بقول عرشؔ:

کٹی ہے زندگی جمہوریت کے سائے میں
تمام عمر تعصب کا شکار ہم رہے(۱۰۰)

عرشؔ صہبائی کی ایک بہت بہترین خوبی یہ تھی کہ وہ امید کے دامن کو کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔وہ ہر انسان کو انسانیت کے ایک ترازو میں تولتے تھے۔سارا زمانہ ان کے خلاف ہوجائے تو بھی وہ پر امید رہنے کے عادی تھے۔بقول ان کے:

حسرت یاس بہت کچھ ہے   میرے پاس بہت کچھ ہے
میں ہوں مصائب کا عادی   مجھ کو راس بہت کچھ ہے
کاش سنور جائیں حالات   وقت سے آس بہت کچھ ہے
سب انسان برابر ہیں   یہ احساس بہت کچھ ہے(۱۰۱)

ہر دور کی شاعری اپنے دور کی آواز رہی ہے۔موجودہ دور کی شاعری بھی اس دورش۴چ۵ششآواز کہی جا سکتی ہے لیکن جہاں تک عرشؔ صہبائی کی شاعری میں عصری آگہی کا تعلق ہے۔یہ وقت کے ساتھ چلتی آرہی ہے اور ہست وبود کے ساتھ اپنی موجودگی ثابت کر چکی ہے۔ان کی شاعری دور جدید کی غماز ہے۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ایک طرف جہاں انہوں نے پرانے موضوعات کو ازسر نو نئے رنگ ڈھنگ سے پیش کیا ہے وہیں دوسری طرف انہوں نے اپنی شاعری میں نئے دور کے مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ان کے یہ شعر ملاحظہ کریں:

جبین وقت کے تیور میری نظر میں ہیں
میں نبض وقت کی دھڑکن سے ناشناس نہیں(۱۰۲)

عرشؔ صہبائی نے اپنے غزلوں کے لئے ایسی لاجواب ومترنم بہریں اختیار کی ہیں اور الفاظ کے انتخاب اور ان کی نشست میں صوت وآہنگ کا ایسا خیال رکھا ہے کہ کسی عام قاری وسامع پر بھی ایک مخصوص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جس میں مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی ہوتی ہے۔ عرشؔ کے کلام میں غنائیت کا سبب شاید اس بھی زیادہ موجود تھا کیوں کہ انہیں موسیقی سے دلی لگاؤ تھا اور وہ موسیقی کو شاعری کا ایک جز گردانتے تھے۔ عرشؔ کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، کہیں وہ زندگی سے خفا معلوم ہوتے ہیں، کہیں زندگی کے اسیر، کہیں انسان کو انسانیت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے ہیں تو کہیں درس اخلاقیات پر سرگرداں نظر آتے ہیں۔ انہیں اوصاف کی بنا پر ان کا شمار بیسویں صدی کے درمیان سے اب تک کے ان نامور شعراء کی صف میں نمایاں ہے جنھوں نے نظم، دوہا، قطعہ اور غزل کے ساز پر ایسے نغمے چھیڑے جن کی گونج دنیائے ادب میں رہتی دنیا تک سنائی دیتی رہے گی۔ زمانے کا مزاج چونکہ ہر دور میں بدلتا رہتا ہے اس لئے وہی تخلیق کار اپنے فن کو مردہ ہونے سے بچا سکتا ہے جو زمانے کے بدلاؤ کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقات کا ذائقہ بدلنا جانتا ہو۔ عرشؔ بھی ان شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے ہر بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے فن کی بقاء کا سامان فراہم کیا ہے۔ عرشؔ کا سن پیدائش 1930ء ہے اور سن وفات 2020ء ہے۔ اس سے یہ بات عیاں ہے کہ انھوں نے مختلف ادوار دیکھے ہیں۔ انھوں نے ملک کی تقسیم کے علاوہ مختلف ادبی وسیاسی تحریکات کا بھی سامنا کیا ہے لیکن وہ کبھی بھی ان سے متاثر نہیں ہوئے۔ انھوں اپنی شاعری کے لئے اپنی الگ راہ نکالی ہے۔ ان کے کچھ اشعار ملاحظہ کریں:

دل ہے کہ کسی شہر کی ویران گلی ہے　　مدت سے نہ یادوں کی کوئی شمع جلی ہے
یہ زندگی ہے یا کوئی نازک سی کلی ہے　　اک آنچ بھی سہہ سکتی نہیں آتش غم کی
کچھ دور مرے ساتھ تیری یاد چلی ہے　　کیا جانئے کیا گزری ہے پھر دشت طلب میں
نازک سے وہ لب ہیں کہ شگفتہ سی کلی ہے　　آنکھیں ہیں کہ مستی کے چھلکتے ہوئے ساغر (۱۰۳)

کچھ تو پاس آرزو رکھ لیجئے
میرے دل کی آبرو رکھ لیجئے(۱۰۴)

مانا کہ ہیں مغرور وہ خودار ہیں ہم بھی
مرجائیں گے لیکن کبھی منت نہ کریں گے(۱۰۵)

جو محبت میں مر نہیں سکتے
غم کی تسخیر کر نہیں سکتے(۱۰۶)

عرشؔ صہبائی خود کو جدیدیت سے مبرا سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی وہ ایک جدید شاعر تھے۔ جدید دور کی نمائندگی کرنے والے شاعروں میں ان کا نام بھی اپنی نوعیت میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ عرشؔ زندگی کے شاعر بلکہ اس کے ہر پہلو اور ہر سطح کے شاعر ہیں۔ زندگی کی قدریں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ جس طرح انسانی زندگی میں اس کی تہذیب وتمدن میں تبدیلیاں ہوتی ہیں اسی طرح زندگی کے ساتھ ساتھ چلنے والے ادب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور عرشؔ کے کلام ان تبدیلیوں کا حقیقی ترجمان ہے۔

عرشؔ اپنی شعری روایت سے پوری طرح واقف تھے تاہم انہوں نے روایت سے روگردانی کرتے ہوئے صنف غزل کو داخل کی لامحدود دنیا سے متعارف کرایا اور غزل میں سوز وگداز، المیاتی حزن، خود کلامی سرگوشی اور لہجے کے تیکھے پن کے عناصر کو بھی شامل کیا۔ زبان وبیان کی سطح پر بھی عرشؔ کسی قید وبند کی سختی قبول نہیں کی۔ یہی وجہ ہے ان کے یہاں عام بول چال کے الفاظ کو شعری الفاظ بنانے کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ ان کے لہجے میں نئے احساس کی خوشبو کچھ اس طرح رچی بسی ہے کہ روایت کے اعلیٰ اقدار کا دامن کہیں سے داغدار ہوتا نظر آتا ہے۔ وہ جدیدیت کی تلاش میں اتنا آگے نہیں جاتے کہ اشعار بے معنی ہو کر رہ جائیں۔ جدت نگاری میں اعتدال ان کا پسندیدہ راستہ ہے۔ ان کے کلام میں نئے امکانات ومیلانات کا اجتہادی رویہ، فکری ریاضت اور معنویت میں تہہ داری پائی جاتی ہے۔ وہ شعری لفظیات کے واقف کار ہیں۔ وہ اپنے انفرادی تجربے اور ذاتی مشاہدے کے منظّم اور موثر طریقے پر اظہار قدرت بھی رکھتے ہیں۔ بقول آبر احسنی گنگوہی:

> عرشؔ صہبائی کے اشعار میں فنی صحت کا بہتر انتظام ہے اور ایسا ہونا ہی چاہیے۔ ایسا ہونے کا ضامن ملک کے معروف ومسلم استاد جوشؔ ملسیانی کا شاگرد ہونا ہے۔ حضرت جوشؔ کا نام ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ عرشؔ کا کلام زیادہ سے زیادہ فنی اغلاط سے پاک ہو لیکن عرشؔ انسان ہیں اور انسان کی تعریف میں سہو وخطا بھی شامل ہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ عرباب نظر کو حسب لیاقت عرشؔ کے کلام میں غلطیاں بھی نظر آئیں لیکن مجھے اس کی قوی امید ہے کہ محاسن کے مقابلہ میں بہت کم ہوں گی۔(۱۰۷)

عرشؔ صہبائی کا کلام اگرچہ جدیدیت وعصری حسیت سے معمور ہے تاہم ان کے ہاں ایسے مبہم اور بھرتی کے اشعار نظر نہیں آتے جو اکثر جدیدیت پسند شعراء کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ ان کے طرز بیان میں شائستگی

اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔انہوں نے دراصل عام گفتگو کی سادہ وسلیس زبان ہی کو اپنے جذبات وخیالات کا وسیلہ اظہار بنایا ہے اور اسی باعث جدید لب و لہجے کے باوجود ان کے کلام میں شکست وریخت یا انتشار کی کیفیت نظر نہیں آتی۔ان کے غزلیہ اشعار میں شعری لفظیات،معنویت کی تہہ داری،طنز کی نشتریت اور نئی علامتوں کا ایک دلفریب اور الکش امتزاج موجود ہے جس نے ان کی غزل گوئی میں شگفتگی اور تازگی کے ساتھ زندگی کی حرارت اور ایک جمالیاتی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔بقول خورشید کاظمی:

> عرشؔ صہبائی کی شاعری کی زبان اتنی صاف،مرصع اور سادہ ہے کہ تعریف کئے بنا نہیں رہا جاسکتا۔یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہیں ہوسکتی ہے کہ آج کے دور میں عرشؔ بھی اپنے آپ میں ایک انجمن ہیں۔ان کی شاعری کا چشمہ ہمیشہ بہتا رہتا ہے۔زمانے کے حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں،اپنی ذاتی زندگی کے کتنے ہی تلخ و شیریں حالات سے وہ کیوں دوچار نہ ہوئے ہوں،ان کے دوستوں نے ان سے کتنی ہی دغا کیوں نہ کی ہو،ان کا ذہن کبھی تھکا نہیں اور شعر کا نزول ہوتا رہا۔شاعری ان کی روح کی غذہ ہے۔اس غذہ سے وہ ہمیشہ سرشار رہتے ہیں۔میں کہہ سکتا ہوں کہ عرشؔ بذات خود ایک شعر ہیں بلکہ مکمل غزل۔ان کا میرے نزدیک یہ معیار ہے کہ باوجود بسیار گوئی کے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کوئی بھی شعر غیر معیاری یا بھرتی کا ہے۔(۱۰۸)

عرشؔ صہبائی کی غزل دیگر کئی خوبیوں کے علاوہ اپنے لہجے کی انفرادیت کے باعث معاصر غزل میں ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔خالص فنکارانہ آزادروی ان کے تخلیقی مزاج کو ایک عجیب بے نیازی عطا کرتی ہے اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ باطنی احساسات کے اظہار میں منفرد ہونے کے باوجود وہ اپنے بیرون ذات سے منحرف نہیں ہوتے بلکہ ان کے ہاں اپنے گرد و پیش سے استواری کا ایک قوی رجحان نظر آتا ہے۔ان کے کلام میں استادانہ پختگی ہی نہیں ہے بلکہ فنی رچاؤ بھی،فکر بھی اور ایک واضح فلسفہ حیات وکائنات بھی ہے۔وہ شاعری کو قدرت کا ایک بہترین عطیہ سمجھتے تھے۔اگرچہ ان کی اس قدر پذیرائی نہیں ہوئی جس کے وہ حق دار تھے لیکن اس باوجود ان کا جذبہ شاعری بہت بلند تھا۔وہ شاعری میں شائستگی،حق گوئی و بے باکی،ذوق وشوق،درد وغم اور تہذیب کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیتے تھے۔ان کے نزدیک فن بغیر تاثیر کے بے خوشبو پھول کی مانند ہے۔وہ زمانہ سے داد طلبی کے بجائے خالق کائنات سے تاثیر کے خواہاں تھے۔اس سے پتا چلتا ہے کہ عرشؔ شاعری کو آفاقی چیز جانتے ہوئے آفاقی جذبوں کی ترسیل اور تفہیم کا ذریعہ سمجھتے تھے۔آج تو وہ دور ہے کہ شاعر تو شاعر قاری و سامع کا بھی ذوق بدل گیا ہے۔شاعر شاعری کے عیبوں کو نظر انداز کرتا ہوا بڑی شان سے

مشاعروں میں جا کر زور وشور سے اسی کلام کو ایسے گاتا ہے کہ قاری وسامع بھی عیبوں کو نظر انداز کر کے خوب داد دیتے ہیں۔عرشؔ اس کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔میں نے انہیں بارہا کہتے سنا ہے کہ آج بعض شاعر وادیب اردو کی خدمت پر آمادہ ہیں مگر اردو کی ذلت کا سبب بنے ہوئے ہیں۔اردو شاعری کے بہت سے نام نہاد شاعروں کو وہ تخلص کا گنگار قرار دیتے تھے۔وہ خود فن سے فنکار کی شناخت کرنے بھی قائل تھے۔ان کے چند اشعار دیکھئے:

شعر پڑھتا ہوں تو میں گاتا نہیں
عیب فن گانے سے چھپ جاتا نہیں (۱۰۹)

وہ شاعر جن کا ہے معیار کوئی
بہت ہی کم بہت ہی کم رہے ہیں(۱۱۰)

سر بہ سر ابہام ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں
شاعری جو فکر وفن حسن بیان سے دور ہے(۱۱۱)

قدر و قیمت تھی شاعری کی کبھی
اب ہے یہ کاروبار کیا کہیے(۱۱۲)

ایسا ہرگز نہیں کہ عرشؔ کے دل میں شاعروں اور ادیبوں کے لئے کوئی عزت نہیں تھی اور نہ وہ خود کو اعلیٰ فنکار مانتے تھے۔وہ شاعری میں فن کو اہمیت دینے کے سبب دوسروں کی نظر میں کھٹکتے تھے۔خود اپنے بارے بھی اظہار کرتے ہیں:

عرشؔ تحت اللفظ پڑھتا ہوں غزل
شعر کہتا ہوں مگر گاتا نہیں(۱۱۳)

میرے اشعار میں سو خامیاں ہو ں گی اے عرشؔ
میں بھی انساں ہوں انساں سے خطا ہوتی ہے(۱۱۴)

عرشؔ کے نزدیک وہی شاعر وادیب قابل تحسین ہے جس نے واقعی دل وجان سے ادب کی خدمت کی ہو،وہ زمانے کی ہوا کے ساتھ چلنے والوں اور ابھرتے سورج کے پجاریوں کی سوچ سے متصادم رہے اور خاموشی

سے ادب کا فریضہ بے لوث طریق ادا سے انجام دیتے رہے۔موصوف نے عملی طور پر مفاد پرست لوگوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے وہ خود وضع دار اور کم گو انسان تھے اس لئے انہوں نے بے جا تنقید اور ادبی چشمکوں کے دروہ نہیں کئے بلکہ حق گوئی کا حکیمانہ انداز اختیار کیا ہے۔عرشؔ صہبائی ایک صاف دل اور صاف گو انسان تھے۔ایک اچھا شاعر حق گو اور حق پرست بھی ہو تو یہ سونے پر سہاگا ہے اور یہ وصف اس کی شعری وفنی تخلیقات کو نادر جلا بخشتا ہے۔ملاحظہ ہو:

یہ میرا تجربہ ہے عرشؔ اس میں ہے یقیں میرا
کہ دل ہو صاف جس کا ذہن بھی زرخیز ہوتا ہے(۱۱۵)

فریب و مکر کی دنیا سے دوررہتا ہوں
یہی میری عبادت یہی میری نماز(۱۱۶)

عرشؔ صہبائی ایک حقیقی شاعر تھے اور حقیقی ہونے کی وجہ سے ہر اچھے برے واقعات وحالات سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے انہیں حالات و واقعات نے ان کے اشعار میں آگ بھر دی ہے۔لیکن حق بات کہنے سے رسوائی اور کچھ غلط فہمیوں کے پنپنے کا حدشہ بھی رہتا ہے اور بارہا کچھ تنگ نظر احباب خفا بھی ہو جاتے ہیں۔

یہ حق گوئی کی عادت خوب ہے لیکن
بہت دنیا میں رسوائی بھی ہوگی(۱۱۷)

آج حق گوئی کا صلہ یہ ہے
سنگ ساری کبھی ہے دار کبھی(۱۱۸)

مستحق ہر ایک سزا کے ٹھہرے
ہم غلط بات کی کرتے کبھی تائید نہیں(۱۱۹)

عرشؔ صہبائی جتنے اعلیٰ شاعر تھے اتنے ہی اعلیٰ اخلاق کے مالک شخص بھی تھے۔درس اخلاق سے ان کا کوئی واسطہ نہیں رہا لیکن انہوں نے نہ تو کبھی حکیم و وعظ بننے کی کوشش کی اور نہ معلم اخلاق وحکیم بلکہ وہ اپنی تمام عمر اپنی غزلوں میں صرف اپنے جذبات کی مصوری کرتے رہے۔ان کی ابتدائی شاعری میں ہی اخلاقی پہلو بہت نمایاں تھا اور پھر جیسے جیسے انکی شاعری پروان چڑھتی گئی شاعری اور زندگی میں گہرے تجربات ہوتے گئے درس اخلاق بھی ان کے یہاں بڑھتا گیا اور کلام میں پختگی آتی گئی۔عرشؔ کے نزدیک شاعری داد طلبی نہیں بلکہ ننگی تلوار کو ہاتھ میں لینا

ہے شاعر کو حق گوئی کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر چہ ان کے طنز سے کچھ خاص بدلاؤ نہ ہوا ہو لیکن انہوں نے اپنی زندگی اس عمل میں صرف کی ہے۔ ان کی حق گوئی کی بدولت انہیں کئی بار نقصان بھی اٹھانا پڑا لیکن وہ اس سے کبھی باز نہیں آئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حق گوئی کوئی آسان امر نہیں ہے۔ بقول عرشؔ:

کیا ستم ہے کہ کوئی بھی آواز حق سنتا نہیں
مصلحت ہے اس میں کچھ یا لوگ ہی بہرے ہوئے (۱۲۰)

ان سخت مراحل سے گزرنا نہیں آسان
بے باقی و حق گوئی بھی اک کوہ کنی ہے (۱۲۱)

حق بات پہ کٹتی ہے زباں ٹھیک ہے لیکن
خاموش زبانوں پہ بھی چھالے سے ملتے ہیں (۱۲۲)

جس کو دعویٰ ہو حق پرستی کا
وہ کبھی دار پر بھی ہوتا ہے (۱۲۳)

ہم راہ حق میں چلو ہار گئے
پھر بھی یہ جنگ لڑی ہے کتنی (۱۲۴)

عرشؔ ہم نے کر لیا ہے راہ حق کا انتخاب
زندگی کرنے کو ورنہ مختلف رستے تھے (۱۲۵)

اکثر دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک عام حساس انسان کے اندر بھی انا اور خودداری کا جذبہ شدید ہوتا ہے۔ وہیں ایک فنکار کی انا کا اندازہ لگانا ہمارے تصور سے بھی باہر ہوگا لیکن عرشؔ صاحب کے اس ایک شعر سے ہی آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس قدر انا زدہ اور خوددار شخصیت کے حامل تھے:

لغزشیں اور بھی سرزد ہوئیں مجھ سے اے عرشؔ
یہ خطا بھی ہے کبھی جھک نہ سکا سر میرا (۱۲۶)

ان کے علم و ہنر کی بلندی اور اعتراف خطا کا یہ رنگ بھی ملاحظہ فرمائیے:

اپنی ہمت سے اے عرشؔ بڑھے ہیں ہم آگے
اور دنیا ہے کہ اس پر بھی جلی جاتی ہے (۱۲۷)

عرشؔ کی غزل کے مطالعہ سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ انہوں نے اپنی ذات سے نکل کر اپنے سماج و معاشرے بلکہ اجتمائی شعور کو اپنے شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ سماجی و معاشی ناہمواریاں اوران سے پیدا ہونے والے حساس مسائل ان کا خاص موضوع بنے ہیں۔ اختراعی رجحان اور جدت پسندی عرشؔ کی فطرت کے بنیادی جوہر تھے۔ ان کی کوئی صنف بھی ہو اس میں ان کی جدت پسندی اور نادر کاری کو باآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مضامین شعر ہوں یا تشبیہات و استعارات یا پھر تخیلات جدت ان میں ان کی بنیادی خوبی ٹھہرتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے لئے ایک ایسے اسلوب شاعری کو خلق کیا جو نہایت دلکش اور دلفریب ہے اور جس کی نظیر عرشؔ کے علاوہ ان کے معاصرین میں کہیں نہیں ملتی۔ غزل میں حسن و عشق کا اظہار ایک عام سی بات ہے۔ عرشؔ کے یہاں بھی حسن و عشق، محبت و عداوت، ہجر و وصال کی کیفیات موجود ہیں لیکن ان کے اظہار و بیان میں انفرادیت نمایاں ہے۔ عرشؔ کا انداز بیان کی کہاں تک داد دیں کیوں کہ بسا اوقات وہ ایسے انداز کے اشعار کہتے ہیں جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو۔ انہیں زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل تھی عمر کے آخری ایام میں ان کے فن کا معیار کس قدر بلند تھا اس کا اندازہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں لکھی گئی ان کی غزلوں سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کریں:

ہائے دل کے لگانے کی سزا اتنی کڑی ہے　　یہ عشق ہے یا کوئی بلا ٹوٹ پڑی ہے
جس خار پہ تیری نگہ ناز پڑی ہے　　وہ رشک گل تر بھی ہے وہ رشک ارم بھی
لیکن ابھی توبہ کے لئے عمر پڑی ہے(۱۲۸)　　اے عرشؔ! مے و جام میں توبہ تو کرلوں

پوچھے یہ کون ان سے کیا بات ہو گئی　　آخر جو ترک ہم سے ملاقات ہو گئی
رستے میں مل گئے تو کوئی بات ہوگئی　　پہلا سا ان کا جوش محبت وہ اب کہاں
پھر بڑھتے بڑھتے ختم ملاقات ہوگئی(۱۲۹)　　پہلے سلام شوق تھا وہ بھی کبھی کبھی

عرشؔ کی شعری کائنات حسن عشق سے تکمیل پاتی ہے، معاملات حسن و عشق کا بیان، جدائی، تنہائی، ہجر و فراق، رسوائی کا شوق، محبوب سے گلے شکوے، انتظار، محبت اور ترک محبت کے مسائل، وفا کے تقاضے، جفا کی خواہش، غم دینے والے کے لئے شاد رہنے کی دعا، وضع داری کا خیال بھی اور وضع داری کی پابندی کی گھٹن بھی، محبوب کے لطف و قہر کا تذکرہ، عہد جفا و عہد وفا، وصل کی شیرینی، ہجر کی تلخی، جفا کے باوجود مہر و وفا کی اہمیت، ذکر محبوب سے سکون دل حاصل کرنا غرض محبت کے سبھی پہلو عرشؔ کی شاعری کا موضوع بنے ہیں۔ کیونکہ یہ زندگی کا

وہ رخ ہے کہ جسے بھلانا یا نظرانداز کر دینا ایک حساس شخص کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے۔ بقول عرشؔ:

وہ ولولے وہ جوش ملاقات اب کہاں　　پہلے کبھی جو بات تھی وہ بات اب کہاں
وہ مسکرا کے دیکھنا ان کا کبھی کبھی　　سہمی ہوئی نظر کے اشارات اب کہاں
ہمدم نہ چھیڑ عشق و محبت کے تذکرے　　پہلی سی دل میں گرمی جذبات اب کہاں (۱۳۰)

جو محبت میں مر نہیں سکتے　　غم کی تسخیر کر نہیں سکتے
ایسے الجھے ہیں گیسوئے دوراں　　لاکھ چاہو سنور نہیں سکتے
ہائے مجبوریاں محبت کی　　مرنا چاہیں تو مر نہیں سکتے (۱۳۱)

عرشؔ صہبائی کی شاعری کا ایک اہم نکتہ معانی آفرینی بھی ہے۔ بہت ہی عام فہم موضوع میں بھی وہ نئے نئے معنی پیدا کر دیتے ہیں۔ انہوں نے کہیں کہیں غزل کی بنیادی شعریات سے بھی انحراف کیا ہے۔ عام طور پر کلاسیکی غزل میں میں معشوق جفا پرست اور ستم شعار ہوتا ہے۔ وہ مختلف انداز میں عاشق پر ظلم ڈھاتا ہے اور عاشق اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کریہ بہ کریہ دیوانوں کی طرح بھٹکتا ہے۔ معشوق یا بے پراہ ہو کر محفل غیر میں ہوتا ہے یا آرام وسکون سے گھر میں ہوتا ہے۔ اس حالت میں عاشق معشوق سے خفا سا ہو جاتا ہے اور رد عمل کے طور پر اسے برا بھلا بھی کہہ دیتا ہے لیکن عرشؔ کے یہاں اس روایے کی تردید بھی بہت مختلف دیکھنے کو ملتی ہے:

عرشؔ ان جھیل سی آنکھوں میں اس کا کیا قصور
ڈوبنے والوں کو گہرائی کا ناداز ہ نہ تھا (۱۳۲)

وادی عشق کی ہر راہ پہ چل سکتے ہیں
ہم وہ پروانے ہیں جو آگ میں جل سکتے ہیں (۱۳۳)

عرشؔ نے عشاق کے احساسات وتاثرات کے ساتھ ساتھ محبوب کے عظمت واحترام کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ ان کے کلام میں حسن اور عشق دونوں کا برابر احترام موجود ہے۔ انھوں نے اگر عشق کو خودداری بخشی تو حسن کو بھی ذلیل ورسوا نہیں ہونے دیا۔ رکاکت وجنسی خواہش ان کے یہاں کہیں نہیں ملتی۔ وہ سستی جذباتیت کے قائل ہی نہ تھے بلکہ ہجر میں بھی ان کو وصل ہی جیسا لطف ملتا تھا یہ ان کے حسن کا اعلیٰ تصور تھا۔ وہ حسن کے پرستار اور اداشناس تھے۔ ان کے کلام میں محبت وعشق کا پاکیزہ سلیقہ رسم عاشقی کی تہذیب کی بلندی اور جذب و مستی اور خواب وحقیقت کی ایک حسین آمیزش ہے۔ اس قول کے جواز میں موصوف کی کئی غزلیں پیش کی جاسکتی

ہیں لیکن طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اے حسن بے پناہ تجھے خود خبر نہیں
کیا کیا ستم کیئے تیری نیچی نگاہ نے(۱۳۴)

وہ اک تابناکی جو ہیروں میں ہے
کسی کے لبوں کی لکیروں میں ہے(۱۳۵)

ہیں اس میں جذب کتنے غم کے دریا
ان آنکھوں کا سمند بولتا ہے(۱۳۶)

زندگی ڈوب گئی درد کی لے میں ورنہ
گنگناتی تھی کبھی یہ تیری پائل کی طرح(۱۳۷)

ہر اک ادائے ناز پہ قربان جایئے
اس چشم نیم باز پہ قربان جایئے(۱۳۸)

عرشؔ کی شاعری اسی طرح کے خوبصورت گلدستوں کا مجموعہ ہے جس میں غم، خوشی، مسرت، جستجو، کسک، ہجر، وصل جیسے خیالات کی عملی صورت ملتی ہے۔ وہ غزل کے بندھے ٹکےاور روایتی انداز کے پابند نہیں رہے بلکہ ان کی غزل میں نیا لسانی تجربہ بھی موجود ہے۔ان کی غزل اپنے اندر ہی غزل کا بام عروج ہے۔ پروفیسر قدس جاوید کی رائے اپنی کتاب ’’ادب کے معمار جموں، کشمیر اور لداخ‘‘ میں لکھتے ہیں:

عرشؔ صہبائی محض غزل کی روایات و رسومات ہی کی نہیں، 1960ء کے بعد اردو غزل میں ہونے والے موضوعاتی، لسانی اور فنی اختراعات و اجتہات کی بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ان کی غزلوں میں ایجاج و اختراع کے عناصر نمایاں ہیں۔عرشؔ صہبائی کی غزل گوئی کے کئی امتیازات ایسے ہیں جو ان کی غزل سے ہی مخصوص ہیں۔ مثلاً عرشؔ صہبائی غزل کے فن کے ساتھ ساتھ غزل کے آداب کا بھی شعور رکھتے ہیں، غزل گوئی کے بنیادی رجحانات حسن وعشق، تصوف و اخلاق اور آزادروی کو عرشؔ صہبائی نے بھی برتا ہے لیکن اپنی شرطوں پر عرشؔ صہبائی غزل گوئی پر کسی بھی پہلو سے تقلید اور پیروی کی اثر انگیزی کا بھی الزام نہیں دھرا جا سکتا۔ عرشؔ صہبائی غزل کہتے ہی نہیں غزل جیتے ہیں لیکن زندگی جینے کی طرح غزل جینے کا بھی ان کا انداز سادہ و پاکیزہ ہے۔ان کے غزلیہ اشعار حسن وعشق سے بھی سرور کار رکھتے ہیں کیونکہ تغزل کا تقاضہ ہے لیکن ایسے اشعار میں بھی اپنے شاعرانہ وجود اور غزل کی حرمت پر آنچ نہیں آنے دیتے۔‘‘(۱۳۹)

عرشؔ کے یہاں حسن وعشق کا بھی اپنا الگ معیار ہے۔ اگرچہ حسن وعشق دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل اہمیت رکھتے ہیں مگر ہر شخص کا معیار حسن فطری طور پر مختلف ہوتا ہے اور فطرت اپنے معیار بلند کی جستجو میں رہتی ہے اور جب اتفاق سے وہی چیز سامنے آجاتی ہے تو دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھتی ہیں اور اسی تطابق حسن و عشق سے دونوں کا فطری رنگ نکھر آتا ہے۔ حسن کی اپنی ایک مختلف حیثیت صحیح لیکن عشق بھی ایک طرح کا غیر معمولی اندرونی تجربہ ہے جس کا تجزیہ کرنے کی بہتوں نے کوشش کی ہے۔ بقول عرشؔ:

عشق کیا ہے ؟ اک بحر بیکراں

حسن کیا ہے ؟ اک مشت خاک ہے

حسن گل و لالہ ہو یا نور مہ و انجم

اس عالم فانی میں ہر نقش خیالی ہے(۱۴۰)

عرشؔ ازل سے حسن پرست تھے لیکن ان کے یہاں عشق کا لفظ بھی نئے معنی پیدا کر لیتا ہے۔ عرشؔ جب 'عشق' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس کے معنی روایتی عشق یعنی محض محبوب سے عشق نہیں بلکہ اپنے مقصد سے عشق ہے۔ ان کے یہاں عشق وہ آرزوئے مسلسل ہے جو آدمی کو نت نئی منزلوں تک لے جاتی ہے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

جیا جب مانع گفتار ہوگی عشق و الفت میں

کسی کی نیم وا آنکھوں سے شرح آرزو ہوگی (۱۴۱)

ہم جنہیں اپنا سمجھتے تھے پرائے نکلے

جذبہ عشق کی تاثیر پہ رونا آیا(۱۴۲)

جنس الفت کی وہ ارزانی ہوئی

عشق کی سب آب روپانی ہوئی(۱۴۳)

کم سے کم عشق میں یہ بات تو ہو جاتی ہے

زندگی خوگر آفات تو ہو جاتی ہے(۱۴۴)

تمہیں بھی عشق کے آداب کا کچھ پاس تو ہوتا

ہمیں رسم وفا کی ابتدا کرتے تو کیا کرتے (۱۴۵)

عرشؔ عشق کو زندگی کی ایک حقیقت مانتے تھے۔ یہ باعث آزار نہیں بلکہ ایک لازوال مستی و سرشاری عطا کرتا ہے۔ عشق دردلا دوا سہی لیکن سو دردوں کی ایک دوا بھی ہے۔ اسی کے دم قدم زندگی میں لطافت ورنگینی و دلکشی قائم ہوتی ہے، اسی سے زندگی میں توانائی اور اس کے تصورات میں وسعت پیدا ہوتی ہے، اسی سے ویرانے سے بہار کا سا عالم پیدا ہوتا ہے اور اسی کی بدولت انسان اندھیرے سے اجالے کا سفر طے کرتا ہے۔ عرشؔ کے نزدیک عشق کے بغیر زندگی کی حقیقت بے معنی ہے اور جس کے دل میں عشق کی کسک نہیں اس کا زندہ رہنا نہ رہنا ایک سا ہے۔ عرشؔ صہبائی کی شاعری ان کی روح کی آواز ہے۔ انہوں نے اپنی غزل کو عامیانہ و بازاری عشق کی بندگلی سے نکال کر حیات و کائنات کے کثیر پہلو مسائل کی روشن شاہرہ پر لانے کی سعی کی ہے۔ ان کے چند اور اشعار ملاحظہ کریں:

کم نظر محدود کرتے ہیں اسے
عشق کی ورنہ ہیں تقریریں کئی (۱۴۶)

آغاز محبت ہی میں دشمن تھا زمانہ　　انجام محبت کا گلہ کس سے کریں ہم ؟
بے چین ہیں نظریں تو پریشان ہے دل بھی　　آزار محبت کا گلہ کس سے کریں ہم؟ (۱۴۷)

محبت میں حیات نو کی یوں تشکیل ہوتی ہے　　ادھر ارشاد ہوتا ہے ادھر تکمیل ہوتی ہے
نہ دو لب ہائے نازک کو عبث تکلیف جنبش کی　　نگاہوں سے بھی اکثر بات تفصیل ہوتی ہے
ہزاروں رنگ بھرتے ہیں جہاں والے مگر پھر بھی　　محبت کی حکایت تشنہ تکمیل ہوتی ہے (۱۴۸)

الفت و محبت بھی ایک فطری اور مجازی جذبہ ہے جس سے کسی بھی انسان کا متاثر ہونا فطری ہے کیوں کہ پیدائش آدم سے لے کر تا قیامت تک ہر انسان کے اندر ان جذبات کی فراوانی رہے گی۔ اس سلسلے میں کہتے ہوئے عرشؔ نے بڑے عالمانہ و سنجیدہ طرز اظہار کو خاطر میں لایا ہے۔ ان اشعار سے آپ از خود اندازہ لگا سکتے ہیں:

ہوگئی ہے اک ستم گر سے محبت دیکھئے　　رنگ لائے کیا مرا حسن عقیدت دیکھئے
رنج ملتا ہے ہمیں اس میں کہ راحت دیکھئے　　کون سا پہلو بدلتی ہے محبت دیکھئے
پھول سے عارض پہ یہ شرم و حیا کی سرخیاں　　ان کی آنکھوں میں ذرا جوش محبت دیکھئے (۱۴۹)

خود سے ملے ہیں تو یہ احساس ہوا ہے　　مدت میں کسی چاہنے والے سے ملے ہیں
کتنے ہی سراغ اس میں ملے مہر و وفا کے　　جس دل میں محبت کے شوالے سے ملے (۱۵۰)

ہم ان کی محبت میں یہ کیا دیکھ رہے ہیں   ہر درد کو پہلے سے سوا دیکھ رہے ہیں

ہم دیکھنے والوں کی ادا دیکھ رہے ہیں   ہونٹوں میں تبسم تو نگاہوں میں شرارت

ہم غم میں مسرت کی ضیا دیکھ رہے ہیں(۱۵۱)   معراج محبت کا یہ اعجاز ہے شاید

یہ سب اشعار ان کے معیارِ سخن پر روشنی ڈالتے ہیں۔ محبت اختیاری مضمون یا شعوری احساس نہیں بلکہ کوئی کہیں بھی اس کا اسیر ہوسکتا ہے۔ انسان جب جذبہ محبت سے ہمکنار ہوتا ہے تو اسے دنیا کی ہر چیز میں محبت جھلکتی نظر آتی ہے۔ محبت حسن ہے خوبصورتی ہے۔ اسے تمام کائنات خوبصورت نظر آنے لگتی ہے۔ محبوب کے حسن کے علاوہ ساری دنیا اور آپ اپنی ذات بھی نکھار آنے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ عرشؔ لکھتے ہیں:

آنکھوں سے محبت کا اکثر اظہار بھی ہوتا رہتا ہے

انکار بھی کرتے رہتے ہیں اقرار بھی ہوتا رہتا ہے

وہ ترک محبت کا ہم سے اظہار بھی کرتے رہتے ہیں

اس پر یہ ستم گاہے گاہے دیدار بھی ہوتا رہتا ہے

تم اپنی جفائے پیہم سے مایوس بھی کرتے رہے ہو

شرمیلی نظر سے جینے کا اصرار بھی ہوتا رہتا ہے

ہم ایسے خاک نشینوں سے مانا وہ بیزار سہی

در پردہ محبت کا لیکن اقرار بھی ہوتا رہتا ہے(۱۵۲)

محبت وہ جذبہ ہے کہ جب انسان کو اپنی گرفت میں لے لے تو اسے محبوب سے زیادہ حسین اور مکمل کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ محبّ اپنے حسن انتخاب پر ہمیشہ نازاں رہتا ہے۔ اگر محبوب میں کوئی خامی ہو تو وہ دوسروں کو تو دیکھائی دے جاتی ہے لیکن محبّ اس اس طرف سے بے نیاز ہوتا ہے بلکہ اگر اسے محبوب کی اس خامی کا احساس بھی دلا یا جائے تو وہ اس بنا پر بھی اس کی محبت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ محبّ ہمیشہ ہی محبت کرتا اور جواب میں محبت کا تقاضا کرتا ہے لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے اسے محبوب کی چاہت اور وفا کی طلب نہیں رہتی بلکہ محبوب کے جذبے اور رویے میں تغیر سے عدم واقفیت کی بنا پر وفا و محبت کی اسی روش پر قائم رہتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اب محبت کیجئے یا ترالفت کیجئے

آپ کی مرضی ہے جو چاہے طبیعت کیجئے(۱۵۳)

الفت شکیب دل بھی ہے بار گراں بھی ہے
وجہ قلق بھی ہے کبھی تسکین جاں بھی ہے(۱۵۴)

آپ ناداں ہیں محبت کو سمجھ رکھا ہے کھیل
چوٹ کھانے کا رادہ ہے تو دل پیدا کریں(۱۵۵)

نہ امید کرم ان سے نہ امید وفا ان سے
مگر پھر بھی ہے اک مدت سے قائم رابطہ ان سے

یہی اپنی محبت ہے یہی اپنی عبادت ہے
وہ ہم سے ہوں جدا لیکن نہ ہونگے ہم جدا ان سے(۱۵۶)

عرشؔ کی غزل میں محبت میں آنے والے تمام نشیب وفراز اور مصائب آلام سے آشنا ہے۔نرمی گداز اور لطافت احساس نے ان کی غزل کوغم جاناں کا بیان ہو یاغم جہاں کا سخت گیری سے دور رکھا ہے۔ان کی غزل میں رواں زندگی کے تجربات عمومیت اور تاثیر کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں۔عرشؔ الفاظ کا استعمال بڑی باریک بینی سے کرتے تھے۔الفاظ کے انتخاب کی صورت کوئی بھی ہواس سے انکارنہیں کیا جاسکتا کہ جب انسان اپنی ذات کے اظہار کے لئے وسیلے ڈھونڈتا ہے تو سب سے بڑا ذریعہ زبان ہی ہے۔اب یہ تخلیق کار کی استعداد اور صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ زبان کو کس انداز سے استعمال کرتا ہے۔عرشؔ بھی سیدھے سادے الفاظ میں بڑی پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔محبت اور محبت کرنے والوں کے وہ ہم نوا تھے۔انہوں نے محبت وخلوص کے اس طرح بھی جامہ پہنایا ہے:

برابر دیکھتی رہتی ہے انداز محبت سے
بہت ہی مختلف تجھ سے تیری تصویر ہوتی ہے(۱۵۷)

دل و نگاہ میں ایسے اتارتا ہے مجھے
وہ اپنے نام سے اکثر پکارتا ہے مجھے(۱۵۸)
زندگی گزرتی ہے اس کی تنگ دستی میں
دل فقط محبت کا کاروبار کرتا ہے(۱۵۹)

مذاق عشق دنا کی نظر میں پست ہو جاتا
بھری محفل میں ان کا تذکرہ کرتے تو کیا کرتے (۱۶۰)

اردو شاعری میں وفا، وفاداری، و بے وفائی کا جذبہ ہر شاعر کیلئے اہم رہا ہے۔ اسے عاشقوں کے لئے وصف خاص تصور کیا جاتا ہے اور عاشق تمام زندگی اسی اصول کا پابند بھی رہتا ہے۔ دوسری طرف محبوب عجمی شعری روایت کے تحت ہر جائی، بے وفا و جفا کار ہوتا ہے۔ قدیم اردو شاعری میں شاعر گھریلو عورت کی نفسیات سے آگاہ نہ تھے۔ ان کے سامنے تو فارسی شاعری تھی جن سے انہوں نے محبوب کا تصور اپنایا یا پھر عورت کا تصور انہوں نے گھر کے باہر کی زندگی سے لیا۔ اس طرح گھر سے باہر کی عورت کو طوائف کا خطاب ملا اور اس وقت کی تہذیبی زندگی کا اہم کردار بن گئی۔ یوں طوائف کی خصوصیات کو پوری دنیا پر منطبق کر دیا گیا۔ بے وفائی اور خطا کاری اس کے پیشہ اور کردار کا حصہ ہیں۔ یہی بے وفائی، التفاتی، تغافل کو شاعر نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے لیکن یہاں تک عرشؔ کی شاعری کا تعلق ہے ان کی شاعری میں وفا کا بے وفائی کا تصور پرانی روایتوں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ محبوب کو بے وفا ہونے پر بھی اسے بے وفائی کا خطاب نہیں دیتے بلکہ اسے تہذیب کا حصہ قرار دیتے ہیں کہ جب زمانے میں ہر جانب بے وفائی کا دور دورہ ہو تو پھر محبوب بھی اس روایت میں آ جائے تو اسی کیونکر بے وفا کہا جائے۔ ملاحظہ ہو:

ہم جو رسوا ہوئے اس میں تری تقصیر نہیں عشق بجتا ہوا اک ساز ہے کوئی تصویر نہیں
ایسی دنیا سے تو انسان کنارا کرلے جس میں جذبات محبت کی بھی توقیر نہیں (۱۶۱)

تمہاری بے وفائی کا گلہ کرتے تو کیا کرتے
زمانہ بے وفا تھا تم وفا کرتے تو کیا کرتے (۱۶۲)

آپ کی ہر ادا اچھی لگی وہ وفا تھی یا جفا اچھی لگی
بارہا اس کی وفا آئی نہ راس بارہا اس کی جفا اچھی لگی (۱۶۳)

عرشؔ کی شاعری ان کے خون جگر کی تخلیق ہے۔ ان کا انداز بیان ہی ان کی سب سے بڑی انفرادیت ہے۔ انہوں نے حسن و عشق، ہجر و وصال، محبت و نفرت اور درد و غم جیسے جذبات کو اپنی غزلوں میں ایسے پیش کیا ہے کہ یہ موضوعات نئے نہ ہوتے ہوئے بھی نئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں لفظ و معنی میں ایک خاص قسم کا ربط دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً یہ غزل دیکھیں:

آپ ملتے ہیں مگر اہل عداوت کی طرح   یہ ادا دل پہ گزرتی ہے قیامت کی طرح
رات دن تازہ مصائب کی فراوانی ہے   زندگی مجھ سے ہے برہم مری قسمت کی طرح
اس پہ قائم بھی رہیں وہ یہ ضروری تو نہیں   ان کی ہر بات ہے اقرار محبت کی طرح
رک گئیں میری نگاہیں یہیں آکر ورنہ   صورتیں اور بھی ہیں آپ کی صورت کی طرح
غم بھی لازم ہیں بہت اہل محبت کے لئے   دل کی دنیا کو سجاتے ہیں یہ جنت کی طرح
تیری یادوں نے بنایا ہے اسے تاج محل   دل تھا ورنہ کسی گمنام سی تربت کی طرح
وہ حقیقت میں محبت سے بھی پاکیزہ ہے   ہم نے رکھا ہے جسے دل میں محبت کی طرح (۱۶۴)

مندرجہ بالا اشعار میں عرشؔ کے فنی کمالات کا بہترین جواز موجود ہے۔انہوں نے ایک ہی غزل میں محبوب کے حسن و جمال اور احسات محبت وغم کی عکاسی بڑے لاجواب انداز میں کی ہے۔ان کے کلام میں اس طرح کی بے انتہا مثالیں موجود ہے۔علاوہ عزیں عرشؔ کی غزل میں انسانی عظمت اور انسانیت کا تصور بھی ان کی انفرادیت کا ضامن ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ عرشؔ ایک آزاد منش غزل گو شاعر تھے اور ان کو سیاست سے عملی طور پر دور دور تک کوئی واسطہ نہیں رہا لیکن ان کے دور میں جو بہیمانہ حرکات ہوئے ان سے انہوں ں چشم پوشی بھی نہیں کی ان کو ان بہیمانہ حرکات پر جس میں تقریباً ہر فرقے کے لوگ ملوث تھے انتہائی افسوس رہا اور ان انسانیت سوز حرکات کا اثر ان کی شاعری اور زندگی دونوں پر پڑا۔انہوں نے اس جہل خرد کے دور میں ''انسان اور انسانیت'' کی تلاش کی لیکن کوئی اللہ کا بندہ نہ ملا جسے وہ اپنے معیار پر انسان کہتے اسی لئے انہوں نے کہا:

ہزاروں خوبیاں انساں میں ہوں گی
مگر انسانیت اس میں کہاں ہے(۱۶۵)

جب پڑے واسطہ کھلتی ہے حقیقت اس کی
ظاہراً آدمی اخلاص کا پیکر ہی سہی(۱۶۶)

پی رہا ہے دہر میں انسان انساں کا لہو
جور انساں کی مگر کس سے شکائت کیجئے(۱۶۷)
عرشؔ انسان ہے انسانیت سے دور بہت
وقت آنے کو ہے اس سے بھی برا لگتا ہے(۱۶۸)

ہے اس پر ناز یہ انسان ہیں ہم
مگر انسانیت سے دور کتنے(۱۶۹)

عرشؔ انساں کی کیا کروں تفسیر
جسم زندہ ضمیر مردہ ہے (۱۷۰)

صرف انسانیت سے ان کا کوئی ربط نہیں
ورنہ دیکھنے میں دور تک ہیں انسان کئی(۱۷۱)

آج انسان کی پہچان بڑی مشکل ہے
آج انسان ہے اوڑے ہوئے کتنے چہرے(۱۷۲)

مندرجہ بالا اشعار عصر حاضر کی زبوں حالی کا بہترین منظر نامہ پیش کرتے ہیں ۔ان کے یہ اشعار دور حاضر کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں ۔انسانی عظمت کا تصور ان کے ذہن میں بہت بلند تھا۔ان کے خیال میں انسان کی عظمت اس میں تھی کہ وہ اپنے روشن دل و دماغ سے ''انسان اور انسانیت'' کے متعلق کھلی فضا میں غور و فکر کرے۔ان کے نزدیک انسان کا انسان ہونا ہی اسکی معراج ہے اور اگر انسان اپنے دل کو شائستہ اسرار بنا لے تو فطرت کے خاموش لب بھی بولنے لگیں گے۔عرشؔ لکھتے ہیں:

انسان کی نظر اتنی بھی باریک نہیں — یہ کہہ سکے کیا ٹھیک ہے کیا ٹھیک نہیں
حیرت ہے اس ماحول سے وابستہ ہوئے ہم — جس سے کسی بھی بات کی تحریک نہیں
انسان کو انسان سے تعلق نہیں کوئی — اس بات سے بڑھ کر کوئی تضحیک نہیں(۱۷۳)

عرشؔ ہو جائے اگر بیدار انسان کا شعور
پھر کبھی وہ بھول کر بھی مائل عصیاں نہ ہو(۱۷۴)

لوگ کہتے ہیں جسے انسانیت
آج کے دور میں نایاب ہے(۱۷۵)

اللہ رب العزت نے انسان کو اشرف المخلوق بنایا ہے لیکن آض کا انسان اپنی اس معیار سے گر کر ایسی پستیوں میں جا پہنچا ہے کہ اسے خبر ہی نہیں کہ وہ خود کیا ہے اور دوسری مخلوقات کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔عرشؔ نے اپنے کلام میں انسان کی اصل حقیقت تک پہنچنے کی تحریک موجود ہے۔ان کا خیال تھا کہ انسان کے دل میں

سب کچھ یہاں تک کونین بھی پوشیدہ ہے اور اگر وہ چاہے تو یہ سارے اسرار اس پر کھل جائیں لیکن یہ کام بے حد دشوار ہے اور ہر شخص کے بس کا نہیں ہے۔ انسانی عظمت کے تصور کے متعلق ان کے چند اشعار ملاحظہ فرما کر دیکھئے کہ ان کے ذہن میں انسان کی عظمت کا تصور کس قدر بلند و بالا ہے:

دنیا میں کوئی در بھی ہو یہ سجدہ نشیں ہے   انسان کو انسانیت کا پاس نہیں ہے
جس شخص میں خوداری کا احساس نہیں ہے   وہ زندگی میں موت سے کس درجہ قریں ہے(۱۷۶)

\کل گوارہ نہیں کرتا تھا جسے میرا سماج
آج تہذیب کے پردے میں وہ سب ہوتا ہے(۱۷۷)

ہزروں سال دہراتی ہے دنیا جس کے افسانے
وہ خود انسان نہیں انسان کا کردار ہوتا ہے(۱۷۸)

پڑتی ہے صاف گوئی کی عادت بدیر عرشؔ
انسان ابتدا میں جھجکتا ضرور ہے(۱۷۹)

کس کو انسانیت کی ہے پہچان
کس کو اب صاحب نظر کہیے(۱۸۰)

دل کو سکوں ہوتا ہے انسان کو حاصل
جب تک وہ اخلاص کا پیکر رہتا ہے(۱۸۱)

مندرجہ بالا ان اشعار کے علاوہ بھی اس سلسلے میں کئی ایسے اشعار ہیں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ عرشؔ صہبائی کے کلام کے مطالعے کے بعد ایک عام قاری بھی اس بات کو تسلیم کرے گا وہ بہت حساس شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں اپنے عہد کا سیاسی، سماجی اور معاشی نظام قطعی پسند نہیں علاوہ ازیں وہ جس ماحول میں رہے اس میں نئی سیاسی، سماجی، معاشی تبدیلیوں کی انہوں نے جم کر مخالفت کی۔ وہ اپنی ریاست میں سیاسی ماحول ستائے ہوئے تھے اس لئے انہوں نے اپنے عہد کے سیاسی نظام پر حد سے زیادہ طنز یہ نشتر چلائے ہیں۔ وہ سیاست دانوں کو رہبر کم رہزن زیادہ تصور کرتے تھے اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں بلکہ حقیقت میں آج کے سیاسی نظام

کی یہی صورت حال ہے۔ان کے مطابق سیاست داں محض اپنے ذاتی مفاد کی بنیاد پر لوگوں کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیتے ہیں اور پھر یہ تفریق آہستہ آہستہ فسادات کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس سے سارا سماجی و معاشی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔عرشؔ صہبائی کو ان کے نظام جمہور میں عام انسان خوف زدہ اور سہا ہوا دیکھائی دیتا تھا جس کے اشارے ان کے کلام میں دیکھئے جا سکتے ہیں۔موصوف ظلم و ستم،مکاری و فریب،مفلسی و تنگ دستی، جنگ و جدل اور فسادات وغیرہ کا سبب سیاسی رہنماؤں کو ٹھہراتے تھے۔ملاحظہ ہو:

تنقید وہ بھی اہل سیاست کی ذات پر
کیا کر رہے ہیں آپ ذرا ہوش کیجئے(۱۸۲)

میرے وطن میں سلامت ہیں جب سیاست داں
میرے وطن سے کبھی مٹ نہ سکے گی غربت کیا؟(۱۸۳)

انسان سے انسان کی قربت نہیں ممکن
جب تک یہ سیاست کا اثر ختم نہ ہوگا(۱۸۴)

جو سیاست کی دین ہیں اے عرشؔ
وہ اندھیرے مہیب ہیں کتنے(۱۸۵)

یہ سیاست داں کردیں گے اسے تقسیم عرشؔ
ایسی صورت میں کہاں ہندوستاں باقی رہا(۱۸۶)

ہے کون سی نعمت جو سیاست میں نہیں عرشؔ
افسوس کسی کا کوئی کردار نہیں ہے(۱۸۷)

کیا خوب ہے یہ اہل سیاست کا کرشمہ
تعمیر نہیں کوئی بھی معمار بہت(۱۸۸)

مندرجہ بالا اشعار حقیقت پر مبنی ہیں۔آج ملک کی یہی صورت حال ہے۔ملک کی آبادی کے ایک تہائی حصہ کو چھوڑ کر باقی ملک بھر میں غربت و تنگ دستی گی ہی صورت حال ہے۔عام مزدوروں اور کسانوں کی

آواز جیسے دب کر رہ گئی ہو۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی رہنماؤں نے اپنے ذاتی مفادات اور چالوں کی بدولت ملک کو تباہی کے دہانے پہنچا دیا ہے۔عرشؔ کو اس بات کا شدت سے افسوس تھا۔وہ لکھتے ہیں:

ان اہل سیاست کی ہر بات نرالی ہے
باتیں ہیں ثوابوں کی رشتہ ہے گناہوں سے(۱۸۹)

بڑی عجیب سی مخلوق ہیں سیاست داں
یہ لوگ وہ ہیں کہ جن کا کوئی اصول نہیں(۱۹۰)

عبث نہ اہل سیاست کو کیجئے بدنام
یہ خون پیتے ہیں لوگوں کا بادہ خوار نہیں(۱۹۱)

اگرچہ اہل سیاست ہیں ماہر گفتار
مگر یہ رکھتے ہیں کردرار مجرمانہ سا (۱۹۲)

کچھ شک نہیں کہ اہل سیاست ہیں تیز تر
سو عیب ڈھوڈ لیتے ہیں یہ بے گناہ میں(۱۹۳)

کہہ نہیں سکتے کہ ہندوستان کا کیا انجام ہو
عرشؔ یہ اہل سیاست کے کرم کی زد میں ہے(۱۹۴)

کتنے خوبصورت ہیں رنگ یہ سیاست کے
جانفزا ہیں تقریریں فعل مجرمانہ ہے(۱۹۵)

عرشؔ صہبائی کے دل میں سیاست دانوں کی نفرت سے کہیں زیادہ اپنے وطن اور اس میں رہنے والے لوگوں سے محبت تھی۔وہ اپنے ملک میں امن واماں کے سچے پرستاروں میں سے تھے۔امن و مان خوشحال زندگی کی بنیاد ہے۔اگر زندگی کا ماحول اس سے وابستہ نہ ہو تو زندگی میں ہر لمحہ بکھراؤں سا رہے گا۔آج ہم خود اس صورت حال سے گزر رہے ہیں۔آج امن وامان کی ضرورت عالمی سطح پر ہے۔ہر انسان کا تعلق ایک مخصوص جگہ

سے ہوتا ہے اس لئے اس کی سوچ اس محدود جگہ تک قائم رہتی ہے۔ جب ہم عرشؔ صہبائی کے کلام کا جائزہ لیتے تو قدرتی طور پر ان کے کلام میں وہاں کے حالات کا رعکس نظر آتا ہے۔ عرشؔ عالمی سطح کے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں لیکن وہ جس ماحول میں رہتے ہیں اسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کرتے کیوں کہ وہ ماحول ان کی زندگی میں جذب ہے اسے کسی صورت بھی وہ فراموش نہیں کر سکتے۔ اس وقت جن حالات سے ہم دوچار ہیں اس میں امن وامان دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی قیمت پر انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یوں تو کشمیر کے حالات پر کئی اشعار عرشؔ کے کلام میں ملتے ہیں لیکن اہل کشمیر کے موجودہ حالات کی بہترین عکاسی ان دو اشعار میں ہی واضح ہو جاتی ہے:

چپ ہیں یہ جمہوریت کے نام پر
لوگ ورنہ زندگی سے تنگ ہیں(۱۹۶)

زندگی کا نظام بہتر ہو
عرشؔ ایسی کوئی امید نہیں(۱۹۷)

دور تر ہو اگر سیاست سے
کتنا بہتر نظام ہو جائے(۱۹۸)

کشمیر کے ماحول کی اس سے بہتر عکاسی کیا ہوگی۔ آج وادی میں قدم رکھنا تو دور کی بات اس کے تصور سے بھی دل دہل جاتا ہے یہاں اس کی تفصیل کا محل نہیں کہ یہ ماحول کس کے باعث ہے اگر شاعر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے تو ظاہر ہے حالات کتنے سنگین ہیں۔ ملک کی دوسری ریاستوں کے لوگ وہی جانتے ہیں جو انہیں شوشل میڈیا اور خبروں کے ذریعے دکھایا جاتا ہے۔ آج خبروں میں دکھایا جانے والا سچ جھوٹ سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا ہے۔ بقول عرشؔ:

ہے یہ جمہوریت کا فیض، انسان
زبان رکھتے ہوئے بھی بے زباں ہے(۱۹۹)

اب وطن میں رہ گیا کچھ بھی نہیں
وہ سمجھتے ہیں ہوا کچھ بھی نہیں(۲۰۰)

بگڑی ہوئی ہے دنیا کی ہوا دیکھ رہے ہیں
ہم ہر قدم اک حشر بپا دیکھ رہے ہیں(۲۰۱)

جہاں امن وامان کی یہ صورت ہوگی وہاں کی زندگی کیا ہوگی اس کا اثر انسانیت پر بھی پڑے گا کیوں کہ انسانیت انسان سے جڑی ہوئی ہے۔اس بات کی ضاحت کی قطعاً ضرورت نہیں کہ امن پرستی اور وطن پرستی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔جوکوئی بھی وطن پرست ہوگا وہ وطن میں امن وامان کے خواب دیکھئے گا اور امن وامان کے ماحول میں زندگی بسر کرنا چاہے گا۔ایسا انسان انسانیت پرست بھی ہوگا یعنی امن امان،وطن پرستی اورانسان دوستی کا آپس میں بہت گہرا رشتہ ہے۔اگر ایسا ممکن نہیں تو تینوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ہم نمونے کے طور پر یہاں عرشؔ کی غزل کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں جو وطن پرستی کے متعلق کہے گئے ہیں۔ان میں بھی ان کا انداز سب سے منفرد ہے۔ملاحظہ ہو:

عرشؔ جب تک ہندو مسلم یہاں ہیں متحد
با بیکا نہیں کر سکتا کوئی کشمیر کا(۲۰۲)

دشت غربت میں جو آئی ہے کبھی یاد وطن
پھوٹ کے روئے ہیں ہم پاؤں کے چھالوں کی طرح (۲۰۳)

عرشؔ صہبائی ایک سچے محبّ وطن تھے انہیں اپنے ملک ہندوستان سے بے حد محبت ہے۔

خیال خام ہے یہ بے بس و نخیف ہیں ہم ہمارے خون میں حرکت بھی ہے حرارت بھی
ہمارے عزم میں اک پختگی نمایاں ہے دلوں میں جوش بھی ہے جذبہ شہادت بھی (۲۰۴)

جذبہ حب الوطنی اردو غزل میں نیا نہیں لیکن عرشؔ کے یہاں ایک نئے اور انوکھے انداز کے ساتھ موجود ہے ان کی ایک غزل پیش کرتے ہیں جو نظم نما ہے اور وطن پرستی سے جڑی ہوئی ہے:

وہ اک چراغ ہے دنیا کی انجمن کے لئے جو اپنی جان فدا کر گئے وطن کے لئے (۲۰۵)

یہاں وطن پرستی کی جو تشریح کی گئی ہے اس کی جس قدر داد دی جائے کم ہے اور یہ حقیقت ہے کہ وطن پر مٹنے والے دنیا کی انجمن کے لئے ایک چراغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔یہ جذبہ کسی صورت میں بھی محدود نہیں۔انہوں نے دنیا کی انجمن کے لئے چراغ کہہ کر اس جذبے کو عالمی سطح پر حاوی کر دیا ہے۔ان کے اس مطلع سے وطن پرستی کے جذبے کو عظمت ملتی ہے۔غزل کے دوسرے اشعار پیش ہیں:

انہیں کی نذر ہے میرا سلام شوق و نیاز   ہوئے شہید جو آزادی وطن کے لئے
رہے گا اب نہ کوئی جور مفلسی کا شکار   خبر یہ لایا ہوں ارباب انجمن کے لئے
رہے یہ ہندو مسلم کے پیار کا مرکز   دعائیں کرتا ہوں دن رات یہ وطن کے لئے (۲۰۵)

یہ دعائیں سب کے دل سے نکلتی ہیں۔ پیار زندگی ہے اور یہ وہ امر ہے جس سے انسان کی پہچان ہوتی ہے۔ یہ شعر ہندو مسلم دونوں طبقات کو آپس میں محبت سے رہنے کے جواز پر مبنی ہے۔ یہ شعر ہی نہیں بلکہ پوری غزل وطن پرستی اور امن و امان کے جذبے کو لئے ہوئے ہے۔ باقی اشعار اس طرح ہیں:

وہ آج دیکھتے اے کاش حسن لالہ و گل   جو زندگی میں ترستے رہے چمن کے لئے
ہر اک میں جو ہر انسانیت ضروری ہے   لباس جس طرح درکار ہے بدن لے لئے
رہے ہیں اور رہیں گے اس پہ ہم قائم   وطن ہمارے لئے ہے تو ہم وطن کے لئے
وطن کا درد نہیں جس بشر کے سینے میں   وہ اک داغ ہے پیشانی وطن کے لئے
بس اب تو عرشؔ ہمارا یہی عقیدہ ہے   جئیں وطن کے لئے مریں وطن کے لئے (۲۰۶)

عرشؔ صہبائی کی انفرادیت کا ایک اہم جزیہ بھی ہے کہ ان کے کلام میں ریا کاری، ذات پات اونچ نیچ اور قومی تعصب کی ہلکی سی پرچھائیاں بھی نظر نہیں آتیں۔ انہوں نے اپنی شاعری بالخصوص غزلوں میں یہاں ساست دانوں پر نشانے سادے ہیں وہیں سماج کے ان بڑے مذہبی ٹھیکیداروں کے خلاف بڑے شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے جو مذہب اور قوم کے نام فسادات کرواتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں مذہب کے بڑے دعویداروں پر شدید طنز دیکھنے کو ملتی ہے۔ عرشؔ مذہب سے زیادہ انسایت کا پاس رکھتے تھے جو آج کے نسل میں نہ کے برابر ہوگئی ہے۔ انہیں اس بات کا بہت دکھ محسوس ہوتا تھا کہ جس سماج کو ان کے جیسے لوگوں نے پروان چڑھایا ہے آج وہ کس مقام کو پہنچ چکا ہے۔ وہ اپنے ملک، سماج اور معاشرے کو امن و امان کے ساتھ ترقی کی طرف جاتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے لیکن ان کے یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں ہر اس پہلو کو موضوع سخن بنایا جو عوام کے اندر آپسی اتفاق و بھائی چارے، امن و امان اور حب الوطنی کے جذبے کو پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ مثال کے لئے ان کی یہ اشعار دیکھئے:

وفا پرستی اگرچہ ہمارا شیوا ہے   کسی بھی ظلم کے آگے نہ جھک سکیں گے ہم
وطن پرست ہیں اپنے وطن کی خاطر ہم   خوشی کے ساتھ ہر اک شے نثار کردیں گے
ہم اپنے فرض کو اچھی طرح سمجھتے ہیں   وطن کی مانگ میں ہم اپنا خون بھر دیں گے (۲۰۷)

عرشؔ کی غزلیہ شاعری پیامی شاعری حیثیت رکھتی ہے۔اپنی شاعری کے ذریعے سے انہوں نے قوم و ملت بلکہ انسانیت کو صحیح راستے پر لانے کی کوشش کی ہے۔ان کی غزلیہ شاعری میں امن وآشتی،وطن پرستی،سماجی نا برابری،معاشی استحصالی،فرقہ پرستی،اخلاقی تنگ نظری حرص وحوس وسیاسی منافقت وغیرہ کی عکاسی بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ کی ہے۔وہ خود انسانیت پرست انسان تھے۔ان کو آدمی کے پاس انسانیت کے علاوہ ہر چیز کے ہونے اور آدمی سے آدمی کے حق کے نہ ادا ہونے کا انہیں بہت افسوس رہا جس کا اظہار ان کی شاعری میں جگہ جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ان کے مندرجہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عرشؔ اپنے زمانے کے انسان اور انسانیت سے کس قدر مایوس تھے۔سب کچھ تھا لیکن انسانیت نہیں تھی جس کا انہیں افسوس تھا کہ ان کو ایسے انسان ہی نہیں ملے جن کو اپنے معیار کے مطابق انسان کہہ سکتے۔ان کی نگاہ ایک زمانے تک ایسے انسان کو دیکھنے کو ترس گئیں۔ان کے دل کا درد ان کے ان اشعار سے محسوس کیا جا سکتا ہے:

انسان کے ہاتھوں انسان پر کیا کیا بیتی کیا کیا گزری
یہ درد بھری باتیں سن کر پتھر کا کلیجہ ہلتا ہے(۲۰۸)

مجروح کئے اس نے محبت سے بھرے دل
بے رحم زمانہ کبھی جذبات نہ سمجھا(۲۰۹)

عرشؔ صہبائی کی شاعری میں کسی مرکزی خیال سے زیادہ ان کے ذاتی تجربے کی عکاسی زیادہ ملتی ہے۔ ان کے نظریہ حیات نے ان کے فن اور فکر کے درمیان ایک گہرا رابطہ قائم کیا ہے۔ان کے مطابق دور حاضر میں اخلاق،خلوص،وفا،امانتداری جیسے قیمتی جذبے اپنی معنویت کھو چکے ہیں۔اس دور جمہور میں انسان کبھی اپنی خود ساختہ زنجیروں میں قید ہوتا ہے تو کہیں سیاسی وسماجی ماحول کی دیواروں میں قید ہے۔اس بے حسی اور عدم تحفظ کا اظہار جب عرشؔ صہبائی کرتے ہیں تو اسے آپ بیتی سے جگ بیتی بنا دیتے ہیں۔اس اجتمائی دور کی ایک جھلک عرشؔ کے ان چند اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے:

انقلاب کیا ہوگا اس سے بڑھ کے دنیا میں
کارواں کا رہزن ہی میر کارواں ٹھہرا(۲۱۰)

بے طرح جن سے الجھ کر رہ گئی ہے زندگی
ایسے پیچیدہ مسائل تو کبھی پیدا نہ تھے(۲۱۱)

میرے اس حال پریشان کی کس کو خبر نہیں
سب پہ ظاہر ہے حقیقت یہ مسیحا کے سوا(۲۱۲)

جب کبھی بھی کوئی حق پسندوں کی آواز بلند ہوتی تو عرشؔ بے خوف ہوکر ظالموں کے خلاف مظلوموں کی طرفداری کرتے کیوں کہ یہی ایک واحد راستہ جسے زندگی بھر انہوں نے برابر اپنائے رکھا۔ یہاں کہیں حق گوئی اور حق کے لئے لڑنے والوں بات آتی وہاں عرشؔ ہمیشہ ننگی تلوار کی طرح سامنے آئے ہیں۔ان کے مطابق ظلم و جبر، اقتدار و استحصال کی قوتیں حق کو ہرگز دبا نہیں سکتی۔ بقول عرشؔ:

ہزاروں بندشیں بھی ہوں ہزاروں سختیاں بھی ہوں
کبھی دبتی نہیں ہے جو حق کی آواز ہوتی ہے(۲۱۳)

اس دور میں کوئی بھی نہ سمجھے گا وہ عرشؔ
میں حق کا پجاری ہوں محبت کی زباں ہوں(۲۱۴)

اپنی آنکھوں سے لگایا انہیں پھولوں کی طرح
حق پرستوں پہ برستے رہے پتھر کتنے(۲۱۵)

حق پرستوں نے بھی کیا صلہ دیا مجھ کو
سنگ میل تھا لیکن گرد کاروں ٹھہرا(۲۱۶)

میری زباں بھی بند ہو شورش حق بھی ختم ہو
اس کا علاج ہے مجھ کو سپرد دار کر(۲۱۷)

مندرجہ بالا اشعار سے ایک بات صاف عیاں ہو جاتی ہے کہ موصوف حق پسندی کے بے حد قائل تھے حق پسند لوگوں سے دلی وابستگی بھی رکھتے تھے۔ پہلے بھی یہ ذکر ہو چکا ہے کہ موصوف ایک زمانے تک نہایت تند دستی اور غربت رہے لیکن انہوں نے زندگی میں آنے والی پریشانیوں اور مصیبتوں کے باوجود بھی خودداری اور بلند اخلاقی کو نہیں چھوڑا اور نہ کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز کیا۔یہی سبب ہے کہ حق گوئی کے معاملے میں نہ کسی شے کا پاس رکھتے اور اپنے سود و زیاں کا خیال کرتے تھے۔کہیں حق ان کی اس حق پسندی کو سراہا بھی گیا اور کہیں ان کے خلاف شدید ردعمل بھی دیکھنے کو ملا۔ان کے کلام میں ان تمام باتوں کی جانب کئی اشارے مل

جاتے ہیں جوان کی منفرد لب و لہجے کی شناخت ہیں:

یہ چاہتا ہے کہ اس دور پر کروں تنقید   وہ شخص قبر میں زندہ اتارتا ہے مجھے
قدم جو رکھتا ہوں مصلحت کی وادی میں   میرا ضمیر برابر پکارتا ہے مجھے(۲۱۸)

چلتے تو ہو عرشؔ راہ حق پر لئے ہوئے دل میں عزم لیکن
جہاں جہاں بھی قدم پڑیں گے وہیں وہیں خار زار ہوگا(۲۱۹)

کتنا گہرا سکوت حق گوئی
کتنی مدھم ضمیر کی آواز(۲۲۰)

ہر شخص زمانے میں حق پرست نہیں
ہر شخص سے حق بات پہ الجھا نہ کر(۲۲۱)

عرشؔ ہر کسی کے ساتھ ہمدردی اور خلوص خیر کا معاملہ رکھتے تھے۔ان کے خلوص و وفا سے فیض ہونے والوں میں سے بعض نے انہیں ناقابل فراموش چرکے دئے ہیں۔ان زخموں کی نمائش کرتے ہوئے عرشؔ لکھتے ہیں:

دور کر دے گا زمانے سے مجھے میرا خلوص
مجھ کو اپنی اس صلاحیت کا انداز ہ نہ تھا(۲۲۲)

محلوں میں کیا ملے گا وفا کا سراغ عرشؔ
یہ جھونپڑوں کی چیز ہے ان میں تلاش کر(۲۲۳)

اردو شاعروں نے مذہبی شاعری اور مذہبی تصورات کی ترجمانی بھی بہت کی ہے لیکن عرشؔ کا انداز بیان اس بات کا شاہد ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں سب سے مفرد انداز و بیان کے شاعر تھے۔ہندو فلاسفی اور بھگوت گیتا کے شلوکوں بلکہ مختلف مذہبی تعلیمات سے منکشف کئے گئے نکات،اصول نتائج اور روح کے سلسلے آمد وشد کی جھلک بھی عرشؔ کے اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے۔فرماتے ہیں:

کس گھاٹ میں اترنا ہے مجھے یہ نہیں معلوم
کاغذ کی ہوں اک ناؤ سمندر میں رواں ہوں(۲۲۴)

بشر اک ایسی منزل پر رواں ہے
نہیں معلوم اسے جانا کہاں ہے(۲۲۵)

پھول سے خوشبو کی صورت ہم جدا ہو جائیں گے
یہ بہاریں یہ چمن آرائیاں رہ جائیں گی(۲۲۶)

زندگی میں تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں ان کا یہ مشورہ بھی شایان قبول احترام ہے۔ایسے مشورے وہی انسان دے سکتا ہے جو خود حق پسند ہو اور کسی سے کسی قسم کی امداد و حوصلہ افزائی کے خواہش مند نہ ہو۔وہ فرماتے ہیں:

کیا ضروری ہے کہ یہ دکھ بانٹنے والے بھی ہوں
ملنے والوں سے کبھی ذکر پریشانی نہ کر
وقت کے بگڑے ہوئے اطوار کا اندازہ دیکھ
زندگی میں ہر قدم پر اپنی من مانی نہ کر(۲۲۷)

عرش صہبائی کی شاعری میں جدت ہے، جدیدیت نہیں۔ان کی شاعری میں نئے خیالات گہری حسیت اور حساس لطافت کے ساتھ ملتے ہیں۔جس کا اس مروجہ جدیدیت سے کوئی تعلق نہیں جو شاعری کو نازک خیالات کے بجائے بوجھل اثرات عطا کرتی ہے۔روایتی اسلوب میں عصر جدید کے تقاضے اپنے جذبہ واحساس کے مطابق نظم کرتے ہیں۔ بسا اوقات یہ خیالات اردو کی مروجہ روایات سے یکسر انحراف کئے ہوئے ہیں۔ ناقابل تصور حالات کا ایک چبھتا ہوا احساس ہر ذی وقار شاعر کو ہوتا ہے بالخصوص آجکل کے اس مادہ پرست، ٹیلی وژن، جدید ٹیکنولوجیکل آلات کے ماحول میں جہاں ایک طرف تو بازار فن میں کھوٹے سکوں کا چلن ہے۔ڈاکٹر شباب للت کی کتاب ’’ آئینوں کے روبرو‘‘ سے اور دوسری طرف ہمارے میڈیا کی یلغار نے بے تکی ،اوٹ پٹانگ ،بے وزن ،بے بحر و عروض شاعری کو سنجیدہ شاعری کے مسند پر جلوہ افروز کر دیا ہے اور سامعین و ناظرین کے ذوق صالم کو پستی کی جانب دھکیلا جا رہا ہے، جینون شاعری پر عجیب وقت آن پڑا ہے۔اس صورت حال سے متاثر عرش کو بھی یہ کہنا پڑا ہے:

دل کا لہو نچوڑ نہ فن کی تلاش کر — اس بے شعور دور میں فکر معاش کر
ناحق بھٹک رہا ہے کسی کے خیال میں — اس ضد کو چھوڑ اور خود اپنی تلاش کر(۲۲۸)

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آج بہت سے تک بندی کے شاعر ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔آج ملکی سطح پر عرش کی شاعری کے مداحوں اور چاہنے والوں کی کثیر تعداد ان کے ادبی مقام کو تسلیم کرتی ہے۔جموں کشمیر میں عرش صہبائی بذات خود ایک انجمن تھے جہاں ان کی شخصیت اور فن کے پرستاروں اور جاں نثاروں کی کمی نہیں

کیونکہ ان کی شاعری زندہ و تابناک ادب کا آئینہ ہے۔ خود ان کے الفاظ ہیں:

عرشؔ جو درد میں ڈوبے ہوئے دل سے نکلے
چند شعلے بھی چمکتے ہیں اس آواز کے ساتھ(۲۲۹)

اور ان شعلوں کی نرم آنچ ان کے چاہنے والوں کو ایک انوکھی تسکین بخش حرارت اور تحریک ادا کر رہی ہے۔ ایک حقیقی شاعر اپنے عہد اور معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے لہٰذا عرشؔ صہبائی کے کلام میں بھی جا بہ جا عصری صورت حال کی عکاسی اور اس پر ایک لطیف طنز کا عنصر متاثر کرتا ہے:

یہی جمہوریت اپنی یہی انداز اس کا
کس کو ملتی ہے سزا کس کی خطا ہوتی ہے(۲۳۰)

نہیں ہے آج کوئی چیز اپنے مرکز پر
نظام زندگی ڈگمگانے والا ہے(۲۳۱)

عرشؔ صہبائی جہاں ایک طرف محبت اور بھائی چارے کے علمبردار ہیں وہاں انسانی زندگی پر مصائب اور ظلم و ستم کے آگے سینہ سپر ہو کر ہمیت اور استقلال سے ان کا سامنہ کرنے کی تلقین بھی کرتے ہیں:

سفینہ پار اترے گا یقیناً یہ دھارے کس لئے سر پھوڑتے ہیں
محبت سے ادا ہوتے ہیں جو بھی وہ فیصلے دلوں کو جوڑتے ہیں(۲۳۲)

یوں ہو طوفان سے ہم کنار کبھی ناؤ گرداب میں اتار کبھی
آج حق گوئی کا صلہ یہ ہے سنگ ساری کبھی دار کبھی(۲۳۳)

ہر ہنر مند فنکار کی مقبولیت ہمیشہ اس کے حاسدوں اور بدخواہوں کو تحقیر کی دعوت دیتی ہے لیکن عرشؔ صہبائی کی اعلیٰ ظرفی دیکھئے کہ وہ ان سے بدظن ہونے کے بجائے ان کے تئیں ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں اور انہیں اپنا ہمدرد گردانتے ہیں:

میں عرشؔ ان کا بھی ممنون کرم ہوں
جو دشمن بن گئے بے بات میرے(۲۳۴)

عرشؔ اڑاتا رہتا ہے جو میرا مذاق
ظاہر ہے ہوگا میرا ہمدرد کوئی(۲۳۵)

میرے حریف سلامت رہیں دعا ہے مری
بڑا عجیب ہے جذبہ انتقام مرا(۲۳۶)

عرشؔ کی شاعری اپنی حقیقت پسندی اوراثر آفرینی کے سبب عالمی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ان کی شاعری نئی پود کے شاعروں کے لئے ایک تحریک کا کام کرتی ہے۔یہ انہیں کا خاصا ہے کہ نئے نئے تصورات اور نئے اندازفکر کا پرتو ان کی غزل اہم جز ہے۔ان کی غزلوں کا رنگ وآہنگ بھی ان کے ہم عصر شعراء سے بہت مختلف ہے۔وہ غزل کے مزاج کواور غزل ان کے مزاج کو سمجھتی تھی۔اس کے جواز میں ان کئی غزلیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن مضمون کی طوالت کے سبب ایک غزل کے چنداشعار ملاحظہ فرمائیں:

لب پہ ہنسی دل میں غم ہونگے ایسے لوگ بہت کم ہونگے
کیونکر ہنگامے کم ہونگے جس محفل میں ہم ہونگے
کون کرے گا قدر وفا کی ایسے حادثے اب کم ہونگے
وہ بھی خوب زمانہ ہوگا جب نہ زمانے میں ہم ہونگے(۲۳۷)

آج عرشؔ صہبائی ہمارے درمیاں موجودنہیں ہیں لیکن ان کے کلام نے ان کو رہتی دنیا تک کے لئے زندہ کردیاہے۔ان کا یہ شعران کی شخصیت پر صادق آتا ہے۔

یقیناً آشنائے فکر و فن ہیں
وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں(۲۳۸)

عرشؔ کی غزلیہ شاعری میں زندہ دلی ،شگفتہ بیانی اورشوخ طبی پائی جاتی ہے۔ان کے لب و لہجے میں جو والہانہ پن اورخوداعتمادی ہے ان کا اصل سبب یقین محکم اورفکری یکسوئی ہے۔ان کی غزلیں ایسی مربوط ہیں کہ ان میں اول سے آخرتک ایک روح دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔تغزل کی کیفیات سے ان کی تمام غزلیں لبریز ہیں ۔عرشؔ نے غزل کے فن کو لامقصدیت اور ابہام کی بھول بھلیوں سے نجات دلائی ہے۔انہوں نے نئی شاعرانہ اصطلاحیں واضع کیں،نئی تشبیہیں اور استعارے ایجاد کئے،نئی اشاریت رمزیت فراہم کی۔مختصراًوہ زمانہ حال تک کے ایک عظیم فنکار تھے جنھوں نے شاعری کے ذریعے اردو کے ذخیرہ ادب کو مالا مال کیا ہے۔

بہرکیف کسی بھی موضوع پر کتنے ہی طویل مضامین یا کتابیں تحریر کردی جائیں اس میں کچھ نئے پہلوؤں کی گنجائش رہ جاتی ہے ۔لہٰذا ہر موضوع کی طرح ہمارے اس مقالے کے موضوع کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔عرشؔ صہبائی کی غزل گوئی کے بارے میں اتنے مضامین شائع ہو چکے ہیں جس کی کوئی حدنہیں اور یہ سلسلہ

اب بھی جاری ہے۔ ان کی شخصیت اور فن پر ابھی تک کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور بہت سی یونیورسٹیوں سے ان پر مختلف موضوعات کے تحت تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ابھی بہت سے لکھے جائیں گے کیونکہ ایک ہی مضمون میں ساری کائنات نہیں سمیٹی جا سکتی۔ اس لئے ہم یہ سلسلہ ختم کرتے ہیں۔ یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے دسویں جماعت کے اردو نصاب میں ان کی دو غزلیں شامل ہیں۔ انہیں ''آبروئے سخن'' کے علاوہ ''علامہ آرزو لکھنوی'' کے ایوارڈ سے بھی نوازہ جا چکا ہے۔ مرکز ادب پانی پت نے انہیں ''شہنشاہ تغزل'' کے خطاب سے نوازہ ہے۔ اس طرح ''ہمالین کارنامہ حیات ایوارڈ'' دبستان ہمالہ ہمالین ایجوکیشن مشن راجوری (جموں و کشمیر) نے سرفراز کیا ہے۔ انہیں اور بھی کئی انعامات اور اعجازات سے نوازہ گیا ہے جن کا ذکر یہاں بے محل ہے۔ اتنا کام کرنے اور اتنی شہرت کے باوجود عرشؔ صہبائی اپنے آپ کو ہمیشہ طفل مکتب سمجھتے تھے۔

حواشی:

۱۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویژن، ۲۰۱۵ء، ص، ۲۶۸

۲۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۵

۳۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص، ۱۶

۴۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۷

۵۔ ایضاً ص، ۶

۶۔ ایضاً ص، ۱۰

۷۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۴ء، ص، ۱

۸۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص، ۱۲

۹۔ ایضاً ص، ۱۵

۱۰۔ ایضاً ص، ۱۲۰

۱۱۔ عرشؔ صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۷۰

۱۲۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۴ء، ص، ۱

۱۳۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندوستانی آرٹ پریس، فروری ۱۹۹۵ء، ص، ۶

۱۴۔ عرشؔ صہبائی، چشم نیم باز، جموں: نمی ڈوگری سنستھا۔ دی آرٹ فونڈیشن، ۲۰۰۷ء، ص، ۵
۱۵۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص، ۹۵
۱۶۔ عرشؔ صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۷۰
۱۷۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۱۳۲
۱۸۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۱۰۶
۱۹۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۱۳۲
۲۰۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۱۰۸
۲۱۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۵۴
۲۲۔ عرشؔ صہبائی، اسلوب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۱ء، ص، ۳۴
۲۳۔ ایضاً ص، ۴۹
۲۴۔ محمد طاہر عزیز خان، تیری پرفسوں نگاہیں عرشؔ صہبائی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۱۹ء، ص، ۱۲
۲۵۔ عرشؔ صہبائی، اسلوب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۱ء، ص، ۵۷
۲۶۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۴۷
۲۷۔ ایضاً ص، ۴۷
۲۸۔ ایضاً ص، ۶۷
۲۹۔ ایضاً ص، ۱۲۰
۳۰۔ خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص، ۶۵
۳۱۔ ایضاً ص، ۶۲
۳۲۔ ایضاً ص، ۶۴
۳۳۔ عرشؔ صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، پنج تیرتھی جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۷۔۱۲
۳۴۔ عرشؔ صہبائی، آگہی، کٹھوعہ (جے اینڈ کے): مرکز تصنیف و تالیف، ۲۰۱۵ء، ص، ۲
۳۵۔ ایضاً ص، ۱۲
۳۶۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۸۶
۳۷۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۴ء، ص، ۱۴
۳۸۔ عرشؔ صہبائی، چشم نیم باز، جموں: نمی ڈوگری سنستھا دی آرٹ فونڈیشن، ۲۰۰۷ء، ص، ۱۹
۳۹۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۴ء، ص: ۹۰

۴۰۔ کرن کوشل ٹھاکر، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۱۰۰
۴۱۔ عرشؔ صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص، ۴۷
۴۲۔ ایضاً ص، ۱۳۴
۴۳۔ عرشؔ صہبائی، آگہی، کٹھوعہ (جے اینڈ کے): مرکز تصنیف وتالیف، ۲۰۱۵ء، ص، ۴۵
۴۴۔ پروفیسر ایس اے قاضی شاذ شرقی، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۸ء، ص، ۱۱۲
۴۵۔ عرشؔ صہبائی، آگہی، کٹھوعہ (جے اینڈ کے): مرکز تصنیف وتالیف، ۲۰۱۵ء، ص، ۳۱
۴۶۔ عرشؔ صہبائی، خدوخال، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۸ء، ص، ۱۰۲
۴۷۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵ء، ص، ۱۳۲
۴۸۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص، ۹۳
۴۹۔ ڈاکٹر اعجاز حسین شاہ، عرشؔ صہبائی عہد، فن اور شخصیت، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۷ء، ص، ۹۵
۵۰۔ عرشؔ صہبائی، چشم نیم باز، جموں: نمی ڈوگری سنستھا دی آرٹ فونڈیشن، ۲۰۰۷، ص: ۷۷
۵۱۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۴ء، ص، ۱۳
۵۲۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۱۲
۵۳۔ ایضاً ص، ۱۴
۵۴۔ ایضاً ص، ۱۶
۵۵۔ عرشؔ صہبائی، چشم نیم باز، جموں: نمی ڈوگری سنستھا دی آرٹ فونڈیشن، ۲۰۰۷ء، ص، ۳۰
۵۶۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۴ء، ص، ۱۲۱
۵۷۔ ایضاص، ۹۶
۵۸۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ، دل کے خواب ادھورے سے، کٹھوعہ (جے اینڈ کے): مرکز تصنیف وتالیف، ۲۰۱۴، ص، ۱۶
۵۹۔ عرشؔ صہبائی، اسلوب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۱ء، ص ص، ۱۷۔۱۸۔۲۰۔۴۱
۶۰۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس، ۱۹۷۱ء، ص، ۹
۶۱۔ عرشؔ صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص، ۵۹
۶۲۔ دیپک عارسی، اعجاز غزل عرشؔ صہبائی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۲۱، ص ص، ۹۔۶۷
۶۳۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس، ۱۹۷۱ء، ص، ۴۱
۶۴۔ محمد طاہر عزیز خان، تری پرفسوں نگاہیں عرشؔ صہبائی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۱۹ء، ص، ۹
۶۵۔ کرن کوشل ٹھاکر، عرشؔ صہبائی اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۱۸۴

۶۶۔ عرش صہبائی، تیری پرفسوں نگاہیں، دہلی: روشان پرنٹرس، ۲۰۱۹ء، ص، ۱۵

۶۷۔ عرش صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص، ۴۰

۶۸۔ عرش صہبائی، اسلوب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۱ء، ص ص، ۴۶، ۵۷

۶۹۔ عرش صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص، ۱۶

۷۰۔ عرش صہبائی، دسترس، جموں: بزم اردو ادب، ۲۰۰۷، ص، ۴۷

۷۱۔ عرش صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس، ۱۹۷۱ء، ص، ۱۵

۷۲۔ خورشید کاظمی، مغنی حیات عرش صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص، ۱۱۲

۷۳۔ کرن کوشل ٹھاکر، عرش صہبائی اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۱۸۴

۷۴۔ عرش صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص، ۶۸

۷۵۔ عرش صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص، ۶۸

۷۶۔ ماہنامہ شیرازہ، جلد ۵۶، شمارہ ۳-۴، عرش صہبائی نمبر، سرینگر، جموں اینڈ کشمیر: اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، ص، ۱۰۰

۷۷۔ خورشید کاظمی، مغنی حیات عرش صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص، ۱۰۹۔۱۱۰

۷۸۔ ایضاً ص، ۵۹

۷۹۔ حضرت مرزا طاہر احمد، قران کریم، اسلام آباد: اسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز لیمیٹڈ، ۲۰۰۰ء، ص، ۸۹۹

۸۰۔ خورشید کاظمی، مغنی حیات عرش صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص، ۵۹

۸۱۔ حضرت مرزا طاہر احمد، قران کریم، اسلام آباد: اسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز لیمیٹڈ، ۲۰۰۰، ص، ۱۱۸

۸۲۔ خورشید کاظمی، مغنی حیات عرش صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص، ۵۹

۸۳۔ ایضاً ص، ۱۱۳

۸۴۔ ایضاً ص، ۱۱۲

۸۵۔ ایضاً ص، ۱۱۲

۸۶۔ عرش صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس، ۱۹۷۱ء، ص، ۱۱۲

۸۷۔ ایضاً ص، ۱۰۸

۸۸۔ عرش صہبائی، اسلوب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۱ء، ص ص، ۸۶۔۱۱۱۔۱۱۲

۸۹۔ عرش صہبائی، چشم نیم باز، جموں: نمی ڈوگری سنستھا دی آرٹ فونڈیشن، ۲۰۰۷ء، ص، ۴۵

۹۰۔ عرش صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس، دسمبر ۱۹۷۱ء، ص، ۱۲

۹۱۔ عرش صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۲۵

۹۲۔ ایضاً ص، ۱۰۹

۹۳۔ ایضاً ص، ۸۸

۹۴۔ ایضاً ص، ۵۹

۹۵۔ عرش صہبائی، خدوخال، جموں: مانوی پبلی کیشن، ۲۰۰۸ء، ص، ۴۴

۹۶۔ عرش صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۳۱

۹۷۔ عرش صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، پنچ تیرتھی جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۱۲۵

۹۸۔ کرن کوشل ٹھاکر، عرش صہبائی اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۵۴

۹۹۔ عرش صہبائی، اسلوب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۱ء، ص، ۲۵۔۳۳۔۳۴

۱۰۰۔ غلام جیلانی، عصری آگہی کا شاعر عرش صہبائی، جموں: آزاد بک ویژن، ۲۰۱۵ء، ص، ۵۰

۱۰۱۔ عرش صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، پنچ تیرتھی جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص، ۱۲۴

۱۰۲۔ عرش صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص، ۲۷

۱۰۳۔ عرش صہبائی، یہ جانے پہچانے لوگ، امرتسر: اردو وزیر ہند پریس، ۱۹۶۶ء، ص، ۲۰۵

۱۰۴۔ عرش صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۱۲۶

۱۰۵۔ ایضاً ص، ۱۲۷

۱۰۶۔ عرش صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۸ء، ص، ۱۰۳

۱۰۷۔ ایضاً ص، ۱۵

۱۰۸۔ خورشید کاظمی، مغنی حیات عرش صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص، ۱۴۸

۱۰۹۔ عرش صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۸ء، ص، ۱۰۲

۱۱۰۔ محمد طاہر عزیز خان، تری پرفسوں نگاہیں عرش صہبائی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۱۹ء، ص، ۱۰

۱۱۱۔ عرش صہبائی، سائے تیری یادوں کے: جموں، مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص، ۳۷

۱۱۲۔ عرش صہبائی، تیری پرفسوں نگاہیں: دہلی، روشان پرنٹرس، ۲۰۱۹ء، ص، ۱۱

۱۱۳۔ عرش صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۸ء، ص، ۱۰۳

۱۱۴۔ عرش صہبائی، نایاب، جموں: عرش صہبائی، ۲۰۰۴، ص، ۱۸

۱۱۵۔ ایضاً ص، ۲۵

۱۱۶۔ عرش صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص، ۶۱

۱۱۷۔ عرش صہبائی، نایاب، جموں: عرش صہبائی،۲۰۰۴ء، ص، ۶۹

۱۱۸۔ ایضاً ص،۱

۱۱۹۔ ایضاً ص،۱۲۳

۱۲۰۔ عرش صہبائی، صلیب، جموں: مکتبہ اردو ادب،۱۹۷۱ء، ص، ۱۸

۱۲۱۔ عرش صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس،۱۹۷۱ء، ص،۱۲۳

۱۲۲۔ عرش صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندوستانی آرٹ پریس،۱۹۹۵ء، ص، ۴۷

۱۲۳۔ عرش صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص،۳۲

۱۲۴۔ ایضاً ص،۲۲

۱۲۵۔ عرش صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندوستانی آرٹ پریس،۱۹۹۵ء، ص، ۳۸

۱۲۶۔ عرش صہبائی، نایاب، جموں: عرش صہبائی،۲۰۰۴ء، ص،۳

۱۲۷۔ عرش صہبائی، اعجاز غزل، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،۲۰۲۱ء، ص،۴

۱۲۸۔ عرش صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب،۱۹۶۱ء، ص، ۱۰

۱۲۹۔ عرش صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب،۱۹۵۹ء، ص،۲۴

۱۳۰۔ ایضاً ص،۱۱۰

۱۳۱۔ ایضاً ص،۱۰۹

۱۳۲۔ عرش صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص،۱۰۱

۱۳۳۔ عرش صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس،۱۹۷۱ء، ص، ۷۷

۱۳۴۔ ایضاً ص، ۸۰

۱۳۵۔ عرش صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص،۲۱

۱۳۶۔ عرش صہبائی، تیری پرفسوں نگاہیں، جموں: عرش صہبائی،۲۰۱۹ء، ص،۸۴

۱۳۷۔ عرش صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس،۱۹۷۱ء، ص،۱۲۲

۱۳۸۔ عرش صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص، ۴۵

۱۳۹۔ پروفیسر قدوس جاوید، ادب کے معمار (اول)، نئی دہلی: ایچ ایس آفسیٹ پرنٹر،۲۰۲۱ء، ص ص: ۱۱۸۔۱۱۹

۱۴۰۔ عرش صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس،۱۹۷۱ء، ص ص،۷۱۔۷۴

۱۴۱۔ ایضاً ص،۱۲۹

۱۴۲۔ عرش صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب،۱۹۶۱ء، ص، ۵۸

۱۴۳۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۵

۱۴۴۔ ایضاً ص، ۱۷

۱۴۵۔ ایضاً ص، ۶۷

۱۴۶۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس، ۱۹۷۱ء، ص ۱۲،

۱۴۷۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۹۱

۱۴۸۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص، ۸۲

۱۴۹۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۹۲

۱۵۰۔ عرشؔ صہبائی، ریزہ ریزہ وجود، جموں: ہندوستانی آرٹ پریس، ۱۹۹۵ء، ص، ۴۶۔۴۷

۱۵۱۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۹۸۔۹۹

۱۵۲۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۶۴

۱۵۳۔ ایضاً ص، ۹۹

۱۵۴۔ ایضاً ص، ۸۳

۱۵۵۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۵۵

۱۵۶۔ ایضاً ص، ۸۹

۱۵۷۔ عرشؔ صہبائی، توازن، جموں: مانوی پبلکیشن، ۲۰۰۵ء، ص، ۱۰۹

۱۵۸۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ، دل کے خواب ادھورے سے، کٹھوعہ (جے اینڈ کے)، مرکز تصنیف وتالیف، ۲۰۱۴، ص، ۵۳

۱۵۹۔ ایضاً ص، ۸۱

۱۶۰۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۶۶

۱۶۱۔ ایضاً ص، ۱۰۱

۱۶۲۔ ایضاً ص، ۶۶

۱۶۳۔ عرشؔ صہبائی، خوشبو تیرے بدن کی، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۰۹ء، ص، ۱۱۲

۱۶۴۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس، ۱۹۷۱ء، ص، ۲۷

۱۶۵۔ خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص، ۱۱۴

۱۶۶۔ عرشؔ صہبائی، اسلوب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۱ء، ص، ۴۱

۱۶۷۔ عرشؔ صہبائی، شکست جام، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۵۹ء، ص، ۹۹

۱۶۸۔ عرشؔ صہبائی، آگہی، کٹھوعہ (جموں): مرکز تصنیف وتالیف، ۲۰۱۵ء، ص، ۱۶

۱۶۹۔ محمد طاہر عزیز خان، تری پرفسوں نگاہیں عرشؔ صہبائی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۱۹ء، ص ۲۷

۱۷۰۔ عرشؔ صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۵

۱۷۱۔ محمد طاہر عزیز خان، تری پرفسوں نگاہیں عرشؔ صہبائی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۱۹ء، ص ۱۲

۱۷۲۔ عرشؔ صہبائی، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۰ء، ص ۹

۱۷۳۔ عرشؔ صہبائی، آگہی، کٹھوعہ (جموں)، مرکز تصنیف و تالیف، ۲۰۱۵ء، ص ۹

۱۷۴۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس، ۱۹۷۱ء، ص ۱۰۷

۱۷۵۔ صہبا عرشؔ صہبائی، آگہی، کٹھوعہ (جموں)، مرکز تصنیف و تالیف، ۲۰۱۵ء، ص ۶۴

۱۷۶۔ عرشؔ صہبائی، آگہی، کٹھوعہ (جموں): مرکز تصنیف و تالیف، ۲۰۱۵ء، ص ۱۳۲

۱۷۷۔ عرشؔ صہبائی، چشمِ نیم باز، جموں: نمی ڈوگری سنستھا دی آرٹ فونڈیشن، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۹

۱۷۸۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص ۹۳

۱۷۹۔ ایضاً ص، ۱۰۹

۱۸۰۔ محمد طاہر عزیز خان، تری پرفسوں نگاہیں عرشؔ صہبائی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۱۹ء، ص ۵۵

۱۸۱۔ عرشؔ صہبائی، آگہی، کٹھوعہ (جموں): مرکز تصنیف و تالیف، ۲۰۱۵ء، ص ۳۱

۱۸۲۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ، دل کے خواب ادھورے سے، کٹھوعہ (جموں): مرکز تصنیف و تالیف، ۲۰۱۴ء، ص ۸۹

۱۸۳۔ ایضاً ص، ۳۹

۱۸۴۔ ایضاً ص، ۳۵

۱۸۵۔ عرشؔ صہبائی، جواز، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۱ء، ص ۸۱

۱۸۶۔ عرشؔ صہبائی، دسترس، جموں: بزم اردو ادب، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲۳

۱۸۷۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ، دل کے خواب ادھورے سے، کٹھوعہ (جموں): مرکز تصنیف و تالیف، ۲۰۱۴ء، ص: ۹۷

۱۸۸۔ عرشؔ صہبائی، دسترس، جموں: بزم اردو ادب، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۶

۱۸۹۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ، دل کے خواب ادھورے سے، کٹھوعہ (جموں): مرکز تصنیف و تالیف، ۲۰۱۴ء، ص ۹۱

۱۹۰۔ خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۱۴

۱۹۱۔ ایضاً ص، ۶۷

۱۹۲۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ، دل کے خواب ادھورے سے، کٹھوعہ (جموں): مرکز تصنیف و تالیف، ۲۰۱۴ء، ص ۳۷

۱۹۳۔ ایضاً ص، ۱۰۱

۱۹۴۔ عرشؔ صہبائی، جواز، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۱ء، ص ۵۹

۱۹۵۔ عرشؔ صہبائی، آ گہی، کٹھوعہ (جموں): مرکز تصنیف وتالیف، ۲۰۱۵ء، ص، ۱۰۷

۱۹۶۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ، دل کے خواب ادھورے سے، کٹھوعہ (جموں)، مرکز تصنیف وتالیف، ۲۰۱۴ء، ص، ۹۷

۱۹۷۔ ایضاً ص، ۱۷

۱۹۸۔ عرشؔ صہبائی، توازن، جموں، مانوی پبلکشن، ۲۰۰۵ء، ص، ۳۷

۱۹۹۔ خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر (کشمیر)، میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص، ۱۱۴

۲۰۰۔ ایضاً ص، ۶۸

۲۰۱۔ غلام جیلانی، عصری آ گہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویزن، ۲۰۱۵ء، ص، ۵۷

۲۰۲۔ شاہ، ڈاکٹر اعجاز حسین، عرشؔ صہبائی (عہد، فن اور شخصیت)، جموں مکتبہ اردو ادب مکتبہ اردو ادب، ۲۰۱۷، ص، ۱۰۰

۲۰۳۔ ایضاً ص، ۴۰

۲۰۴۔ عرشؔ صہبائی، شگفت گل، جموں، مکتبہ اردو ادب، ۱۹۶۱ء، ص، ۱۲

۲۰۵۔ ایضاً ص، ۱۴

۲۰۶۔ ایضاً ص، ۱۴

۲۰۷۔ ایضاً ص، ۱۳

۲۰۸۔ ایضاً ص، ۹۲

۲۰۹۔ عرشؔ صہبائی، صلیب، جموں: چاند پریس، ۱۹۷۱ء، ص، ۵۲

۲۱۰۔ عرشؔ صہبائی، اسلوب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۱ء، ص، ۱۱

۲۱۱۔ ایضاً ص، ۱۲

۲۱۲۔ ایضاً ص، ۱۳

۲۱۳۔ خورشیدؔ کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر (کشمیر): میزان پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص، ۱۱۱

۲۱۴۔ عرشؔ صہبائی، اسلوب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۱ء، ص، ۱۰۶

۲۱۵۔ ایضاً ص، ۴۷

۲۱۶۔ ایضاً ص، ۱۱

۲۱۷۔ ایضاً ص، ۹۷

۲۱۸۔ ایضاً ص، ۶۵

۲۱۹۔ ایضاً ص، ۸۳

۲۲۰۔ ایضاً ص،۱۱۴

۲۲۱۔ ایضاً ص،۷۷

۲۲۲۔ عرشؔ صہبائی، عکس جمال، جموں: چاند پریس، ۲۰۰۷ء، ص،۱۰۱

۲۲۳۔ ایضاً ص،۴۳

۲۲۴۔ عرشؔ صہبائی، اسلوب، جموں: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۱ء، ص،۱۰۵

۲۲۵۔ عرشؔ صہبائی، اعجاز، غزل، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۲۱ء، ص،۱۲

۲۲۶۔ ایضاً ص،۲۳

۲۲۷۔ ایضاً ص،۴۳

۲۲۸۔ ایضاً ص،۳

۲۲۹۔ ایضاً ص،۸۲

۲۳۰۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۴ء، ص،۱۷

۲۳۱۔ ایضاً ص،۷۵

۲۳۲۔ ایضاً ص ص،۱۳۔۱۴

۲۳۳۔ ایضاً ص،۱

۲۳۴۔ ایضاً ص،۸۴

۲۳۵۔ ایضاً ص،۵۵

۲۳۶۔ عرشؔ صہبائی، شبنم تیری یادوں کی، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۱۳ء، ص،۷۰

۲۳۷۔ عرشؔ صہبائی، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی، ۲۰۰۴ء، ص ص،۴۵۔۴۶

۲۳۸۔ عرشؔ صہبائی، خوشبو تیرے بدن کی، جموں: مانوی پرکاشن، ۲۰۰۹ء، ص،۴

☆☆☆

حاصل مطالعہ

ملک میں جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو ریاست کی ادبی فضا نے بھی اس کے اثرات قبول کئے اور اس کے زیر اثر یہاں بھی جگہ جگہ ادبی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ان میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین جموں''، ''بزم ادب جموں''اہم ہیں۔اس سے پہلے بھی جموں کے اہلِ ذوق اصحاب کی کوششوں سے 15-1914ء میں ایک بزم''بزم مشاعرہ''کے نام سے بنی تھی جس کے آغاز اور تنظیم میں صاحب زادہ محمد عمر،شیخ غلام نقشبندی قابل ذکر ہیں۔لیکن اس وقت چونکہ شعراء اردو زبان سے زیادہ فارسی زبان کا ذوق رکھتے تھے اس لئے اردو کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی تھی جو اس کے بعد کے دور میں دی گئی۔ریاست میں 1947ء کے بعد جو ادبی دور شروع ہوا اس کا آغاز بالخصوص عرشؔ صہبائی کی ادبی زندگی ہوتا ہے۔اس وقت ریاست میں ''بزم اردو ادب'' پہلی بزم تھی جس کا آغاز ہوا اور جس کے روح رواں جناب عرشؔ صہبائی تھے۔یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ یہ بزم ترقی پسند مصنفین کی نعرہ بازیوں سے بہت دور تھی۔

عرشؔ صہبائی کا شمار ملک کے معتبر ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ریاست جموں و کشمیر کے شعری منظر نامے میں تو وہ سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔عرشؔ صہبائی نے اردو شاعری میں غزل،نظم،دوہا اور قطعہ جیسی مقبول اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن صنف غزل سے انہیں طبعی لگاؤ تھا۔غزل میں ان کی تربیت ہوئی اور غزل ہی پر انہوں نے زیادہ توجہ صرف کی ہے۔اس صنف میں اب انہیں ایک مقام حاصل ہو چکا ہے بلکہ وہ اردو غزل کے اہم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔فیض احمد فیضؔ،فراقؔ،نریش کمار شادؔ،ناصرؔ کاظمی،قتیلؔ شفائی،ساحرؔ لدھیانوی کی ہمعصری کے باوجود ان کی شاعری کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ان غزل گو شعرا کے درمیان عرشؔ کسی طرح بھی کم تر درجے پر نہیں رہتے۔عرشؔ کی اہمیت مسلم لیکن سرزمین جموں و کشمیر سے تعلق کی بنا پر ان کی شاعری اور شخصیت اس توجہ سے محروم رہی ہے،جس کے وہ اصل مستحق ہیں۔میں نے جب بطور موضوع مقالہ عرشؔ صہبائی کی شخصیت کا انتخاب کیا تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ عرشؔ تقسیم وطن سے قبل

کے شعرا میں شمار ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے بارے میں اردو ادب کی تاریخ کی کتب میں کہیں سرسری ذکر تک نہیں ملتا۔

اسی کے پیش نظر میں نے اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع ''عرشؔ صہبائی کی شاعری: روایت اور انحرف'' منتخب کیا ہے۔ جسے میں نے پانچ ابواب کر کے عرشؔ کی شاعری میں روایت اور انحراف کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے کلام کے جو مجموعے ریاست کے شعری افق پر طلوع ہو کر دادِ تحسین کی منزل تک پہنچے ہیں ان میں ''شکست جام''، ''شگفت گل''، ''صلیب''، ''یہ جھونپڑے یہ لوگ''، ''اسلوب''، ''ریزہ ریزہ وجود''، ''اساس''، ''نایاب''، ''توازن''، ''دسترس''، ''چشم نیم باز''، ''عکس جمال''، ''خدوحال''، ''تجھ بن چین کہاں''، ''خوشبو تیرے بدن کی''، ''سائے تیری یادوں کے''، ''جواز''، ''شبنم تیری یادوں کی''، ''آ گہی''، ''تیرا زیرلب تبسم'' اور ''تیری پر فسوں نگاہیں'' قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے دو تذکرے ''انجم کدہ'' اور ''یہ جانے پہچانے لوگ'' بھی لکھے ہیں جن میں انہوں نے اردو کے کئی اچھے شاعروں کے مختصر حالات اور ان کا منتخب کلام درج کیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک کتاب ''سدھا جین انجم اپنے کلام کے آئینے میں'' جس میں انہوں نے ریاست ایک اہم شاعرہ سدھا انجم کے کلام پر بہترین تبصرہ کیا کرتے ہوئے ادبی دنیا میں ان کے مقام کا تعین کیا ہے۔ میں نے اپنے تحقیقی کام کو انجام دیتے ہوئے ان کی تمام شعری تخلیقات کو مطالعہ کیا ہے۔

مقالے کا پہلا باب عرشؔ کے سوانحی کوائف، ادبی خدمات اور معاصرین ہے جن میں ان کا مکمل زندگی نامہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات کون جانتا تھا کہ تحصیل اکھنور کے ایک نہایت پسماندہ گاؤں باختن میں پیدا ہونے والا ایک بچہ آگے چل کر دنیائے شعر و ادب میں اس بلندی پر پہنچ کو جائے گا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ عرشؔ صہبائی وہی خوش نصیب انسان ہیں جو نہ صرف ریاست جموں و کشمیر بلکہ ہندوستان بھر میں اپنی شاعری کی وجہ سے مشہور و معروف ہیں۔ انہوں نے اپنی عمر کے ستر برس اردو کی خدمت کو دیئے ہیں۔ ہنس راج ابرول نام اور عرشؔ تخلص کرتے تھے لیکن ادبی دنیا میں انہیں عرشؔ صہبائی کے نام سے شہرت حاصل ہے، ان کے اصل نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ آپ مورخہ 3/دسمبر 1930ء کو ضلع جموں، تحصیل اکھنور کے چھمب سیکٹر کے ایک گاؤں سیری پلائی (باختن) میں پیدا ہوئے۔ یہاں آپ کے ننھیالی رشتے دار رہتے تھے۔ آپ کے آبا و اجداد کا تعلق ضلع اودھمپو کے ایک چھوٹے سے گاؤں جب سے تھا۔ عرشؔ کے کے بچپن میں ہی ان کے والد محترم جناب مادھو رام ابرول اپنے آبائی گاؤں سے کچی چھاونی جموں منتقل ہو گئے تھے اور یہیں فوج میں بطور

اسکول ماسٹر ملازمت اختیار کر لی تھی۔عرشؔ نے اپنے بچپن کے سات برس اپنی نانی پاروتی جان کے پاس گزارے۔آٹھویں سال میں آپ اپنے والد صاحب کے پاس جموں آ گئے اور 1938ء میں کچی چھاونی کے ایک پرائمری اسکول میں داخلہ لے لیا۔آپ نے پانچویں جماعت تک کی تعلیم اسی اسکول سے حاصل کی،اس کے بعد دسویں جماعت تک کی تعلیم رنبیر ہائیر اسکینڈری اسکول سے حاصل کی۔پھر 1949ء میں گاندھی میموریل کالج میں داخلہ لیا اور یہیں 1950ء میں ایف۔اے کا امتحان دینے سے قبل ہی کالج کو خیر آباد کہہ کر تعلیم ترک کر دی۔1951ء میں ریجنل ریسرچ لیباٹری جموں میں ملازم ہو گئے لیکن یہ ملازمت ان کی طبیعت کو راس نہیں آئی 1954ء میں اس ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔1955ء میں انہوں نے ریڈیو میں بطور کلرک ملازمت اختیار کر لی۔1984ء میں وہ کلرک سے ترقی کر کے ایڈمنسٹریٹو آفسر آل انڈیا ریڈیو بن گئے اور پھر 1988ء اس ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور آخر کار 25/دسمبر 2020ء کو حرکت قلب رکنے کے سبب انتقال کر گئے۔غرض اس باب میں عرشؔ اور ان کے ادبی ماحول کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

مقالے کے دوسرے اور تیسری باب میں عرشؔ کی نظم نگاری میں روایت اور انحراف کو واضع کیا گیا ہے۔دونوں ابواب کی تفصیلات سے یہ بات صاف عیاں ہوتی ہے کہ عرشؔ صہبائی میں روایت اور انفرادیت دونوں عنصر نمایاں ہیں۔انہوں نے غزل کی طرح صنف نظم کے ساتھ بھی انصاف کیا ہے اور نئے نئے موضوعات پر عمدہ نظمیں کہہ کر خزانہ اردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔ان کی نظم جدید نظم کے ادبی ارتقا میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ان کی غزل کی طرح نظم میں بھی موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔حالات و واقعات،واردات و کیفیات،جذبات و احساسات کی ترجمانی،مناظر فطرت کی عکاسی اور حسن و عشق کے راز و نیاز کی کیفیتیں وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ان کے شعری مجموعوں میں شامل ان کا مجموعہ کلام ''یہ جھونپڑے یہ لوگ (1975ء)'' نظموں اور قطعات پر مشتمل ہے۔جس میں ان کی کئی لافانی نظمیں شامل ہیں جو رہتی دنیا تک ان کے نام کو زندہ رکھنے کی حقدار ہیں۔مثلاً ''سقراۃ'' ان کی ایک ایسی ہی نظم ہے جو اردو ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی نظم ہے۔جس میں سقراط جیسے عظیم فلسفی کو موضوع بنا کر ماضی و حال کا خوبصورت نقشہ کھینچا گیا ہے۔عرشؔ کا کہنا ہے کہ سقراط نے حق کی خاطر زہر کا پیالا پی کر اپنی جان دے دی لیکن آج کا انسان قدم قدم پر وہی زہر پی رہا ہے اور پھر بھی زندہ ہے۔عرشؔ نے زیادہ تر پابند نظمیں لکھی ہیں جو کلاسکی روایت کا احساس دلاتی ہیں۔نظم معرا کے فن سے بھی عرشؔ پوری طرح واقف تھے۔پابند نظموں کے علاوہ عرشؔ صہبائی نے سانٹ بھی کہے ہیں۔نظم ''یاد'' اور ''دل'' سانٹ

کے دوخوبصورت نمونے ہیں۔علاوہ ازیں ''انجام''، ''جان وفا''، ''شکوہ''، ''دوآنکھیں''، ''ایک سوال''اور'' یہ جھونپڑے یہ لوگ''، ''نہیں ایسانہیں ہوگا''، ''وراثت''عرشؔ کی مشہور نظمیں ہیں۔عرشؔ صہبائی نے قومی یکجہتی اور حب الوطنی پر بھی عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔جن میں ''اے میرے وطن! میرے حسیں خوابوں کی تعبیر''، ''سرزمین وطن''، ''جہد''، ''ایکتا''اور''میرے کشمیر میں''اہم ہیں۔ان کی نظمیں گرچہ تعداد میں 33 ہیں لیکن یہ تمام بھی ایک ادبی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کی تمام نظمیں اپنے اختصار جامعیت اور وحدت کے تاثر کے اعتبار سے پڑھنے والوں کو چونکاتی ہیں۔آپ ان نظموں کی چندسطریں یا مصرعے نکال کر الگ سے پڑھیں تو ان کا قاری پر زیادہ اثر نہیں ہوتا مگر جب ان نظموں کو پورے کا پورا پڑھا جائے تو یہ اپنے وحدت تاثر کے باعث پڑھنے والوں کو خوب متاثر کرتی ہیں۔

عرشؔ صہبائی کی ادبی شناخت کا سبب جتنا ان کی نظم بنی اتنا ہی حق ان کے دوہوں اور قطعات کو حاصل ہے۔انہوں نے اپنے قطعات میں بھی ایک تخلیقی فضا کی تشکیل کی ہے۔وہ قطعہ کے فن سے بھی خوب آشنا ہیں۔ ان کی نظموں کے مجموعہ ''یہ جھونپڑے یہ لوگ''میں ان کے (131)ایک سو اکتیس قطعات بھی شامل ہیں۔ان کے قطعات اگرچہ تعداد میں تھوڑے ہیں لیکن زندگی کے تمام نشیب وفراز کو یہ اپنے اندرسمیٹے ہوے ہیں۔عرشؔ صہبائی کے قطعات فن کی کسوٹی پر پورے اترتے نظر آتے ہیں کیونکہ عرشؔ نے قطعے کے حسن کوملحوظ خاطر رکھ کر انہیں تخلیق کیا ہے۔عرشؔ صہبائی کے قطعات میں وہ کرب نہیں جس سے حیات کی ہمت کے ساز کمزور ہوتے ہیں۔ان کے کلام میں آرزوئیں، خواہشیں اور عشق وشوق کی ایسی لامتناہی دنیا آباد ہے جہاں سے اعلیٰ وادنیٰ فلسفہ حیات کا راستہ نکلتا ہے۔مشکل پسندی دور دور تک ان کے قطعات میں نظر نہیں آتی بلکہ انہوں نے اپنے قطعات میں بڑے سادہ وسپاٹ الفاظ کے ذریعہ بڑی وسیع باتوں کا اظہار کیا ہے۔

عرشؔ صہبائی کی غزل، نظم اور قطعات کی طرح ان کے دوہوں میں بھی روایت اور جدت دونوں اعنصر ملتے ہیں۔ان کے دوہوں کا مجموعہ ''تجھ بن چین کہاں''کے نام سے 2009ء میں منظر عام پر آیا تھا۔دوہا اگرچہ ہندی شاعری کی صنف ہے لیکن عرشؔ صہبائی نے اسے معنوی اعتبار سے اپنایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندی ہی نہیں بلکہ خالص اردو زبان میں بھی بہترین دوہے تخلیق کئے جاسکتے ہیں۔اردو میں دوہے کی صنف کو اپنانے میں جمیل الدین عالیؔ، نادمؔ بلخی، وزیرآغا، حفیظؔ ہوشیار پوری، ڈاکٹر فراز حامدی کے نام لئے جائیں گے وہیں دوہے کی تاریخ میں ایک نام عرشؔ صہبائی کا بھی درج ہوگا۔عرشؔ نے مختلف موضوعات پر کامیاب دوہے کہے

ہیں بلکہ ان میں بھی ان کی انفرادیت صاف نمایاں ہے۔ان میں عرشؔ کا غزلیہ رنگ دیکھا جاسکتا ہے۔ان میں بھی عرشؔ نے شعریت اور مقصدیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اپنا انداز بیان برقرار رکھا ہے جو پڑھنے والے کے دل ودماغ پر ایک گہرا اثر چھوڑتا ہے۔

مقالے کے چوتھا اور پانچواں باب میں عرشؔ کی غزل گوئی میں روایت اور انحراف پر مبنی ہے۔عرشؔ اردو غزل گوئی کے میدان میں ''میر ثانی'' کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔اس لئے کہ ان کی غزل میں وہی سوز و گداز، وہی درد، وہی سادگی، وہی گداختگی، وہی داخلیت اور جذبے کی سچائی کی وہی آنچ ہے جو میر کی غزل کی خصوصیت ہے لیکن افسوس ہے کہ زمانے کی ناشناس آنکھیں ان کی قدر و منزلت سے ناواقف ہیں۔غزل کے آداب ولوازم سے عرشؔ پوری طرح واقف ہیں اور اظہار کے اسالیب پر بھی انہیں اچھی قدرت حاصل ہے۔ان کے بیان میں حسن بھی ہے اور فنی رچاؤ بھی۔میرؔ، دردؔ، مومنؔ، غالبؔ اور اقبالؔ جیسے عظیم شاعروں کی غزلوں کے مزاج اور رویوں کو عرشؔ صہبائی نے بڑی گہرائی سے دیکھا بھی ہے اور اپنی غزلوں میں برتا بھی ہے۔عرشؔ کی غزل روایت کے اس سلسلے سے تعلق رکھتی ہے جس کی پہلی کڑی میر تقی میرؔ تھے۔ان کی شاعری محبت میں تہذیب وشائستگی کی وہ مثال ہے جو جدید اردو غزل کے لئے نئی تو نہیں لیکن کامیاب ضرور ہے۔

عرشؔ صہبائی کی غزل کا مرکزی موضوع عشق ہے۔لیکن وہ نئے عہد کے غزل گو ہیں اس لئے نئے تصورات اور نیا انداز فکر ان کی غزلوں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ان کی غزل عاشقانہ، صوفیانہ، عارفانہ، حکیمانہ، رندانہ، آزادانہ، مسرتانہ، حسرتانہ اور خادمانہ ہر طرح کے مضامین ادا ہوئے ہیں اور نہایت عمدگی اور خوبی سے ادا ہوئے ہیں۔عرشؔ کی شاعری استعاراتی رنگ لئے ہوئے ہے۔عرشؔ کی شاعری میں سیاسی نشیب وفراز کا بھی گہرا شعور ملتا ہے۔ان کی غزل اسلوبی لحاظ سے روایتی غزل سے زیادہ منسلک نہیں ہے لیکن انہوں نے کلاسیکی انداز سے گریز بھی نہیں کیا ہے۔آسان زبان، سلاست وروانی، مشکل ثقیل وکرخت الفاظ سے گریز نے ان کی غزل کو عام فہم بنادیا ہے۔ان کی غزل کا دھیما لہجہ بڑی سے بڑی بات بالکل عام انداز میں کہہ دینے کا فن کہ قاری پہلے سرسری گزر جاتا ہے پھر سوچتا ہے تو پھر حیران ہو جاتا ہے کہ یہ خیال اپنے اندر کتنی گہرائی رکھتا ہے۔اعجاز و اختصار، نغمگی، لطیف انداز بیان اور مترنم طرز ادا ان کی غزل کے خاص وصف ہیں۔

عرشؔ صہبائی فن کے رمز شناس تھے اور اس رمز آشنائی کی بدولت آپ کا ہر شعر بلکہ ہر مصرعہ اس طرح سنور جاتا ہے کہ آپ کا کلام ہر پرکھنے والے کو متاثر کرتا ہے بشرطیکہ پرکھنے والا خود بھی کسی حد تک رموزِ فن سے

آشنا ہو۔عرشؔ صہبائی عصری آگہی کا شاعر ہے،انہوں نے اردو غزل کو نیا آہنگ اور نئی زمینیں ہی نہیں دیں، نئے اشعار بھی دیئے ہیں۔اس طرح انہوں نے عالمی سطح پر اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ عرشؔ کے شعر کہنے کا انداز ان کو اور اردو غزل کو ہمیشہ زندہ رکھے گا اور آنے والے مورخ یا تنقید نگار اگر تعصب کی عینک سے نہ دیکھیں تو وہ بھی میری طرح کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اردو غزل کا تذکرہ عرشؔ کے کلام کے بغیر ادھورا ہے۔ مجھے عرشؔ کا آشنا ساز اور ذاتی طور پر واقف کار ہونے پر فخر ہے۔

عرشؔ صہبائی کی ذاتی زندگی کو ان کی شاعری سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔چاہے وہ ان کی کوئی بھی صنف ہو ان کی شاعری میں ان کی زندگی کا عکس ہے۔انہوں نے سماجی تلخیوں،سختیوں اور بے راہ روی کو زبان دے کر اپنے قاری و سامعین لازوال پیغام دیا ہے۔اُن کی شاعری با معنی اور فکر انگیز ہے۔فنی اسلوب کی گرفت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا اچھوتا پہلو یہ ہے کہ انتہائی آسان اور سلیس زبان کا استعمال کیا گیا ہے جس سے ان کی شاعری عام اور مجھ جیسے نیم خواندہ قاری کے دل میں بھی اتر جاتی ہے۔مختصراً یہ کہ عرشؔ صہبائی نے نہ اپنے عہد کے کسی مروج نظریے کو اپنایا اور نہ ہی کسی ادبی یا سیاسی رجحان کی تقلید کی جس کے باعث وہ منفرد تو رہے لیکن انہیں قبول عام حاصل کرنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔یہی وہ قیمت ہے جو اپنی انفرادیت کی بنا پر ہر سچے اور کھرے فنکار کو ادا کرنا پڑتی ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

صہبائی،عرشؔ، تیرازیرِلب تبسم،جموں: مکتبہ اردوادب،2019ء

صہبائی،عرشؔ،اساس،جموں(ڈوڈہ): یاسر گولڈن پبلی کیشنز،2001ء

صہبائی،عرشؔ،اسلوب،جموں: ہندوستانی پریس،1991ء

صہبائی،عرشؔ،آ گہی،جموں: مرکز تصنیف وتالیف کٹھوعا،2015ء

صہبائی،عرشؔ،خدوحال،جموں: مانوی پبلی کیشنز،2008ء

صہبائی،عرشؔ،ریزہ ریزہ وجود،جموں: ہندوستانی پریس،1995ء

صہبائی،عرشؔ، یہ جھونپڑے یہ لوگ،جموں: مکتبہ اردوادب،1971ء

صہبائی،عرشؔ،شگفتِ گل،جموں: مکتبہ اردوادب،1961ء

صہبائی،عرشؔ،خوشبو تیرے بدن کی،جموں: مانوی پبلی کیشنز،2009ء

صہبائی،عرشؔ،انجم کدہ،جموں: مکتبہ اردوادب،1963ء

صہبائی،عرشؔ،تجھ بن چین کہاں،جموں: مانوی پبلی کیشنز،2009ء

صہبائی،عرشؔ،توازن،جموں: مانوی پبلی کیسنز،2005ء

صہبائی،عرشؔ، جواز،جموں: مانوی پبلی کیشنز،2011ء

صہبائی،عرشؔ،چشم نیم باز،جموں: نمی ڈوگری سنستھا،2007ء

صہبائی،عرشؔ، دسترس،جموں: بزم اردوادب،2007ء

صہبائی،عرشؔ،شکست جام،جموں: مکتبہ اردوادب،1958ء

صہبائی،عرشؔ،شکست جام،جموں: مکتبہ اردوادب،1959ء

صہبائی، عرشؔ، صلیب، جموں: چاند پریس، 1971ء
صہبائی، عرشؔ، عکس جمال، جموں: چاند پریس، 2007ء
صہبائی، عرشؔ، نایاب، جموں: عرشؔ صہبائی، 2004ء
صہبائی، عرشؔ، یہ جانے پہچانے لوگ، جموں: مکتبہ اردو ادب، 1966ء
صہبائی، عرش، سائے تیری یادوں کے، جموں: مانوی پبلی کیشنز، 2010ء
صہبائی، عرش، شبنم تیری یادوں کے، جموں: مانوی پبلی کیشنز، 2013ء

ثانوی مآخذ

ارگلی، فاروق، انتخاب کلام نظیر اکبر آبادی، دہلی: فرید انٹر پرائز، 2003ء
اشرفی، سمیع اللہ، دوہے کی روایت (دور قدیم سے حال تک) علی گڑھ: اردو بک سنٹر، 1990ء
اعظمی، خلیل الرحمٰن، نئی نظم کا سفر (1936 کے بعد) علی گڑ: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، 1972ء
اکبر آبادی، نظیر، دیوان نظیرؔ اکبر آبادی، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، 1972ء
امروہی، نشتر، پوسٹ مورٹم، دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، 2012ء
انجم، خلیق، انتخاب کلام حسرتؔ، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1995ء
انوار الحق، مفتی محمد، دیوان غالب جدید، بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، 1982ء
اورنگ آبادی، سراجؔ، کلیات سراجؔ، نئی دہلی: ترقی اردو بیوور، 1982ء
بانہالی، امینؔ، اندھیروں کا مسافر، جموں: کریسنٹ ہاوس پبلی کیشنز، 2009ء
بدایونی، شکیلؔ، کلیات شکیلؔ بدایونی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2006ء
بدایونی، فانیؔ، کلیات فانیؔ، دہلی: پرویز بک ڈپو، ب۔ت
بدایونی، فانیؔ، عرفانیات فانیؔ، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، 1939ء
برہانپوری، محمود بیگ سازؔ، تارنفس، بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، 1995ء
بیتاب، پرتپال سنگھ، موج رنگ، جموں: پرتپال سنگھ بیتاب، 2013ء
پروین، فاطمہ، اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، حیدرآباد: عمر پریس (پرنٹو پریس)، 1980ء

پشاوری، عابدؔ، رحمٰن رنگ، لکھنؤ: کاکوری پریس، 2009ء
تاباںؔ، غلام ربانی، ذوق سفر، دریا گنج دہلی: لبرٹی آرٹ پریس، اپریل 1970ء
ٹھاکر، کرن کوشل، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: نانوی پرکاشن، 2013ء
ٹھاکر، کرن کوشل، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، جموں: مانوی پرکاشن، 2013ء
جاوید، پروفیسر قدوس، ادب کے معمار (جلد اول)، جموں: قاسمی کتب خانہ، 2021ء
جعفری، سید محمد، تیر نیم کش، لاہور: چنگ میل پبلی کیشنز، 2007ء
جمیل، شاہد، مناظر عاشق ہرگانوی، دو ہارنگ، نئی دہلی: نرالی دنیا پبلیکشن 2003ء
جیلانی، غلام، عصری آ گہی کا شاعر عرشؔ صہبائی، جموں: آزاد بک ویژن، 2015ء
چاندؔ، مہندر پرتاپ، حرف راز، ہریانہ: منوج پبلی کیشنز، 1974ء
حسین، سید شمیم، اردو کے ضرب المثل اشعار، لکھنو: ایڈورٹائزرس انڈیا، 2014ء
حسین، قاضی جمال، انتخاب غزلیات داغ، لکھنو: اترپردیش اردو اکیڈمی، 1984ء
خان، ڈاکٹر طارق سلیم، رساؔ جاودانی بحیثیت اردو شاعر، دہلی: انیس آفسیٹ پریس، 2008ء
دہلوی، داغؔ، آفتاب داغؔ (دیوان دوم) لکھنو: سرفراز قومی پریس، ب۔ت
ذکریہ، خواجہ محمد، کلیات حفیظؔ جالندھری، نئی دہلی: فرید بک ڈپو (پراوٗیٹ) لمٹیڈ، 2008ء
رام، مالک، کلیات عرشؔ، نئی دہلی: لبرٹی آرٹ پریس پٹوڑی روڑ، 1983ء
رئیس، پروفیسر قمر، معاصر اردو غزل مسائل و میلانات، دریا گنج دہلی: شوبی آفسیٹ پریس، 2014ء
سالک، قربان علی، کلیات سالکؔ، لاہور: مجلس ترقی ادب، 1966ء
سروری، عبدالقادر، کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)، سرینگر: جموں کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، 1984ء
سروری، عبدالقادر، کشمیر میں اردو (حصہ دوم)، سرینگر: جموں کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، 1982ء
سہسوانی، محمد عارف، اردو نظم (1960 کے بعد)، دلی: اردو اکادمی، 1995ء
سید خورشید کاظمی، مغنی حیات عرشؔ صہبائی، سرینگر کشمیر: میزان پبلشرز، 2018ء

شاداؔبی،عندلیب،دورحاضراوراردوغزل گوئی،لاہور:علمی پرنٹنگ پریس،1962ء

شاذشرقی،پروفیسرایس اے قاضی،عرشؔ صہبائی شخصیت اورشاعری،جموں:شاذشرقی،2007ء

شاہ،ڈاکٹرعجازحسین،عرشؔ صہبائی عہد،فن اورشخصیت،جموں:آزادبک ویژن،2017ء

شرقی،پروفیسرشاؔذ،عرشؔ صہبائی شخصیت اورشاعری،جموں:شرقی پبلی کیشنز،2008ء

شمس الحق،محمد،اردوکےضرب المثل اشعار،کراچی:ادارہ یادگارغالب،2003ء

شمس،عبدالمعز،آنکھ اوراردوشاعری،علی گڑھ:ایویروزاکیڈمی،2018ء

شیوی،ساحؔر،دوہےکوکن کے،شاستری نگرجےپور:ادبی دنیاپبلی کیشنز،2008ء

صابردت،شعری ادب،نئی دہلی:تین مورتی پبلی کیشنز،1966ء

صابردت،مدیرفن اورشخصیت کشمیری لال ذاکرنمبر،ممبئی:ساحرپبلیشنگ ہاوس،1994ء

صدیقی،مسعودالحسن،انتخاب کلام داؔغ،دہلی:یونین پرنٹنگ پریس،1961ء

ظفؔر،ظفرانصاری،روٹی جیساچاند،پٹنہ:علمی مجلس بہار،2004ء

عامل،افضال،اردوشاعری کامنظرنامہ،کولکاتا:اثبات ونفی پبلشر،2014ء

عظمی،پرویزاحمد،اردومیں سیاسی شاعری کی ادبی قدروقیمت(۱۹۰۰۔۱۹۵۰)،نئی دہلی:ایم آرپبلیکشن،2009ء

عظیم آبادی،جمیؔل،دوہاسنسار،کراچی:راشدپبلی کیشنز،2004ء

علامہ،اقباؔل،بال جبریل،طبع پنجم،نئی دہلی:کمال پبلیشنگ ہاوس،1954ء

علی،سیدنوشاد،غیرمسلم غزل گوایک انتخاب،اعظم گڑھ:دارالمصنفین شبلی اکیڈمی،2017ء

غازی پوری،ظہیؔر،اردودوہےایک تنقیدی جائزہ،نئی دہلی:وجےگرافکس،2015ء

فاروقی،پروفیسرڈاکٹرعبدالقادرغیاث الدین،اردوشاعری اورتصوف،حیدرآباد:طبعۃ ابوالوفاءالافغانی جامعہ نظامیہ،2009ء

فتحپوری،فرمان،اردوشاعری کافنی ارتقا،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،2012ء

فیصل،شاہ،مطالعہ اصناف ادب،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،2010ء

کاشمیری،حامدی،جموں وکشمیرمیں اردوادب،سرینگر:گلشن پبلشرز،1991ء

کاشمیری،شوریدہ،جوش جنوں،دہلی:جمال پرنٹنگ پریس،1980ء

کاشمیری، حامدی، جدید اردو نظم اور یورپی اثرات، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاوس 2010ء
کاشمیری، حامدی، نئی حسیت اور عصری اردو شاعری، سرینگر: جموں کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، 1991ء
کاظمی، ناصر، برگ نے، نئی دہلی: شان ہند پبلی کیشنز، 1990ء
کرنؔ، ڈاکٹر سنگھ کرن، دل کے خواب ادھورے، جموں: مرکز تصنیف وتالیف کٹھوعا، 2014ء
کشتواڑی، ولی محمد اسیر، ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت، جموں: یاسر گولڈن پبلشنگ ہاؤس، 1998ء
کشتوڑی، نشاطؔ، تصویر خیال، مٹیا محل دہلی: ھمارادور پبلیکیشنز، 1988ء
کشمیری، حامدی، ناصرؔ کاظمی کی شاعری، الہ آباد: نیشنل آرٹ پریس، 1982ء
کیفی، حنیف، اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، 1982ء
گوکھپوری، فراقؔ، روح کائنات، الہ آباد: ودیا ساگر پریس، 1992ء
گورکھپوری، فراقؔ، گل نغمہ، دہلی: ادارہ علم وادب، 2006ء
گورکھپوری، فراقؔ، اردو کی عشقیہ شاعری، کراچی: جاوید پریس، 1966ء
گورکھپوری، فراقؔ، گل نغمہ (تیسرا ایڈیشن)، الہ آباد: ادارہ انیس اردو، 1971ء
لدھیانوی، ساحرؔ، کلیات ساحر، نئی دہلی: کتابی دنیا، 2006ء
لکھنوی، منظرؔ، سید جعفر حسین، دیوان منظر، لکھنو: سرفراز قمی پریس، مارچ 1962ء
ماہلی، شاہد، داغؔ دہلوی، دہلی: عزیز پرنٹنگ پریس، 2001ء
ماہنامہ شیرازہ، شوریدہؔ کاشمیری نمبر، جلد 26، شمارہ 1، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لیگویجز
مجازؔ، اسرار الحق، کلیات مجازؔ، دہلی: کتابی دنیا، 2006ء
محمد طاہر عزیز خان، تری پرفسوں نگاہیں عرشؔ صہبائی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، 2019ء
محی الدین، شیخ صدیق، قومی یکجہتی اور اردو نظم، نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، 2015ء
مرادآبادی، جگرؔ، کلیات جگر، دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، 2011ء
مرادآبادی، جگرؔ، کلیات جگر مرادآبادی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، 2005ء
مقدمہ مولوی عبدالحق، انتخاب کلام میرؔ (مع فرہنگ)، دہلی: اے۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرس، 2008ء

ملسیانی،عرشؔ،کلیات عرشؔ ملسیانی،نئی دہلی:لبرٹی آرٹ پریس،1983ء
ملسیانی،عرشؔ،شرارسنگ(اشاعت اول)،دہلی:یونین ٹریڈنگ پریس،1967ء
ملسیانی، جوشؔ،آئینہ اصلاح،دہلی:یونین پرنٹنگ پریس،1968ء
ملیح آبادی،ڈاکٹر عصمت،کلیات جوش ملیح آبادی،نئی دہلی:فرید بک ڈپوٹ(پرائیویٹ)لمٹیڈ،2007ء
مناوری، عابدؔ،بہار غزل، جموں: مکتبہ اردو ادب،1961ء
مناوری، عابدؔ،شمیم گل،جموں: مکتبہ اردو ادب،1967ء
مہرؔ،غلام رسول، دیوان غالب،لاہور:علمی پرنٹنگ پریس،1967ء
میرؔ،ڈاکٹر شاہد،دوہے عالمگیر،بھوپال:منموہن آفسیٹ،2011ء
میرؔ،میر تقی،انتخاب کلام میرؔ،دہلی:ہندوستان لیتھو پرنٹنگ پریس،1960ء
نقشؔ،مہیش چندر،انداز،دہلی:یونین پرنٹنگ پریس،1962ء
وزیر،آغا،جدید نظم کی کروٹیں،علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،2000ء
ولیؔ،ولی محمد،دیوان ولیؔ،دہلی:جید برقی پریس،1921ء

رسائل و جرائد

تسلسل (ششماہی مجلّہ)،جلد11 ،شمارہ 21،جموں کشمیر،شعبہ اردو یونیورسٹی آف جموں ،جنوری تا جون 2008ء
تسلسل(ششماہی)،جلد8،شمارہ14،جموں کشمیر،شعبہ اردو یونیورسٹی آف جموں،2004ء
جموں وکشمیر میں اردو شاعری نمبر،شیرازہ(ماہنامہ) جلد52،شمارہ 7-6،سرینگر:جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز
شیرازہ،عرشؔ صہبائی نمبر،جلد،56،شمارہ3،4،سرینگر:جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لیگوی،اپریل 2018ء
صابر دت، مدیر فن اور شخصیت،اردو قطعہ نمبر،شمارہ نمبر35،36،ممبئی:ساحر پبلیشنگ ہاوس، مارچ1995ء

صابر دت،فن اور شخصیت ساحر لدھیانوی نمبر،شمارہ17،18،بمبئی:ساحر پبلشنگ ہاؤس،1985ء

ماہنامہ شیرازہ،جلد56،شمارہ،4-3،سرینگر:جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

معاصر اردو نظم نمبر،شیرازہ جلد53،شمارہ10-8،سرینگر:جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

ہم عصر شعری انتخاب نمبر،شیرازہ (ماہنامہ)، جلد48،شمارہ12-1،سرینگر:جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

☆☆☆

ARSH SEHBAI KI SHAYERI : RIWAYAT AUR INHERAF

[The poetry of Arsh Sehbai : Tradition and Deviation]

Thesis submitted to the Jawaharlal Nehru University in partial fulfillment of the requirement for the award of the Degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

By

Rakesh Kumar

Under the supervision of

Prof. Mazhar Mehdi Hussain

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
School of Language, Literature & Culture Studies
Jawaharlal Nehru University
New Delhi-110067
2022